"ایک ایسی سبق آموز و بصیرت افروز خودنوشت سوانح حیات کہ جس کا ترجمہ دنیا کی ہر ایک زبان میں کیا جانا چاہیے"

(علیم صبا نویدی، مدراس)

خارستان کا مسافر

(خودنوشت سوانح حیات)

”ایک ایسی سبق آموز و بصیرت افروز خودنوشت سوانح حیات
کہ جس کا ترجمہ دُنیا کی ہر ایک زبان میں کیا جانا چاہیے“

(علیم صبا نویدی، مدراس)

خارستان کا مسافر

(خودنوشت سوانح حیات)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
سابق صدر شعبۂ اُردو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں وکشمیر)

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

KHARASTAN KA MUSAFIR

(Autobiography)

BY :Dr Mushtaq Ahmed Wani

Lane No 3, House No 7 Firdousabad Sunjwan

Jammu 180011 (J&K)

E-mail:drmushtaqahmedwani@gmail.com-Mob.7889952532

Year of Edation: 2023

ISBN :978-81-19035-01-4

Price: 700/-

نام کتاب	:	خارستان کا مسافر (خودنوشت سوانح حیات)
مصنف	:	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
سن اشاعت	:	۲۰۲۳ء
قیمت	:	۷۰۰ روپے
کمپوزنگ	:	ثنا گرافکس و پرنٹنگ ہاؤس، 9868594259
مطبع	:	روشان پرنٹرس دہلی۔٦

ملنے کے پتے

☆ہمالیہ بک ورلڈ، حیدرآباد۔Ph.040-66822350

☆صفی بک ایجنسی ممبئی۔ M.9820480292

☆بک امپوریم، پٹنہ۔M.09304888739

☆پارکھ بک ڈپو لکھنؤ۔M.9389456786

☆مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد۔M.09325203227

☆کشمیر بک ڈپو، سری نگر۔M.09419761773

☆وطن پبلیکیشنز، سری نگر۔M.09419003490

☆نعیم بک سیلرز، مئوناتھ بھنجن۔M.09450755820

☆دکن ٹریڈرس، حیدرآباد۔Ph.040-24521777

☆کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئی۔Ph.09869321477

☆عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ۔M.09433050634

☆راعی بک ڈپو، الہ آباد۔M.07905454042

☆ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

☆مکتبہ علم وادب، سری نگر۔M.094419407522

☆قاسمی کتب خانہ، جموں۔M.09797352280

پاکستان میں ملنے کا پتہ : ملک بک ڈپو، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان) Ph. 0092-42-37247480 37231388

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.O. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)

B.O. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 41418204, 45678286, 45678203, 23216162

E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com

website: www.ephbooks.com

انکشاف

1۔ میری نظر میں یہ دُنیا خارستان ہے، گُلستان نہیں!

2۔ اِس دُنیا کے بُرے لوگ اپنی تمام بداعمالیوں کو نوشتۂ تقدیر خیال کرتے ہیں یعنی اُن کے خیال میں نعوذ باللہ تمام بُرے کام خدا کرواتا ہے!

3۔ میں نے اس دُنیا میں آدمی کی شکل میں زیادہ تر سانپ اور بچھو دیکھے!

4۔ مُنافقوں کی مُنافقت اور بے غیرتوں کی بے غیرتی نے مجھے بہت رُوحانی اذیت پہنچائی!

5۔ میرا دھیان جب اس حقیقت کی طرف جاتا ہے کہ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی!

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

رفعت سروش کے یہ اشعار میری زندگی پر صادق آتے ہیں کہ ۔

ہزار بار حادثات میرے ہم سفر بنے
مگر میں راہِ شوق میں یونہی رواں دواں رہا
ہزار بار دامن حیات خارزار میں اُلجھ گیا
مگر میں گامزن رہا بہار کی تلاش میں

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

انتساب

اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار بندوں
کے نام

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

علیم صبا نویدی
(مدراس)

سبق آموز و بصیرت افروز خود نوشت سوانح حیات

راقم الحروف جب ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی خود نوشت سوانح حیات بنام ''خارستان کا مسافر'' آغاز سے اواخر تک مطالعہ و محسوسات کے سفر کے اختتام تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ موصوف نے اپنی سوانح حیات سے پہلے انکشاف میں پانچ باتیں اس کتاب کے لبِ لباب میں رقم کی ہیں۔ راقم اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اسی انکشافی منزل پر آ کر رُک گیا ہے اور راقم کے ذہنی دریچوں میں ساؔحر لدھیانوی کا یہ شعر اپنی خوشبوئیں بکھیر رہا ہے کہ

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے انکشاف کے ان پانچوں منازل کو پوری ثابت قدمی و عزم و حوصلے کے ساتھ طے کیا ہے اور آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اُن کی نظر میں یہ دُنیا ''گلستان'' نہیں بلکہ ''خارستان'' ہے۔

میدان سوانح حیات کے شہ سواروں میں جتنے بھی اُدبا اور علماء گزرے ہیں وہ اپنی وسعت نظری و حدِ بساط دیدہ وری تک ہی پہنچ کر اپنے مشاہدوں اور چشمِ دید

واقعات کو منصۂ شہود پر لائے ہیں، اُسی طرح ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے بھی اپنی مشقِ سیاحت کا آغاز کیا ہے اور وہ جس خودنوشتی کی منزل پر پہنچے ہیں وہاں سبق آموزی وبصیرت افروزی کا چراغاں ہے۔

کوئی ادیب یا شاعر اپنی سوانح حیات کو اُسی وقت قلم بند کرتا ہے جو خود کو بامشاہدہ اس جادۂ زندگی وزماں کے قابل گردان لے۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے اپنی زندگی میں پیش آمدہ حالات وواقعات، تجربات ومشاہدات اور افکار ونظریات کو من وعن ''خارستان کا مسافر'' کے صفحات پر لفظوں کی صورت میں بکھیر دیا ہے۔اُن کے ساتھ پیش آیا ہوا ہر واقعہ، حادثہ اور تجربہ ومشاہدہ قاری کے ذہن ودل پہ دستک دیتا ہے،غور وفکر کے دریچے کھولتا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے 3 مارچ 1960ء کو اپنی پیدائش کا دن بتایا ہے اور اُن کا بچپن بقول اُن کے نہایت مفلسی اور تنگدستی میں گزرا ہے اور اسی جفاکشی اور محنت کشی کے درمیان پرائمری سے بی اے گریجویشن تک پہنچے اور اس طالب علمی کے دوران اُن کی ملاقاتیں پروفیسر عابد پیشاوری، منظر اعظمی، پروفیسر ظہورالدّین اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے ہوتی رہیں۔مزید برآں اُنھوں نے بعض علمی، ادبی اور سماجی شخصیات سے بھی فیض پایا ہے۔

بی اے میں اچھی پوزیشن حاصل کر کے موصوف نے اپنے ذوقِ ادب اور کسبِ فن کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے مشقِ سخن کا آغاز کیا ہے۔ جناب خلیل انجم اور عرشؔ صہبائی سے شرفِ تلمّذ حاصل کر کے بہت ہی قلیل مُدت میں اپنی شاعرانہ اور ادیبانہ صلاحیت کے روشن نقوش اپنے اوّلیں رفقائے ادب کے دلوں پر چھوڑے ہیں۔آگے چل کر افسانہ نگاری کے میدان میں بھی ''ہزاروں غم'' جیسا مجموعہ اردو ادب کو دے کر اپنی افسانہ نگاری کا لوہا منوایا ہے۔اس مجموعے کی اشاعت کے بعد دُنیائے ادب کو ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' جیسا گراں قدر مقالہ اور دوسرا

افسانوی مجموعہ ''میٹھا زہر'' ادبی دُنیا کو دے کر خسروانِ مملکتِ ادب جیسے پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر قمر رئیس، جوگندر پال، پروفیسر ظہورالدّین، پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر علی احمد فاطمی کے گراں قدر تاثرات اور تبصروں سے بھی بارآور ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی ادبی شناخت اُن کی جن تخلیقی، تحقیقی وتنقیدی نگارشات کے سبب نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پہ قائم ہوئی ہے اُن میں ''آئینہ در آئینہ'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''اعتبار ومعیار'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''شعورِ بصیرت'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''اُردو ادب میں تانیثیت'' (تحقیق وتنقید) ''اندر کی باتیں'' (افسانے) ترسیل وتفہیم (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''قبر میں زندہ آدمی'' (افسانے) ''کیا حال ہے جاناں!'' (افسانے) ''تناظر وتفکّر'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''تنقیدی فکر وفن'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''زبان وبیان'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''کہکشانِ خیال'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) اور ''آج میں کل تُو'' (افسانے) شامل ہیں۔

شعر وادب کی آبیاری کے ساتھ ساتھ اُن کی تبلیغِ دین اور دعوتِ اسلام بھی جاری وساری رہی ہے جو باعثِ مبارک ومستحسن ہے جب کہ دین اور ادب نے حسبِ استطاعت لیاقت سیاسی وخاشاک نوردی کا کامیاب ثبوت پیش کیا ہے۔ اس سفرِ دعوتِ دینِ حق کے باوجود اُن کا دامن ذوقِ ادب کبھی اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا مثلاً ممبئی کے سفر میں شاعر کے مدیر افتخار امام صدیقی سے ملاقات اور شہر چنئی میں راقم الحروف، اشفاق الرحمٰن مظہر، خواجہ اکرام الدّین سابق ڈائریکٹر این سی پی یو ایل نئی دہلی، پرنسپل علی منیّر مدیر ''افقِ ادب'' ہزاری باغ، ڈاکٹر رونق شہری ''دسترس'' دھنباد اور شان بھارتی مدیر سہ ماہی ''رنگ'' دھنباد سے استفادہ کرنے کے مواقع اور چندی گڑھ میں ڈاکٹر نریش اور سلطان انجم سے بھی تفصیلی طور پر ادبی گفتگو کرنے کا اُنھیں اتفاق ہوا ہے۔

آخر میں امیرِ جماعت عبدالحمید بٹ جیسی شخصیت سے چلّہ کشی کی تعلیم حاصل کی اوراسی تربیت کا ثمرہ ہے کہ مضمون نگاری اورافسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ موصوف نے دعوتِ دینِ حق کی نورانی سیاحت کو بحال رکھا ہے۔

دورانِ سفر وسیاحت اُنھیں رہبروں سے بھی مسابقت حاصل ہوئی اور رہزن ولٹیروں کے ہاتھوں بھی مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ بسوں اور ریلوں کے سفر میں حادثوں سے بھی بال بال بچے۔ زیرِ مطالعہ کتاب میں اپنے سفر وسیاحت کے دوران چند استاد شعراء کے اشعاراور فلمی گیتوں کے مکھڑوں کو بھی کوڈ کیا ہے۔ اس سے اُن کا ذوقِ فلم وعلم دونوں کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔

''خارستان کا مسافر'' موصوف کو میدانِ شہ سوارانِ سوانح حیات میں اُس درجے تک پہنچانے کا جواز فراہم کرتا ہے جس مقام پر مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا ماجد دریا آبادی، ڈپٹی نذیر احمد، پروفیسر حامدی کاشمیری، مشتاق احمد یوسفی، پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اور پروفیسر محمد حسن آج نمایاں اور منوّر ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی زبان وبیان میں ایسا جادو ہے جو ہر کسی کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میں اُن کی خودنوشت سوانح حیات کے بارے میں آخر پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک ایسی سبق آموز وبصیرت افروز خودنوشت سوانح حیات ہے جس کا ترجمہ دُنیا کی ہر ایک زبان میں ہونا چاہیے۔ الحاصل مضمون راقم اس شعر کے ساتھ اپنے بساط بھر تاثرات کا اختتام کرتا ہے کہ

دریائے آگہی سے یہ غوّاصِ فکر وفن
محوِ شناوری سے گہر بار ہوئے ہیں

☆☆☆☆

میرا پورا نام **مشتاق احمد** ہے اور ذات وانی ہے۔ 'وانی' وان سے مشتق ہے۔ 'وان' کشمیری زبان کا لفظ ہے جس کے معنی دُکان کے ہیں۔ گویا میرے جدِامجد کا پیشہ دُکان داری تھا۔ میری مادری زبان کشمیری ہے۔ آج سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل عاصم وانی نام کا ایک شخص سرنل نامی ایک گاؤں ضلع اننت ناگ (کشمیر) سے تجارت اور کاروبار کے سلسلے میں علاقہ مرمت، ضلع ڈوڈہ کی جانب آبسا۔ اُس کے پانچ بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام خالق وانی، دوسرے کا نام اکبر وانی، تیسرے کا نام انور وانی، چوتھے کا نام غفار وانی اور پانچویں بیٹے کا نام احمد وانی تھا۔ انور وانی کا ایک بیٹا تھا جس کا نام وہاب وانی تھا۔ وہاب وانی کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی سے میرے دادا جی محترم محمد مرزا وانی، محمد مُنوّر وانی اور عزیز وانی پیدا ہوئے تھے اور دوسری بیوی سے دادا ثناء اُللہ وانی اور دادا عمر دین پیدا ہوئے تھے۔ میرے سگے دادا محمد مرزا وانی کے چھ بیٹے تھے۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام غلام محی الدّین وانی تھا جو 1947ء میں فوت ہو گئے تھے۔ اُن سے چھوٹے میرے والد محترم محمد اسداللہ وانی تھے۔ اُن سے چھوٹے دو جُڑواں بھائی چچا محمد انور جو بقیدِ حیات ہیں اور دوسرے چچا کا نام غلام احمد وانی تھا جو 1978ء میں ایک درخت سے گر کر وفات پا چکے تھے۔ پانچویں نمبر پر چچا عزیز الدّین وانی تھے جو اپریل 2016ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سب سے چھوٹے چچا کا نام غلام رسول وانی ہے۔

میری اصل تاریخ پیدائش بقول میری والدہ مرحومہ کے 3 مارچ 1963ء ہے لیکن اسکول ریکارڈ میں غلطی سے 3 مارچ 1960ء لکھی گئی ہے۔ اس غلط اندراج کا دُکھ آخر وقت تک رہے گا! مجھے اس موقعے پہ مظفر رزمیؔ کا یہ شعر یاد آ رہا ہے کہ؎

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

بہر حال اسکول ریکارڈ کے مطابق میں 3 مارچ 1960ء کو محلّہ سروال، گاؤں

بھوتہ، علاقہ مرمت، تحصیل وضلع ڈوڈہ، ریاست جموں وکشمیر (ہندوستان) میں پیدا ہوا تھا۔ میری والدہ کا نام مہتاب بیگم تھا۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں جنت اُلفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے! آمین۔ میرے والدمحترم نے دو شادیاں کی تھیں۔ میری چھوٹی ماں کا نام ہاجرہ بیگم تھا جو اب دُنیا میں نہیں ہیں، وہ 29 اپریل 2021ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہوگئی۔ ہم سگے پانچ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ چھوٹی ماں سے میری تین بہنیں ہیں۔ اس طرح ہم بہ فضل اللہ اپنے مرحوم والدمحترم کی ایک درجن اولاد بہ صحت وسلامت ہیں۔ میرے بڑے بھائی کا نام نذیر احمد وانی ہے جو محکمۂ باغبانی میں کشمیر ڈویژن سے ڈائریکٹر کی حیثیت سے سُبکدوش ہو چکے ہیں۔ دوسرے بھائی کا نام محمد ایوب وانی ہے جو اسٹیٹ فارسٹ کارپوریشن سے فارسٹر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ تیسرے بھائی کا نام شوکت علی وانی ہے جو محکمۂ مال سے بحیثیت نائب تحصیلدار سبکدوش ہو چکے ہیں، اُن سے چھوٹا میں ہوں۔ پانچویں بھائی کا نام اشفاق احمد وانی ہے جو مجھ سے چھوٹا ہے اور محکمۂ تعمیرات میں انجینئر ہے۔ تمام بہنیں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ میری سب سے بڑی بہن کا نام ماہِ ظہورہ ہے۔ اُس سے چھوٹی شمیم اختر ہے۔ تیسری بہن کا نام نسیمہ بیگم ہے۔ چوتھی بہن کا نام مشہودہ بیگم ہے۔ دوسری ماں سے میری تین بہنیں ہیں۔ سب سے بڑی بہن کا نام ارشادہ بیگم ہے۔ اُس سے چھوٹی کا نام زبیدہ بیگم ہے۔ اُس سے چھوٹی بہن کا نام مدینہ بیگم ہے۔

یہاں یہ بھی لازمی سمجھتا ہوں کہ میں اپنے بھائیوں، بہنوں کے بیٹوں، بیٹیوں اور خاندان کے افراد کے ناموں سے اپنے قارئین کو واقف کراؤں۔ میرے سب سے بڑے بھائی نذیر احمد وانی صاحب کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹے کا نام ریاض احمد ہے اور بیٹی کا نام نازیہ ہے۔ ریاض کے دو پھول جیسے بچّے ہیں۔ ساحرا اور ذیشان۔ بیٹی نازیہ کی شادی ہو چکی ہے۔ جناب محمد ایوب وانی کے چار بیٹے ہیں۔ اعجاز احمد وانی، سجاد احمد وانی، کفایت اللہ وانی اور شہزاد احمد وانی۔ جناب شوکت علی وانی کے دو بیٹے اور

ایک بیٹی ہے۔ بڑے بیٹے کا نام جاوید احمد وانی ہے۔ چھوٹے بیٹے کا نام عارف علی وانی ہے جو اس وقت انگلینڈ میں ہے، انفارمیشن ٹکنالوجی میں پی ایچ ڈی کر چکا ہے۔ اُس سے چھوٹی بیٹی ہے۔ اُس کا نام روبینہ ہے۔ میرا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹا بڑا ہے اور بیٹی چھوٹی۔ بیٹے کا نام رضا الرحمٰن ہے اور بیٹی کا نام صبا کریم ہے۔ مجھ سے چھوٹے بھائی اشفاق احمد وانی کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے کا نام منیب ارسلان ہے اور چھوٹے کا نام صہیب ہے۔

میرے سب سے بڑے بہنوئی کا نام جناب محمد مقبول وانی ہے۔ وہ محکمہ جنگلات میں رینج آفیسر کی حیثیت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر مرمت کے رہنے والے ہیں لیکن اب تقریباً چالیس سال سے ڈوڈہ میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ میرے ماموں زاد بھائی بھی ہیں۔ اُن کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں سب سے بڑے بیٹے کا نام فاروق ہے، اُس سے چھوٹے کا نام مجاہد ہے، اُس سے چھوٹے کا نام برکت اللہ ہے۔ یہ تینوں گورنمنٹ اسکولوں میں مدرس ہیں۔ بیٹیوں میں سے بڑی کا نام شمع ہے۔ اُس سے چھوٹی شکیلہ ہے۔ اُس سے چھوٹی کا نام سائمہ ہے اور سب سے چھوٹی کا نام عصما ہے وہ گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر ہے۔

دوسرے بہنوئی کا نام جناب پروفیسر محمد اسداللہ وانی ہے جو اردو کے مشہور و معروف پروفیسر رہ چکے ہیں۔ وہ پہلے تو ایک طویل زمانے تک مختلف گورنمنٹ کالجوں میں اردو کی خدمات انجام دیتے رہے اور پھر دو سال تک جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد وہاں سے سبکدوش ہوئے۔ اُن کے تین بیٹے ہیں، بیٹی نہیں ہے۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام یاسر ہے۔ وہ انگلینڈ میں ہے۔ اُس سے چھوٹے کا نام ناصر ہے وہ ڈاکٹر ہے اور تیسرے بیٹے کا نام عامر ہے۔

تیسرے بہنوئی کا نام جناب بشیر احمد ہے اور چوتھے بہنوئی کا نام جناب نذیر احمد ہے یہ دونوں سگے بھائی ہیں اور رشتے میں میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ بشیر احمد کا ایک

بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں۔ بیٹے کا نام نواز ہے۔ سب سے بڑی بیٹی کا نام ثریا ہے۔ اُس سے چھوٹی کا نام ریحانہ ہے، اُس سے چھوٹی کا نام شہناز ہے اور سب سے چھوٹی کا نام واحدہ ہے۔ چوتھے بہنوئی نذیر احمد کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام آزاد ہے۔ چھوٹے بیٹے کا نام شاہد ہے۔ بڑی بیٹی کا نام صغیرہ ہے اور چھوٹی کا نام کوثر ہے۔

میرے پانچویں بہنوئی کا نام جناب اختر حسین ہے۔ وہ محکمہ آب رسانی میں انجینئر کی پوسٹ سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ وہ بھی بنیادی طور پر مرمت کے رہنے والے ہیں لیکن اب ڈوڈہ شہر میں رہتے ہیں۔ اُن کے تین بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام ضیاالدّین ہے۔ وہ اسکول ٹیچر ہے۔ اُس سے چھوٹے کا نام رئیس احمد ہے۔ وہ کمپیوٹر ٹیچر ہے اور تیسرے کا نام تنویر احمد ہے۔ وہ پٹواری ہے۔ بڑی بیٹی کا نام شگفتہ ترنم ہے۔ اُس سے چھوٹی کا نام نازیہ کوثر ہے وہ سینئر اسٹاف نرس ہے۔ چھٹے بہنوئی کا نام جناب محمد شفیع ہے۔ وہ علاقہ مرمت کے ایک گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی پوسٹ سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اُن کے چار بیٹے ہیں بیٹی نہیں ہے۔ اُن کے سب سے بڑے بیٹے کا نام عبدالقدوس ہے۔ وہ اکاونٹنٹ ہے۔ دوسرے بیٹے کا نام محمد تقی ہے۔ تیسرے کا نام جنید اشرف ہے اور چوتھے بیٹے کا نام خالد نجیب ہے۔ میرے ساتویں بہنوئی کا نام جناب محمد رفیق ہے۔ وہ محکمہ آب رسانی میں لائن مین ہے۔ اُن کے تین بیٹے تھے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام مدثر آزاد ہے۔ اُس سے چھوٹے بیٹے کا نام توقیر احمد تھا جو 2014ء میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ تیسرے بیٹے کا نام عبادالرحمٰن ہے۔ بڑی بیٹی کا نام روبیہ بانو ہے اور چھوٹی کا نام فاطمہ تبسم ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ اختر حسین، محمد شفیع اور محمد رفیق آپس میں تینوں سگے بھائی ہیں اور میری چھوٹی ماں کے سگے بھائی کے بیٹے ہیں۔

میرے والد محترم کے بڑے بھائی یعنی میرے تایا غلام محی الدّین وانی (مرحوم) کی ایک ہی بیٹی ہے جس کا نام طیّبہ ہے۔ اُن کا بیٹا نہیں تھا۔ میرے

والدمحترم سے چھوٹے دو جڑواں بھائیوں میں چچا محمد انور کے تین بیٹے حال حیات ہیں ایک گزر چکا ہے اور دو بیٹیاں ہیں۔سب سے بڑے بیٹے کا نام عطا محمد ہے، اُس سے چھوٹے کا نام محمد صادق ہے، تیسرے بیٹے کا نام محمد حسین تھا جواب اس دُنیا میں نہیں ہے۔اُس سے چھوٹا فاروق احمد ہے۔بیٹیوں میں بڑی بیٹی کا نام کلثوم بیگم ہے اور چھوٹی کا نام بیگماں ہے۔ چاچی فاطمہ اب دُنیا میں نہیں ہیں۔ان تمام بہنوں اور بھائیوں میں کوئی بھی ملازمت نہیں کرتا ہے۔دوسرے چچا غلام احمد وانی جو 1978ء میں ایک درخت سے گر کر فوت ہو گئے تھے۔اُن کا ایک بیٹا محمد اظہری ہے وہ پولیس میں سپاہی ہے۔تین بہنیں اُس سے بڑی ہیں۔سب سے بڑی کا نام حنیفہ ہے۔اُس سے چھوٹی کا نام شکیلہ اور سب سے چھوٹی کا نام معروفہ ہے۔ چاچی حلیمہ 2 جون 2022ءکو اس جہان فانی سے رخصت ہوگئی!۔ چچا عزیز الدّین پانچویں نمبر پر تھے جو 2016ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔وہ جنگلات خریدنے والی فرموں میں کمال کے منیجر مانے جاتے تھے۔ چاچی سکینہ ابھی حال حیات ہیں۔اللہ انھیں تندرست رکھے۔ اُن کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔سب سے بڑے بیٹے کا نام ہدایت اللہ ہے۔وہ بشٹ (تحصیل چھنینی) میں دکان داری کرتا ہے۔اُس سے چھوٹا عنایت اللہ ہے وہ زمینداری کرتا ہے۔اُس سے چھوٹا کفایت اللہ ہے وہ گورنمنٹ اسکول میں مدرس ہے۔ اُس سے چھوٹا محمد طارق ہے وہ پولیس میں ہے۔بہنوں میں سب سے بڑی بہن کا نام شاہینہ ہے۔اُس سے چھوٹی کا نام شمشاد ہے۔تیسری کا نام شہناز ہے۔ چچا غلام رسول میرے سب سے چھوٹے چچا ہیں۔وہ پبلک ورک ڈیپارٹمنٹ میں کلرک رہ چکے ہیں۔ وہ کھلینی (ڈوڈہ) میں رہائش پذیر ہیں۔ہماری چاچی اللہ کے فضل سے تندرست ہے۔ اُن کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑے بیٹے کا نام حفیظ اللہ ہے اور دوسرے کا نام محمد صدیق ہے۔دونوں تجارت کے پیشے سے منسلک ہیں۔بیٹی کا نام شمع ہے۔

....

علاقہ مرمت، ضلع ڈوڈہ کے انتہائی پسماندہ علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ چاروں جانب سے فلک بوس پہاڑ ہیں۔ سدا بہار جنگلوں، اُوبڑ کھابڑ راستوں، خاردار جھاڑیوں مگر ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشموں اور مختلف ندی نالوں میں بہتے پانی کی آواز اور مختلف پرندوں کی چہچہاہٹ سُن کر آدمی لُطف اندوز ہوتا ہے۔ اس علاقے میں اناج کم پیدا ہوتا ہے اور پھل زیادہ۔ سیب، ناشپاتی، داکھ، آڑو اور خوبانی ساڑی یہاں کے مشہور پھل ہیں۔ سبزیوں میں کرم، مولی، بینگن، آلو، بند گوبی، شلجم، دھنیا اور سرسوں کا ساگ کافی اُگتا ہے۔ یہاں کے راجماش پورے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ سردیوں کے موسم میں برفباری ہوتی ہے اور پورا علاقہ سفید پوش دکھائی دیتا ہے۔ آج اس علاقے میں سڑک، بجلی، دوہائر اسکینڈری اسکول اور گھر گھر میں لوہے کی پائپوں کے ذریعے پانی سپلائی ہوتا ہے لیکن میرے بچپن اور لڑکپن میں یہ سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ میرا بچپن، لڑکپن، جوانی اور ملازمت کا کچھ عرصہ مرمت میں گزرا ہے۔

میرے والد محترم پورے علاقہ مرمت کے شیر مانے جاتے تھے۔ سچائی، خلوص، بہادری، محنت، دین داری اور غیرت مندی کا جذبہ قُدرت نے اُن میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا تھا۔ کم وبیش 35 برس تک اُنھوں نے اپنے گاؤں بہوتہ کی جامع مسجد چاہوت میں امامت کی تھی۔ عوام اُن کے بہت گرویدہ تھے۔ اپنے زمانے کے مشہور ترکھان اور درزی تھے۔ اُن کے بنائے ہوئے لکڑی کے دروازے اور کھڑکیاں اُن کی صناعی کی یادگاریں ہیں۔ وہ کسی اسکول میں نہیں پڑھے تھے لیکن پڑھے لکھوں کی اصلاح کرتے تھے۔ اُن کے علمی ذوق کا یہ عالم تھا کہ جب اُن کے سگے اور چچیرے بھائی اسکول سے واپس گھر آتے تو ابّا جان اُن کے پاس بیٹھ کر حروف شناسی کی مشق کرتے اور اس طرح اُنھوں نے دھیرے دھیرے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ بعد میں اُنھوں نے باقاعدہ طور پر اپنے وقت کے قابل ترین اُستاد عبدالرّحمان صاحب ساکنہ موٹھی (مرمت) اور روحانی مُرشد جناب پیر مُبارک شاہ (کشمیر) سے قرآن حکیم کی

تعلیم حاصل کی تھی۔ چنانچہ علم کی اہمیت اُن کے دل میں بہت زیادہ تھی، اس لیے اُنھوں نے اپنے پانچوں بیٹوں کو اسکول کی راہ دکھائی اور اُنھیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرایا۔ البتہ میری سات بہنیں مردانہ بالادستی کے باعث آج تک دینی و دُنیاوی تعلیم سے محروم ہیں!

میرے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو دُنیا سے گزرے کئی ماہ و سال ہو گئے ہیں۔ والد صاحب 2003ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور والدہ 2011ء کو جموں میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئیں! آج جب میں اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے دنوں پر دھیان دیتا ہوں تو کئی تلخ یادیں ذہن پہ دستک دینے لگتی ہیں۔ میرا بچپن انتہائی مفلسی میں گزرا ہے۔ مفلسی اتنی تھی کہ پیٹ بھر کھانا میسر نہ تھا۔ میری ماں اکثر دو ڈھائی کیلو مکئی کے دانے کڑھائی میں بھُنتی پھر اُنھیں اوکھلی میں ڈال کے موسلی سے اچھی طرح کوٹتی، جب اُن کا سفوف سا تیار ہو جاتا تو پھر ایک بڑے برتن میں اُنھیں پانی اور نمک ڈال کر چولہے پر پکاتی وہ ایک طرح کی بگنی سی تیار ہو جاتی جسے ہم سب ''وگرا'' کہتے تھے۔ ہم اپنے والدین کے ایک درجن اولاد اسے کھاتے لیکن پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ سال میں ایک بار عید کے دن نئے کپڑے پہننے کو ملتے تھے۔ چھوٹی ہی عمر میں میری والدہ محترمہ نے مجھے جفاکش اور محنتی بنا دیا تھا۔ جنگل سے لکڑیوں کے گٹھے پیٹھ پر اُٹھا کر گھر لے آتا اور اکثر بھیڑ بکریاں اور ڈنگروں کے چارے کے لیے اُونچے اونچے مھارو کے پیڑوں کی شاخیں کاٹ لاتا تھا۔ کبھی کبھی بھوکا سو جاتا تھا۔ جب برف پڑتی تو مجھے بھیڑ بکریاں چرانے میں سخت اذیت پہنچتی۔ برفیلی ہوائیں مجھے ایسے تھپیڑے مارتیں کہ مجھے زندگی ہی سے نفرت ہونے لگتی۔ کھیتوں میں ہل جوتنا میں نے اپنے مرحوم چچا غلام احمد سے چھوٹی ہی عمر میں سیکھ لیا تھا۔

....

میری ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں بہوتہ (محلّہ چاہوت) کے سینٹرل اسکول

سے شروع ہوئی تھی۔ اپنے محلے کے عام لڑکوں کے ساتھ اسکول جاتا تھا۔ اُس زمانے میں اساتذہ کرام بچّوں کی نفسیات سے کافی حد تک نابلد ہوتے تھے۔ اس لیے بچّوں کی تعلیم و تربیت میں ہاتھ اور ڈنڈے کا زیادہ استعمال کرتے تھے۔ مجھے سب سے زیادہ مارعلم ریاضی کے اُستاد سے پڑتی تھی۔ مُنشی پریم چند کی طرح مجھے بھی حساب نہیں آتا تھا خاص کر' الجبرا' تو مجھے اپنے آپ پر جبر معلوم ہوتا تھا۔ البتہ خوشخط لکھتا تھا۔ اساتذہ میری لکھائی پر بہت خوش ہوتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسکول میں گِلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلتا تھا۔ کُشتی لڑنا بھی مجھے پسند تھا۔ شور، ہنگامے اور شرارتی لڑکوں سے میں دُور رہتا تھا۔ اسکول سے چار بجے کے بعد جب میں اور میرا چھوٹا بھائی اشفاق احمد وانی واپس گھر آتے تو اپنے پیارے چچا محمد سلطان صاحب جو ہمارے سگے خالو بھی تھے (انتہائی شریف النفس اور دیندار تھے۔ خدا اُنھیں جنت ُالفردوس میں جگہ عطا فرمائے!) سے حساب اور اُردو املا سیکھتے تھے۔ چچا خود تو پانچویں پاس تھے مگر ایم اے پاس پڑھے لکھے اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

میرے بڑے بھائی نذیر احمد وانی صاحب کو آٹھویں جماعت کے امتحان میں اچھے نمبرات حاصل کرنے کے بعد پیر غلام محمد صاحب (مرحوم) ساکنہ پولیہ، تحصیل ڈورُو، ضلع انت ناگ (کشمیر) کے ہمراہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ پیر صاحب تصوف اور روحانی علم میں خاصی دسترس رکھتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب جب جنوری، فروری میں موسم سرما کی تعطیلات گزارنے گھر آتے تو بڑے مُشفقانہ اور فکر مندانہ انداز میں ہم دونوں چھوٹے بھائیوں کی خیرت اور پڑھائی کا حال معلوم کرتے۔ جنوری، فروری میں وہ باقاعدہ ہماری کلاس لیتے اور جب وہ واپس کشمیر چلے جاتے تو ہمیں پڑھانے لکھوانے کی ذمہ داری وہ اپنے سے چھوٹے بھائی جناب شوکت علی وانی کو سونپتے۔ اِس بھائی نے بھی میری اور میرے چھوٹے بھائی اشفاق احمد وانی کی پڑھائی لکھائی میں بہت دلچسپی لی ہے۔

چھٹی جماعت تک میں اپنے آبائی گاؤں بہوتہ کے سینٹرل اسکول میں پڑھتا رہا اور اُس کے بعد میرے والدین اس حق میں نہیں تھے کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھوں۔ والدین کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں نے چھٹی جماعت کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول گوہا (مرمت) میں داخلہ لیا اور مسلسل چار سال تک اس اسکول میں زیرِ تعلیم رہا۔ شیطان کبھی بھی مجھ سے جھوٹ نہ کہلوائے، سچ کہتا ہوں کہ میری طالب علمی کے یہ چار سال میں نے اتنی کٹھنائیوں میں گزارے ہیں کہ تادم حیات بھول نہیں سکتا۔ آج کا آرام طلب اور کسل مند طالب علم شاید میری ان باتوں پر یقین نہ کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے قصبہ گوہا کی گلی کوچوں میں کورے کاغذ اکٹھے کر کے اُن کی شیرازہ بندی کر کے کاپیاں تیار کی ہیں۔ اُن پہ لکھا ہے لیکن اپنے والدین کو پڑھائی کے معاملے میں کبھی بھی پریشان ہونے کا موقع نہیں دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں مارچ، اپریل کے مہینے میں ساڑھے آٹھ بجے تک زمین میں ہل جوتتا اور پھر اپنی پیاری ماں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اناج کی تقریباً بیس کیلو کی لادی پیٹھ پر اُٹھا کر چچا محمد رمضان صاحب کے گھراٹ پر ڈال دیتا (چچا رمضان بھی اگرچہ میرے سگے چچا نہیں ہیں لیکن سگے خالو ہیں) چار بجے اسکول سے چھٹی ہو جاتی اور میں اپنا کتابوں کا بستہ اُٹھائے تقریباً دو کیلومیٹر چڑھائی چڑھنے کے بعد تھکا ماندہ شام کو گھر پہنچتا۔ ہر ہفتے میرا یہی معمول ہوتا تھا۔ ساتویں سے نویں جماعت تک جنوری اور فروری کے مہینوں میں جب سردیوں کی چھٹیوں کے لئے دو ڈھائی مہینے کے لئے اسکول بند کر دیے جاتے تو میں اور میرا خالو زاد بھائی محمد سعید وانی اپنی کتابوں، اسکول کی وردی اور بوٹ وغیرہ کا خرچہ تیار کرنے کے لیے جنگلات خریدنے والی فرم کے ٹھیکیداروں کے ساتھ مزدوری کماتے۔ اُس زمانے میں مرمت کے مشہور نالا رگی میں لکڑی کے شہتیر محان کی صورت میں بہائے جاتے۔ میرا اور سعید کا کام دس بارہ مزدوروں کے ساتھ موہری والوں کو گھاس کاٹ کر دینا ہوتا۔ جب میں نے آٹھویں کا امتحان گورنمٹ ہائی اسکول

گوہا سے پاس کیا تو بڑے بھائی نذیر احمد وانی صاحب اُن دنوں چھینی، ضلع اُدھم پور میں بحیثیت ہارٹیکلچر اسسٹنٹ کی پوسٹ پہ کام کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ابا نے مجھے نویں جماعت کی کتابیں اور کاپیاں خریدنے کے لیے اُن کے پاس لایا تھا۔ یہاں یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ ہم پانچ بھائیوں میں سب سے بڑے بھائی نذیر احمد وانی صاحب انتہائی مخلص، نیک اور نرم مزاج ہیں۔ والد محترم کی زبانی یہ خوشخبری سُن کر بہت خوش ہوئے کہ میں نے آٹھویں کا امتحان پاس کیا ہے۔ بڑے بھائی صاحب سائنسی علوم سے بے حد متاثر تھے۔ اُنھوں نے خود سائنس پڑھی تھی اور خدا نے اُنھیں اپنی محنت کا یہ صلہ بھی دیا تھا کہ وہ ایک اچھی پوسٹ پر تعینات تھے۔ اُنھوں نے والد صاحب کے بار بار منع کرنے کے باوجود مجھے آٹھویں کے بعد سائنس پڑھنے پر آمادہ کیا اور دیگر مضامین کی کتابوں کے ساتھ سائنس کی کتابیں بھی خرید کر دے دیں لیکن گوہا ہائی اسکول میں نہ تو لیبارٹری تھی اور نہ ہی مجھے وہ کامل اُستاد میسّر تھا کہ جو میرے لیے اندھیرے میں چراغ بن کر میری رہنمائی کرتا۔ میں آج تک ماسٹر ایشور چند بھگت کو نہیں بھول پایا ہوں کہ جس نے ایک مہینے کے بعد ذبردستی مجھ سے سائنس چھڑائی تھی۔ یہ غالباً 1978ء کی بات ہے۔

....

1972ء کا سال ہم سب بھائیوں اور بہنوں کے لیے انتہائی اچھا اور روشن مستقبل کا سال مانا جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اسی سال والد محترم نے ایک ایسا انقلابی قدم اُٹھایا تھا کہ ہم سب بھائیوں نے اندھیرے سے روشنی کی طرف چلنا شروع کیا تھا۔ ابا حضور جب اپنے آبائی وطن 'مرمت' جیسے پچھڑے گاؤں بہوتہ کے سماجی، تعلیمی، طبی، معاشی اور سماجی مسائل سے تنگ آ گئے تو اُنھوں نے مجبوراً علاقہ مرمت سے ہجرت کی اور ضلع اُدھم پور کی تحصیل چھینی کے ایک تاریخی مقام ماتلائی میں (1972ء) میں زمین خریدی اور یہیں پر سکونت اختیار کی۔ میری چھوٹی ماں، تین

بہنوں کے علاوہ میرا ایک بھائی جناب محمد ایوب وانی سب سے پہلے ماتلائی میں والد محترم کے ہمراہ یہاں آبسے۔ میں، میرا چھوٹا بھائی اشفاق احمد وانی اور مجھ سے بڑے بھائی شوکت علی وانی اور میری سگی تین بہنیں مرمت میں ہی اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ رہے۔ ہم بھائیوں اور بہنوں میں سب سے بڑی بہن کی شادی اُس وقت ہوچکی تھی جب میں ابھی دُودھ پیتا بچّہ تھا۔ ساتویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد میرے چھوٹے بھائی اشفاق احمد وانی کو بھی گورنمنٹ ہائی اسکول سُندھ مہادیو میں داخل کروایا گیا اور دو سال بعد مجھ سے بڑے بھائی جناب شوکت علی وانی نے بھی ہائی اسکول سُندھ مہادیو میں داخلہ لیا اور اب بھائیوں میں، میں اکیلا مرمت میں رہ گیا۔

1974ء میں میرے دو سگے بڑے بھائیوں نذیر احمد وانی صاحب، جناب محمد ایوب وانی اور تین بڑی بہنوں کے علاوہ میرے چچازاد بھائی جناب عطا محمد وانی اور دو بہنوں کی شادی ہوگئی تھی۔ اتنے بھائیوں اور بہنوں کی اکھٹی شادی میں حیران کُن بات یہ تھی کہ پورے علاقہ مرمت کو شادی کی دعوت دی گئی تھی اور بیک وقت آٹھ دُلہے اور آٹھ دُلہنیں یعنی سولہ افراد ازدواجی زندگی کے رشتے میں بندھ گئے تھے۔ ایک ہفتے تک شادی کا پروگرام چلتا رہا تھا اور لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔

ساتویں سے دسویں تک میں گورنمنٹ ہائی اسکول گوہا میں پڑھتا رہا۔ یہاں ایک انتہائی نیک، سیدھے سادے اور صوم وصلوٰۃ کے پابند اپنے خاندان کے چچا عبدالغنی کا ذکر کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ جو ہمارے پورے خاندان میں انتہائی شریف، دیانتدار اور سادگی کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ چچا عبدالغنی محکمۂ تعلیم میں ایک چپراسی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے اور بعد میں ٹیچر کی حیثیت سے سُبکدوش ہوئے تھے۔ آج وہ دُنیا میں نہیں ہیں لیکن اُن کی باتیں اور یادیں میرے ذہن کے البم میں آج بھی کلبلا رہی ہیں۔ گوہا ہائی اسکول میں وہ تقریباً اکیس برس تک اپنی ملازمت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ چچا غنی میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہفتے، دس دن کے

بعد جب اسکول میں اساتذہ کرام دیسی گھی کا حلوہ بناتے تو چچا اپنے حصے میں سے الگ میرا حصہ نکال لیتے اور پھر تنہائی میں مجھے پکڑاتے ہوئے کہتے ’’یہ لے کھالینا۔‘‘

میری دینی تربیت میں چچا عبدالغنی کے چھوٹے بھائی جناب چچا محمد اقبال وانی کا کلیدی رول رہا ہے۔ الحمد شریف، آیتہً الکرسی، چھے کلمے، نماز، دُعائے قنوت اور صفت ایمان کے علاوہ وضو اور غسل کے تمام بنیادی مسائل میں نے اُنھیں سے سیکھے ہیں (چچا محمد اقبال وانی کا سب سے بڑا بیٹا ڈاکٹر عنایت اللہ وانی ندوی ہمارے خاندان کی ایک شناخت ہے۔ وہ انتہائی شریف، ذہین، عالم دین اور کالج میں عربی زبان کا ایک باصلاحیت استاد ہے)۔ دسویں جماعت کا امتحان میں نے ہائی اسکول گوہا کے تحت 1979ء میں دیا تھا اور امتحان کا سینٹر ہائی اسکول طرون میں تھا۔ یہ علاقہ تقریباً کیلاڑ (بھدرواہ) کے نزدیک پڑتا ہے۔ امتحان کا نتیجہ نکلا تو مجھے چچا محمد سلطان (مرحوم) کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ میں تین مضامین یعنی انگریزی، حساب اور تاریخ وجغرافیہ میں فیل ہو چکا ہوں تو پورے ایک مہینے تک اپنی ناکامیابی پر روتا رہا۔ اب میں نے پرائیویٹ طور پر فارم بھرا اور جنگلوں، بیابانوں میں بھیڑ بکریوں کے ساتھ امتحان کی تیاری میں جُٹ گیا۔ فکر واحساس نے مجھے دن رات محنت کرنے پر آمادہ کیا۔ میرے اُس زمانے میں علاقہ مرمت میں بجلی کا نام ونشان نہیں تھا، یہاں تک کہ مٹی کا تیل اور موم بتی بھی دستیاب نہیں تھی۔ ہم محلے کے چند لڑکے کلہاڑا لے کر جنگل سے کائل یا دیودار کے درخت کی چھوٹی چھوٹی گٹیاں سی بوری میں ڈال کر گھر لے آتے، اُنھیں جلاتے اور اُن کی روشنی میں پڑھتے۔ انتہائی محنت ولگن اور کوشش کے بعد بہ فضل اللہ تعالیٰ میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول گوہا سے پرائیویٹ طور پر دسویں جماعت کا امتحان پاس کرلیا یہ 1980ء کی بات ہے۔ دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی بارِ گراں میرے کندھوں سے اُتر گیا ہو۔ اب میرے اندر مزید تعلیم حاصل کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ میں نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا مصمّم

ارادہ کرلیا۔ والدِ محترم یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں آگے پڑھوں۔ میں نے اُن سے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اُنھوں نے ہنس کے میری بات ٹال دی۔ بالآخر میں نے چچا محمد رمضان کو اپنا سفارشی بنایا۔ اُنھوں نے بڑی منت سماجت کرکے ابّا کو اس بات پہ راضی کرلیا تھا کہ میں دسویں سے آگے پڑھوں مگر بے سروسامانی کا عالم میرے نیک ارادوں کو متزلزل کررہا تھا لیکن بہ فضلِ اللہ تعالیٰ اس نازک مرحلے پر میرے شفیق بہنوئی پروفیسر محمد اسداللہ وانی صاحب اور میری ہمدرد بہن شمیم اختر نے میری بہت مدد کی تھی۔ اُنھوں نے مجھے نہ صرف اپنے پاس ایک طویل مدت تک رکھا بلکہ میرے تعلیمی اخراجات بھی پورے کرتے رہے۔ اس لیے میں نہ صرف اپنے والدین، بڑے بھائی نذیر احمد وانی صاحب کا احسان مند اور شکر گزار ہوں بلکہ اپنے بہنوئی اور بہن کا بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے واقعی میری مدد کی ہے۔ 1981ء میں، میں اپنے بہنوئی اور بہن کے پاس سرینگر چلا گیا۔ اُنھوں نے مجھے گورنمنٹ ہائر اسکنڈری اسکول جواہر نگر میں گیارھویں جماعت میں داخلہ دلایا۔ میں تقریباً ایک سال تک کشمیر میں رہا۔ اسی سال میرے بہنوئی خوش نصیبی سے گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ میں اُردو کے لیکچرار تعینات ہوئے اور اُنھوں نے ایک طویل مدت کے بعد کلچرل اکادمی کو خیر باد کہا۔ میں جواہر نگر میں پڑھتا بھی تھا اور ٹیگور ہال میں اسکول سے دو بجے کے بعد فنِ خوش نویسی سیکھنے بھی جاتا تھا۔ 1982ء میں میری والدہ محترمہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی مکمل طور پر اپنے مادرِ وطن مرمت کو خیر باد کہا اور وہ ماتلائی میں آ گئی۔ 1981ء میں، میں نے ہائر اسکنڈری اسکول جواہر نگر (سرینگر) سے گیارھویں جماعت کا امتحان پاس کیا اور 1982ء میں، میں بھی اپنی بہن اور بہنوئی کے ہمراہ بھدرواہ چلا گیا۔ مجھے اپنے شفیق بہنوئی پروفیسر محمد اسداللہ وانی صاحب کی وساطت سے ڈگری کالج بھدرواہ میں بارہویں جماعت میں داخلہ ملا۔ میں ساٹھ لڑکیوں میں اکیلا لڑکا تھا 1982ء سے لے کر مئی 1985ء تک میں بھدرواہ میں رہا

اوراسی سال میں نے بی اے کا امتحان پاس کرلیا1986ء میں، میں اپنے گھر مانتلائی میں آ کر ڈھور ڈنگر چرانے لگا۔ جنوری، فروری کے مہینے میں، میں نے سدھ مہادیو میں زیرِتعمیر اسپتال کی عمارت میں پریتم چند ٹھیکیدار کے ساتھ نو دن تک بحیثیت مزدور دس روپے پر کام کیا۔ کچھ دن تک سڑک پر سے برف ہٹائی اور چار دن برفباری کی وجہ سے بجلی کے جو کھمبے ڈھ گئے تھے اُنھیں کھڑا کرنے کا کام کیا لیکن پانچویں دن جب مزدوروں کو یہ معلوم ہوا کہ میں بی اے پاس ہونے کے باوجود دس روپے پر ایک عام مزدور کی طرح کام کرتا ہوں تو اُنھوں نے ٹھیکیدار کے سامنے احتجاج کیا کہ اس شخص کو چھٹی کردی جائے۔ دراصل یہ احتجاجی مزدور اس خدشے میں مبتلا تھے کہ اگر پتھر ڈھونے اور بیلچہ، کدال سے کام بی اے پاس لوگ کرنے لگیں گے تو عام ان پڑھ لوگ کدھر جائیں گے۔ غرضیکہ اُنھیں میرا دس روپے پہ مزدوری کرنا بالکل ناپسند تھا۔ چنانچہ مجھے چھٹی کردی گئی اور میں مایوس ہوکر جناب لعل چند مسافر لیکچرار (ہائر اسکنڈری اسکول میں اردو کے لیکچرار رہ چکے ہیں) کے گھر پر آ گیا، انھیں اپنی رودادِ غم سنائی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ میں مزدوری کر کے روپے کمانا چاہتا ہوں تاکہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ وہ مجھے بار بار سمجھاتے رہے کہ آپ کا ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرنا بلکہ یہ کہنا ہی مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔ میں نے اُنھیں مجبور کیا کہ وہ مجھے اپنے ہی گھر میں کوئی کام کرنے کو دیں۔ میں اپنی ضد میں کامیاب ہوگیا۔ اُنھوں نے مجبور ہوکر کہا ''وہ سامنے اینٹوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ اُنھیں وہاں سے اُٹھا کر یہاں رکھ دیجیے'' میں نے شام چار بجے تک اینٹیں ڈھونے کا کام کیا۔ غالباً ایک سو روپیہ میری جیب میں آ گیا۔ میں خوش ہوا اور اپنے گھر چلا آیا۔ یہاں میں یہ کہنا لازمی سمجھتا ہوں کہ جناب لعل چند مسافر نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے اکثر نوازا ہے۔ میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔ میری کئی کہانیاں اُنھوں نے سُنی ہیں۔ وہ ذات پات، رنگ ونسل، بھید بھاؤ، علاقائیت اور تعصب کے سخت خلاف ہیں۔ اردو شعر وادب کے دلدادہ ہیں۔ وہ جب اردو کے

لیکچرار بنے تو سب سے پہلے اُنھیں سُندر بنی میں تعینات کیا گیا۔آج جب بھی میں جموں سے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کی طرف آتا ہوں یا واپس جموں جاتا ہوں تو سُندر بنی سے گزرتے ہوئے مجھے جناب لعل چند مسافؔر یاد آجاتے ہیں۔

....

جنوری 1986ء میں میرے والدِ محترم نے بڑے بھائی جناب نذیر احمد وانی، بہنوئی محمد اسد اللہ وانی صاحب اور چچا عزیز الدّین صاحب سے مانتلائی میں پکّا مکان تعمیر کرنے کا مشورہ کیا۔اس سلسلے میں والدِ محترم کے ایک عزیز شاگرد غلام حسین کھٹانہ ساکنہ درمتھل کو بطور مستری کام سپرد کیا۔میں نے اُس مستری کے ساتھ بلکہ اُس کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے پتھر ڈھوئے اور گارے کا کام کرتا رہا۔ستمبر 1986ء میں، میں پھر اپنے شفیق بہنوئی پروفیسر محمد اسد اللہ وانی صاحب اور ہمدرد بہن شمیم اختر کے پاس جموں آگیا۔اُردو سے بے پناہ محبت کی وجہ سے میں نے جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں داخلہ لیا۔اُس وقت شعبۂ اُردو میں آنجہانی پروفیسر شیام لعل کالڑا (عابد پیشاوری) پروفیسر منظر اعظمی (مرحوم)، پروفیسر ظہور الدّین (مرحوم) اور محترمہ خورشید ہمراہ صدیقی صاحبہ اور پروفیسر نصرت آراء چودھری صاحبہ (مرحومہ) جیسے اساتذہ کی ملازمت کا سورج سوانیزے پر چمک رہا تھا۔پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کا اپنا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں وہ لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔میری اکثر اُن سے ملاقات ہوتی تھی۔یہ الگ بات ہے کہ اردو والے پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کو بہت حد تک بھول چکے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جگن ناتھ آزادؔ ذہین اور قابل ترین ادبی شخصیت تھے۔میرے ساتھیوں میں سکھ کمل جیت سنگھ، اسمٰعیل پونچھی اور پرویز چودھری جیسے لوگ شامل تھے۔کلاسیکی گیت سنگیت کے ساتھ مجھے بچپن ہی سے بے حد دلچسپی رہی ہے۔گیت اور غزل گائکی کے تمام جوہر قدرت نے مجھے ودیعت کیے ہیں۔میں شعبۂ اردو میں گیت اور غزلیں گایا کرتا تھا اور میری آواز میں ایسا لوچ اور سحر تھا کہ راہ گیر میری

آواز سُن کر میری طرف متوجہ ہوتے۔ شہرۂ آفاق شاعر جناب بشیر بدؔر کی یہ غزل آج بھی میں اپنے سُر تال میں گایا کرتا ہوں:

میرے دل کی راکھ کرید مت اِسے مُسکرا کے ہوا نہ دے
یہ چراغ پھر بھی چراغ ہے کہیں تیرا ہاتھ جلا نہ دے
یہاں لوگ رہتے ہیں رات دن کسی مصلحت کی نقاب میں
یہ تری نگاہ کی سادگی کہیں دل کے راز بتا نہ دے
نئے دور کے نئے خواب ہیں نئے موسموں کے گلاب ہیں
یہ محبتوں کے چراغ ہیں اِنھیں نفرتوں کی ہوا نہ دے
میں غزل کی شبنمی آنکھ سے یہ دُکھوں کے پھول چُنا کروں
مری سلطنت میرا فن رہے مجھے تخت و تاج خدا نہ دے

....

1985ء میں، میں نے ضلع ڈوڈہ کے صدر مقام ڈوڈہ میں ٹیچر کا انٹرویو دیا تھا۔ مجھ سے جو سوالات پوچھے گئے تھے میں نے پورے یقین کے ساتھ اُن کا تسلی بخش جواب دیا تھا۔ اُس وقت ریاست جموں و کشمیر میں گورنر راج نافذ تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد جنوری 1987ء میں جب ٹیچروں کی لسٹ نکلی تو مجھ جیسے معمولی آدمی کا نام بھی اُس میں شامل تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا لازمی سمجھتا ہوں کہ میں چھوٹی ہی عمر سے ٹیچر بننا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں بچپن ہی سے ایک بڑا پولیس آفیسر بننے کی تمنا دل میں بسائے ہوئے تھا۔ جب ٹیچروں کی لسٹ میں میرا نام آیا تو میں دُکھی ہو گیا اور اس پوسٹ پہ نہ جانے کے لیے تقریباً بیس پچیس دن تک ٹال مٹول کرتا رہا۔ میں دراصل اب اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن جب میرے بڑے بھائی جناب نذیر احمد وانی، میرے شفیق بہنوئی محمد اسد اللہ وانی اور میری ہمدرد بہن شمیم اختر کو میرے اس منفی رویّے کا علم ہوا تو وہ مجھ سے سخت برہم ہوئے اور مجھے مجبوراً نہ چاہتے ہوئے

بھی ٹیچر بننا پڑا۔ مجھے اپنے آبائی گاؤں بہوتہ کے مڈل اسکول میں تعینات کیا گیا۔ میں نے 24 مارچ 1987ء کو جوائن کیا اور پہلی تنخواہ 910 روپے ملی۔ مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ایم اے اُردو کے تین سمسٹر میں نے ٹیچر بھرتی ہونے سے پہلے ہی پاس کر لیے تھے اور چوتھا سمسٹر میں نے پرائیویٹ طور پر پاس کر لیا۔ اس طرح میں نے 1988ء میں جموں یونیورسٹی کے تحت اُردو میں ایم اے کیا۔

مارچ 1987ء سے جون 1989ء تک میں گورنمنٹ مڈل اسکول بہوتہ (مرمت) میں مُدرس کی حیثیت سے کام کرتا رہا اُس کے بعد میں نے اپنا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول بلند پور میں کروایا۔ بلند پور بلاک عسر (ڈوڈہ) کا ایک انتہائی خوب صورت اور دلکش مقام ہے، جٹھی اور کنڈیری نالا سے تقریباً چار کیلو میٹر سیدھی چڑھائی پر بلند پور واقع ہے۔ دیوداروں کا ایک طویل سلسلہ چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کی اپنی ایک مخصوص بولی ہے جو بھدرواہی سے تھوڑی ملتی ہے۔ اُس زمانے میں میرے اُستاد محترم جناب سوامی راج میگوان بھی بلند پور ہائی اسکول میں ماسٹر گریڈ میں کام کرتے تھے۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے اپنے اُستاد کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ گرمیوں کے دنوں میں، میں اکثر بلند پور سے پیدل کھرونٹھی سے ہوتے ہوئے سُہانی کنڈ کے راستے سدھ مہادیو پہنچ جاتا تھا اور کبھی کبھی کرلاہ سے کاسل موڑ تک پیدل آتا تھا اور وہاں سے بس پر سوار ہو کر کنڈیری نالا اُتر جاتا تھا۔ یہ سب گھنے جنگلی راستے تھے کہ جن پہ چل کر میں اپنی بے فکری کے دن گزار رہا تھا۔

جولائی 1988ء میں مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو ایک جان لیوا حادثہ پیش آیا۔ مانتلائی میں ہمارے نئے مکان کی تعمیر کا کام چل رہا تھا گرمی بہت زیادہ تھی، ایک روز والد محترم کے کہنے پر میں اور میرا چھوٹا بھائی اشفاق احمد وانی اور ایک مزدور جس کا نام محمد اکبر تھا۔ اپنے گھر کے نزدیک نیچے نالے پہ ریت نکالنے چلے گئے۔ کچھ وقت تک ہم تینوں بیلچے اور کدال سے ریت اکٹھی کرتے رہے اور جب ہم پسینے سے شرابور

ہو گئے تو سب سے پہلے اشفاق احمد نے کپڑے اُتارے اور ایک ایسی جگہ پر پانی میں کود پڑا جہاں گرداب تھا۔ پہلے دن بہت زیادہ بارش ہوئی تھی۔ اس لیے نالے میں پانی معمول سے زیادہ بہہ رہا تھا۔ میں نے بھی کپڑے اُتار لیے۔ دیکھتے دیکھتے اشفاق احمد کو پانی نے اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا اور وہ ڈُوبنے لگا۔ اُس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں فوراً اُس کی طرف لپکا اور جونہی میں نے اُس کا ہاتھ پکڑا تو پانی کے تیز ریلے نے ہم دونوں کو دبوچ لیا۔ اب ہم دونوں پانی میں غوطے کھانے لگے اور دیر تک ڈوبتے اُبھرتے رہے۔ ہم ایک ایسے بھنور میں پھنس چکے تھے جہاں ہمیں اپنی موت کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ اکبر علی گونگا تھا، اُس کی بات صاف سُنائی نہیں دیتی تھی۔ وہ میرا اور میرے چھوٹے بھائی کا حال دیکھ کر رونے لگا اور بڑی بے تابی سے لکڑی کا کوئی لمبا ڈنڈا ڈھونڈنے کے لیے ادھر اُدھر دوڑتا رہا۔ اشفاق تھوڑا بہت تیرنا جانتا تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے پانی کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کیا لیکن میں پانی میں دیر تک ڈوبتا اُبھرتا رہا۔ میں پانی کا مقابلہ بہت دیر تک کرتا رہا لیکن جب میرے بازو اور ٹانگیں تھک گئیں تو میں بے ہوش ہونے لگا اور موت کے سائے میری آنکھوں میں چھا جانے لگے۔ میں دل ہی دل میں خداوندِ کریم کا ذکر کرنے لگا اور زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ اسی اثنا میں کسی ان دیکھی طاقت نے مجھے پانی سے باہر پھینک دیا۔ میں اور اشفاق دونوں آپس میں ایک دوسرے سے لپٹ کے دیر تک روتے رہے۔ ہمیں نئی زندگی ملی تھی۔ اس لیے ہم دونوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم کبھی بھی اس طرح کسی نالے میں نہیں نہائیں گے۔

....

1989ء میں، میں نے پرائیویٹ طور پر اُردو میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے اپنے محکمے سے اجازت نامہ حاصل کرنے کی خاطر فائل پیش کی جو بڑی ذہنی کوفتوں کے بعد افسرانِ بالا نے منظور کی اور مجھے پورے سات ماہ کے بعد پی ایچ ڈی کرنے کی

منظوری مل گئی۔ اُن دنوں جموں یونیورسٹی میں وہی طالب علم بغیر ایم فل کے پی ایچ ڈی کرسکتا تھا جس نے ایم اے میں پچپن فی صدی نمبرات حاصل کیے ہوتے۔ میرے لیے موضوع ''تلوک چند محرومؔ: حیات اور ادبی خدمات'' پر کام کرنا طے پایا اور آنجہانی پروفیسر شیام لعل کالڑا صاحب میرے نگران مقرر ہوئے۔ بعد میں میرا داخلہ مسترد کر دیا گیا اور میری زندگی کے چھ برس ضائع ہوگئے۔ میرا یہ موضوع کسی اور شخص کو دیا گیا تھا۔

1990ء میں میری سگائی قصبہ چھنی کے ایک شریف اور نیک خاندان کی دُختر راشدہ اختر سے ہوئی۔ اُن دنوں میری ڈیوٹی گورنمنٹ ہائی اسکول بلند پور میں تھی۔ مئی 1991ء میں میرا تبادلہ ضلع ڈوڈہ سے ضلع اُدھم پور میں ہوا اور مجھے گورنمنٹ مڈل اسکول بپ (زون چھنی) میں تعینات کیا گیا لیکن پوسٹ خالی نہ ہونے کی صورت میں میری تنخواہ پرائمری اسکول لوتھڑ میں خالی پڑی پوسٹ کے متبادل نکلتی رہی۔ 6، اکتوبر 1991ء کو میری شادی راشدہ اختر سے ہوگئی جو میری زندگی میں بہار بن کے آئی۔ میں اس لحاظ سے اپنے آپ کو بہت زیادہ خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میری رفیقۂ حیات راشدہ اختر صوم وصلوٰۃ کی پابند، نفاست پسند اور وفادار ہے کہ جو میرے دُکھ سکھ میں قدم قدم پہ میرا ساتھ نبھا رہی ہے۔ مجھے مئی 1992ء میں مڈل اسکول بپ سے عارضی طور پر پرائمری اسکول مانتلائی میں رکھا گیا۔ میں اس اسکول میں 110 بچوں کی تعلیم وتربیت کرنے کے علاوہ اُن کی یونیفارم زونل ایجوکیشن دفتر چھنی سے لاتا تھا اور اس کے علاوہ چار اسکولوں کے ٹیچروں کی تنخواہ بھی لاتا تھا۔ اُس زمانے میں اے ٹی ایم سسٹم نہیں آیا تھا۔ 5 ستمبر 1993ء کو میرا لختِ جگر رضا الرحمٰن تولّد ہوا۔ میں اپنے گاؤں مانتلائی کے عوام کا بے حد شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے مجھے ہندی سیکھنے کی غیرت دلائی۔ ہوا یوں کہ پرائمری اسکول مانتلائی میں ہندی پڑھنے والے بچوں کی تعداد زیادہ تھی جب کہ اُردو پڑھنے والے بچے تقریباً بیس تھے۔ میں ہندی بالکل نہیں جانتا تھا۔ ہندی سے نابلد ہونے کی وجہ سے مانتلائی کے چند لوگ میرے خلاف اُس

وقت کے ضلع ایجوکیشن آفیسر (ادھم پور) کے پاس چلے گئے اور میرے بارے میں یہ شکایت کی کہ ہمارے اسکول کا مُدرّس صرف اُردو اور انگریزی جانتا ہے وہ ہندی بالکل نہیں جانتا ہے جب کہ ہمارے بیشتر بچّے ہندی پڑھتے ہیں۔اس لیے اُس ٹیچر کو وہاں سے تبدیل کیا جائے یا پھر ہمیں دوسرا ٹیچر ہندی پڑھانے والا دیا جائے۔اُن لوگوں کی یہ مانگ سُنی آن سُنی کر دی گئی اور مجھے جب اس سارے معاملے کا پتا چلا تو کسی حد تک دُکھی ہو گیا اور میرے دل میں غیرت کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ میں نے دوسرے ہی دن ہندی کا قاعدہ اور کاپی خریدی اور پانچویں کے اُن بچّوں سے ہندی سیکھنے لگا جو ہندی پڑھتے تھے۔میں نے محنت اور کوشش سے چند دنوں میں ہندی کی ورن مالا اور جوڑ سیکھ لیے اور اُنہی بچّوں کو ہندی پڑھانے لگا جو میرے اسکول میں پڑھتے تھے۔تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد میں نے فر فر ہندی پڑھنا سیکھ لیا۔اُس وقت میری عمر 32 برس تھی۔

1993ء میں میرا تبادلہ اپنی اصلی پوسٹ پرائمری اسکول لوتھڑ میں کر دیا گیا لیکن میں نے اپنے آفیسر کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے پرائمری اسکول لوتھڑ میں نہ جانے پر مُصر رہا۔اس نازک مرحلے پر میرے ہمدرد اور مخلص دوست جناب حاجی محمد بشیر خان قاضی نے میری بھرپور مدد کی۔اُنھوں نے میڈم قُدسیہ جو اُس وقت ضلع اُدھم پور میں بحیثیتِ چیف ایجوکیشن آفیسر تعینات تھی۔ اُس نیک خاتون سے میرا تبادلہ پرائمری اسکول لوتھڑ سے گورنمنٹ مڈل اسکول بشٹ (زون چنہنی) میں کروایا۔حاجی محمد بشیر خان قاضی صاحب بھی اُن دنوں مڈل اسکول بشٹ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ماسٹر بشیر صاحب نے میری کئی معاملوں میں مدد کی ہے۔

جنوری 1992ء میں، میں نے پی ایچ ڈی کے لیے دوبارہ فارم اور فیس وغیرہ جمع کرائی اور از سرِ نو اپنے محکمے سے پی ایچ ڈی کرنے کا اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے فائل پیش کی۔ یہ فائل ایک سال تک دفتروں میں گھومتی رہی اور میرا بہت سا روپیہ خرچ ہونے کے بعد بڑی مشکلوں اور خوشامدوں کے بعد مجھے 1994ء میں اپنے

محکمے سے اجازت نامہ موصول ہوا۔ اب میں نے پروفیسر ظہورالدّین صاحب (مرحوم) کو اپنا نگران بنایا۔ اُنھوں نے مجھے ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ موضوع طلاق شُدہ تھا۔ کیول کرشن شاکر جو ہائر اسکنڈری اسکول میں لیکچرار تھے، چار سال کے بعد اس موضوع کو طلاق دے چکے تھے۔ بہر حال مجھ جیسے معمولی آدمی کو یہ مشکل ترین موضوع دیا گیا۔ میں اس موضوع پر کام کرنے سے پہلے ہی پروفیسر گیان چند جین کی اہم کتاب ''تحقیق کا فن''، رشید حسن خان کی کتاب ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ'' اور ش اختر کی کتاب ''تحقیق کا طریقۂ کار'' کے علاوہ ادبی تحقیق سے متعلق بہت سی کتابیں پڑھ چکا تھا۔ اپنے مذکورہ موضوع سے متعلق میں نے ہندوستان کے تقریباً تمام اُردو کے کُتب فروشوں سے کتابیں بذریعہ ڈاک خرید کر پڑھنا شروع کیں۔ موضوع ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' کا خاکہ یوں تیار کیا گیا تھا:

پہلا باب: جدید تہذیبی بحران

1۔ مفہوم

2۔ محرکات

3۔ حدود

4۔ سائنسی انقلاب

5۔ صنعتی انقلاب

6۔ فرانس کا انقلاب

7۔ ڈارون کا فلسفۂ ارتقا

8۔ علم نفسیات کا ارتقا

9۔ تین فلاسفر: مارکس، فرائڈ اور ڈرکایم کے نظریات

10۔تحریکِ وجودیت

11۔حدود

دوسرا باب: اقوام عالم میں تہذیبی بحران

1۔سُمیری تہذیب میں بحران

2۔مصری تہذیب میں بحران

3۔یونانی تہذیب میں بحران

4۔ہڑپا اور موہنجوداڑو تہذیب میں بحران

5۔رومی تہذیب میں بحران

6فرانسیسی تہذیب میں بحران

7۔چینی تہذیب میں بحران

8۔جرمنی تہذیب میں بحران

9۔امریکی تہذیب میں بحران

10۔ایرانی تہذیب میں بحران

11۔ہندوستانی تہذیب میں بحران

12۔پاکستانی تہذیب میں بحران

محرکات:

1۔سائنسی انکشافات

2۔مذہبی حقائق کا بطلان

3۔انسانی اقدار کی شکست وریخت

4۔نیا اقتصادی نظام

تیسرا باب: اُردو ناول میں جدید تہذیبی بحران کی عکّاسی

1۔ ''فسانۂ آزاد'' پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ 2۔ ''امراؤ جان ادا'' مرزا محمد ہادی رُسوا۔ 3۔ ''گئودان'' منشی پریم چند۔ 4۔ ''لندن کی ایک رات'' سجاد ظہیر۔ 5۔ ''گریز'' عزیز احمد۔ 6۔ ''شامِ اودھ'' احسن فاروقی۔ 7۔ ''آگ کا دریا'' قرۃ العین حیدر۔ 8۔ ''خدا کی بستی'' شوکت صدیقی۔ 9۔ ''تلاشِ بہاراں'' جمیلہ ہاشمی۔ 10۔ ''اُداس نسلیں'' عبداللہ حسین۔ 11۔ ''آنگن'' خدیجہ مستور۔ 12۔ ''بستی'' انتظار حسین۔ 13۔ ''نمرتا'' صلاح الدّین پرویز۔ 14۔ ''خوشیوں کا باغ'' انور سجاد۔ 15۔ ''سارے دن کا تھکا ہوا پُرش'' صلاح الدّین پرویز۔ 16۔ ''راجہ گدھ'' بانو قدسیہ۔ 17۔ ''دوگز زمین'' عبدالصّمد۔ 18۔ ''آئڈنٹٹی کارڈ'' صلاح الدّین پرویز۔ 19۔ ''فائر ایریا'' الیاس احمد گدی۔

چوتھا باب: تہذیبی بحران کا اُردو ناول پر اثر

1۔ موضوع کے اعتبار سے۔ 2۔ ہیئت کے اعتبار سے۔ 3۔ زبان و بیان کے اعتبار سے۔

پانچوں باب: محاکمہ

کتابیات

....

مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں نے اس موضوع سے متعلق تمام اہم اور بنیادی معلومات حاصل کرنے کے لیے اُردو دُنیا کے معتبر ادیبوں اور دانشوروں سے رابطہ قائم کیا اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ موضوع کے ساتھ انصاف ہو۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں گورنمنٹ مڈل اسکول بشٹ میں مُدرس تھا۔ دن کو اسکول میں

ڈیوٹی دیتا اور رات کو پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے بیٹھ جاتا۔ علاوہ ازیں گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ماں اور بیوی کا ہاتھ بھی بٹاتا۔ جب میں نے اپنے موضوع کا پہلا باب لکھا اور اپنے نگران جناب پروفیسر ظہورالدّین صاحب کو تصحیح کے لیے پیش کیا تو اُنھوں نے میری تحریروں کی نوک پلک سنوارنے سے پہلے کہا تھا ''میں اپنی نگرانی میں ریسرچ اسکالر کو محنت کرواتا ہوں۔ تمھارا موضوع اہم اور مشکل ترین ہے اس لیے تمھیں سخت محنت کرنی پڑے گی۔ گھبرانا نہیں، میرے ہاں دوسروں کی طرح کاتا اور لے دوڑی والی بات نہیں ہے'' اُن دنوں پروفیسر ظہورالدّین صاحب نہ صرف شعبۂ اُردو کے صدر تھے بلکہ کنٹرولر بھی تھے۔ اُن کی مصروفیات اُن دنوں بہت زیادہ تھیں۔ صدر شعبہ ہونے کی حیثیت سے وہ ریاستی اور ملکی سطح کے ادبی سیمینار منعقد کراتے تھے۔ کئی ادبی مباحثے اور مذاکرے ہوا کرتے تھے۔ میں اپنا تحقیقی کام لے کر 130 کیلومیٹر سفر طے کرنے کے بعد جب ظہور صاحب کے پاس پہنچتا تو وہ گوناگوں مصروفیات کے باعث میرا کام چیک نہیں کر پاتے تھے اور جب اُنھیں میرا کام چیک کرنے کا موقع ملتا تو پھر تین گھنٹے تک مسلسل میرا کام چیک کرتے۔ زیادہ تر میں اپنا کام اتوار کو چیک کرواتا۔ وہ بڑی باریک بینی سے میرے ایک ایک لفظ کو پڑھتے اور لفظوں کی نزاکت ولطافت سے مجھے واقف کراتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میرے موضوع کے چوتھے باب ''تہذیبی بحران کا اُردو ناول پر اثر'' کا ذیلی عنوان ''تہذیبی بحران کا اُردو ناول کی ہیئت پر اثر'' ظہور صاحب نے مجھ سے چار بار لکھوایا تھا۔ کافی محنت اور ذہنی کوفتیں برداشت کرنے کے بعد بہ فضلِ اللہ تعالیٰ میں نے ساڑھے چار سال کے بعد اپنا تحقیقی مقالہ شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی میں جمع کرایا تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اُن دنوں جموں میں ریسرچ اسکالرس، بہار کے ایک شخص سے تھیسس کتابت کرواتے تھے۔ وہ شخص بے شمار غلطیاں کرنے کے ساتھ اُن سے زرِکثیر حاصل کرتا تھا۔ اس کے باوجود وقت پر اُنھیں کام کر کے بھی نہیں دیتا تھا۔ اس

لیے اکثر ریسرچ اسکالرس اُس کے قریب آ کر نہ صرف اپنا وقت اور روپیہ برباد کرتے تھے بلکہ رونے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔ میں نے اپنے مقالے کی خود کتابت کی، جس کی ضخامت کافی بڑھ گئی۔ مانتلائی میں رات کو بارہ بجے تک بیٹھتا اور گیس کی روشنی میں اپنے تھیس کی کتابت کرتا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ میں، میں نے کتابت مکمل کر لی تھی اور مئی 1998ء کو میں نے اپنا تحقیقی مقالہ یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔ میرا یہ مقالہ اُس وقت کے وائس چانسلر جناب پروفیسر آر۔ آر۔ شرما صاحب نے اُردو کے تین اہم ناقدین و محققین کو مطالعے کے لیے بھیجا تھا اور اس کے بارے میں اپنی آراء لکھ بھیجنے کو کہا تھا۔ وہ تین اہم نقاد اور دانشور تھے، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، جامعہ ملّیہ اسلامیہ نئی دہلی، جناب پروفیسر ظہیر احمد صدیقی علی گڑھ اور جناب صدیق الرحمٰن قدوائی۔ تقریباً دو ماہ کے اندر پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی صاحب اور ظہیر احمد صدیقی صاحب نے اپنی رپورٹیں لکھ کر بھیج دی تھیں لیکن جناب صدیق الرحمٰن قدوائی نے آٹھ ماہ کے بعد اپنی رپورٹ لکھ بھیجی تھی۔ وہ میرا تھیس اپنے گھر میں رکھ کر خود جرمنی چلے گئے تھے اور اِدھر میرے حواس اُڑ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے جب اُن کی رپورٹ پہنچی تو تقریباً نو ماہ کا طویل عرصہ بیت چکا تھا۔ قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی صاحب میرے ممتحن بن کر آئے تھے۔

....

1993ء سے جون 1997ء تک میں گورنمنٹ مڈل اسکول بشٹ میں مُدرس کی حیثیت سے کام کرتا رہا اور اُس کے بعد میرا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول سدھ مہادیو میں ہوا (جواب ہائر اسکنڈری اسکول کا درجہ حاصل کر چکا ہے) اور 2000ء تک میں اس اسکول میں اپنے تعلیمی فرائض انجام دیتا رہا۔ اسی اسکول میں رہتے ہوئے 1999ء میں مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ 1999ء میں ہی مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹی سے نوازا جس کا نام صبا کریم ہے۔ اپریل 2000ء میں جموں یونیورسٹی نے ایک Convocation کا اہتمام کیا جس میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے

والوں کو گورنر جناب گریش چندر سکسینہ کے ہاتھوں ڈگری سٹرفکیٹ دئے گئے۔ مجھے بھی لڑکوں میں سب سے پہلے گورنر صاحب کے ہاتھوں ڈگری ملی تھی۔

....

2000ء میں، میں نے قصبہ چھنی میں گورنمنٹ کوارٹر نمبر C-8 الاٹ کروایا۔ میں اس میں مع اہل وعیال رہائش پذیر ہوا اور تقریباً بارہ سال اس کوارٹر میں گزارے۔ مانتلائی سے بکروال طبقے کی ایک لڑکی روبینہ بانو جو اُس وقت پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی ہم نے اُسے اپنے بچّوں کی طرح تقریباً آٹھ سال اپنے پاس رکھا، اُسے اسکول میں داخل کروایا اور دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد اُس کے گھر والوں نے اُس کی شادی کردی، اُس بیٹی نے بھی ہماری بہت خدمت کی ہے۔ اللہ اُسے سُکھی رکھے!۔

2001ء میں میرا تبادلہ دوبارہ مڈل اسکول بشٹ میں ہوا اور یہاں نو ماہ ڈیوٹی دینے کے بعد مجھے بی ایڈ ٹریننگ کے لیے جموں بھیجا گیا۔ اس طرح مجھے ایک بار پھر طالب علم کی حیثیت سے کالج کی زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ 2001ء میں، میں نے اُردو میں قومی سطح کا تعلیمی امتحان (NET) پاس کیا تھا۔

جنوری 2002ء میں، میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں جموں میں پلاٹ خریدوں اور یہیں رہائش اختیار کروں۔ چنانچہ بہ فضل اللہ تعالیٰ میں نے ایک لاکھ چالیس ہزار روپے میں سُنجواں (فردوس آباد) میں دس مرلے کا پلاٹ خریدا۔ اگست 2002ء میں ہمارا بی ایڈ کالج کا ٹور راجستھان گیا۔ جے پور اور جودھ پور جیسے راجوں کے شہر دیکھ کر مجھے بہت خوشی وحیرت ہوئی تھی۔ یہ ہمارا دس دن کا ٹور تھا۔ اُس وقت ہمارے گورنمنٹ بی ایڈ کالج کی پرنسپل محترمہ شمیمہ اختر تھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہم پشکر اور اجمیر بھی گئے تھے۔ جودھ پور کے تاریخی قلعے اور جے پور میں راج درباروں کو دیکھ کر مجھے دُنیا کی ناپائیداری کا شدید احساس ہوا تھا 2003ء میں، میں نے بی ایڈ کا

امتحان پاس کیا۔

2003ء میں بی ایڈ کرنے کے بعد مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول سدھ مہادیو میں تعینات کیا گیا اور اسی سال اس اسکول کا درجہ بڑھا کر ہائر اسکنڈری کر دیا گیا۔ میں مئی 2005ء تک اس اسکول میں دسویں، گیارہویں اور بارہویں کی کلاسوں کو پڑھاتا رہا۔ اُس دور میں اُس اسکول کے ایک پرنسپل صاحب تھے، اُن کی آنکھیں لال رہتی تھیں۔ بڑے حیران کُن پرنسپل تھے۔ مجھے اُن کے ساتھ تقریباً دو سال تین ماہ تک کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک بار میں نے اُن کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پہلی جماعت سے آٹھویں جماعت تک مُفت سپلائی کتابیں چھنبی زونل ایجوکیشن آفیسر کے دفتر سے گاڑی میں لوڈ کروائیں اور ہائر اسکینڈری اسکول سدھ مہادیو میں پہنچائیں۔ میرا کُل خرچہ پانچ سوتیس روپے آیا۔ میں نے پرنسپل صاحب کے سامنے بل پیش کیا تو اُنھوں نے بل پر دستخط نہیں کیا اور فراڈی بل کہہ کر مجھے واپس کر دیا۔ میں تشویش میں پڑ گیا۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ آخر اس میں فراڈ کیا ہے؟ چودہ بوریاں کتابیں، پانڈی کا خرچہ، اپنا کرایہ، گاڑی پہ لوڈ کرنے اور اُتارنے اور پھر اسکول تک پہنچانے کا الگ خرچہ، میں نے تو کوئی بھی ناجائز روپیہ بل میں درج نہیں کیا ہے۔ آخر میرے پرنسپل صاحب کو اس بل میں کیا فراڈ نظر آ رہا ہے! میں نے دوبارہ اُن کے سامنے بل رکھتے ہوئے بڑی عاجزی سے کہا

''جناب میرا کُل خرچہ اتنا ہی ہوا ہے۔ پلیز بل پاس کیجیے''

وہ بولے

''وانی صاحب! یہ بل نہیں چلے گا اسے دوبارہ بنایئے''

میں نے پوچھا

''جناب کتنے روپے کا بل بناؤں''؟

اُنھوں نے آہستہ سے کہا

”تیرہ سو روپے کا بل بنائیے۔ آپ اپنا خرچہ نکال کر باقی رقم میرے حوالے کیجیے“ مجھے یہ سُن کر ایک دھچکا سا لگا اور میں نے مجبوراً اپنے ضمیر کا قتل کر دیا!

....

2005ء میں جب مجھے ماسٹر گریڈ ملا تو مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول بپ (زون چھنی) میں تعینات کیا گیا۔ جنوری 2006ء میں، میں نے جموں و کشمیر بینک شاخ چھنی سے جموں میں مکان تعمیر کرنے کی خاطر قرض لیا جو تقریباً تین لاکھ روپے کی رقم تھی۔ اس رقم کے علاوہ بھی کوئی ڈیڑھ لاکھ اور خرچنے کے بعد میرے مکان کا ڈھانچہ تیار ہو گیا۔

جولائی 2007ء کے آخری ہفتے میں مجھے ہائی اسکول بپ سے تبدیل کر کے گورنمنٹ ہائی اسکول دھناس (زون چھنی) میں تعینات کر دیا گیا۔ میں نے 9، اگست 2007ء کو دھناس ہائی اسکول میں جوائن کیا اور جنوری 2013ء تک اس اسکول میں تعلیمی فرائض انجام دیتا رہا۔

2011ء میں، میں ایک روز اپنے ہم پیشہ ساتھی اور دوست کرشن کمار ابرول کے ساتھ دھناس ہائی اسکول سے چار بجے کے بعد چھنی کی طرف آ رہا تھا کہ اسی دوران میری اہلیہ نے مجھے فون پہ یہ مایوس کن خبر سُنائی کہ میرے بیٹے رضا الرحمٰن کی دادی یعنی میری امّاں کو ظہر کی نماز پڑھتے ہوئے اٹیک ہو گیا ہے اور وہ جموں بترا اسپتال میں ایمرجنسی وارڈ میں ہیں۔ میں بہت مایوس ہوا۔ امّاں بڑے بھائی کے پاس جموں میں رہتی تھی۔ میں رات کو ہی اپنے بھائی محمد ایوب وانی کے ساتھ جموں کی طرف روانہ ہوا۔ ہم دونوں جب بترا اسپتال پہنچے تو امّاں بڑی نازک پوزیشن میں تھی۔ ایمرجنسی وارڈ میں وہ آکسیجن کے سہارے سانس لے رہی تھی۔ میں امّاں سے کوئی بھی بات نہیں کر پایا۔ میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے، میں رو پڑا۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں بالآخر امّاں شکروار کو دن کے پورے ایک بج کر بیس منٹ پر اس جہانِ

فانی سے رُخصت ہوگئی ! ماں کا بے لوث پیار اور ممتا بھری چھاؤں سے میں محروم ہوگیا! آج بھی ماں سے وابستہ کئی یادیں مجھے تڑپا رہی ہیں !ہائے لفظ ماں کہتے ہی دل کوسکون اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ ماں تو زندگی کی کڑکتی دُھوپ میں گھنے سایہ دار پیڑ کی مانند ہوتی ہے جو بغیر کسی لالچ وغرض کے اپنی اولاد کے لئے اپنے تمام ارمان اور دُکھ درد بھول جاتی ہے۔ وہ ساری زندگی اپنی اولاد کو سکھی دیکھنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ میں نے بہ فضل اللہ اپنی امّاں کے ہر حکم کی تعمیل کی ہے۔ اُن کی نیک دُعاؤں کا یہ نتیجہ ہے کہ میں نے کئی آگ کے دریا ہنستے ہنستے پار کیے۔ میں نے چھوٹی ہی عمر سے امّاں کو نہایت جفاکش، ہوشیار اور سب کے سکھ دُکھ میں شریک ہوتے دیکھا ہے۔ کئی گھریلو مصائب و مسائل، الجھنوں اور تھکا دینے والے کام کرنے کے باوجود ہشاش بشاش دیکھا ہے۔ اپنے ماضی پر جب میرا دھیان جاتا ہے تو امّاں کے ساتھ گزارا پل پل مجھے یاد آ جاتا ہے۔ وقت، حالات اور سفر حیات میں ہم کیا کیا پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ بس یادوں کا ایک سلسلہ ہمارے شعور، لاشعور اور تحت الشعور میں دفن رہتا ہے جو ہمیں یہ احساس کراتا رہتا ہے کہ ہماری روح تو زندہ رہے گی لیکن ہمارا وجود ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ والدین کی محبت خاص طور پر والدہ کے قدموں تلے جنت ہے۔ اللہ میرے والدین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے آمین !

2011ء کا سال میری زندگی کا ایک ایسا سال ہے جس میں مجھے نہ صرف اپنی ماں جیسی عظیم ہستی کی ممتا اور نیک دُعاؤں سے محروم ہونا پڑا بلکہ مجھے منافقوں کی منافقت، بے غیرتوں کی بے غیرتی اور نفسِ امّارہ کے پجاریوں کے باعث اپنے حق سے بھی محروم ہونا پڑا۔ اُردو کے دُکان داروں نے مجھے میرے حق سے محروم رکھنے کی ہر ممکن کوششیں کیں۔ میرے اللہ کا رحم و کرم اگر میرے شامل حال نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو گیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں اور رحمتوں کے ساتھ میں اس دُنیا میں ابھی تک سانس لے رہا ہوں۔ میرا تلخ تجربہ یہ کہتا ہے کہ ہندوستان

کی زیادہ تر یونیورسٹیوں میں کسی پوسٹ پہ سلیکشن سے پہلے ہی سلیکشن ہو چکی ہوتی ہے۔اُس کے بعد انٹرویو کا ڈراما شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اردو کے بیشتر اصحاب نے زبان وادب کو ذریعۂ معاش بنا لیا ہے۔ گویا اردو زبان وادب اُن کے لئے کاروبار کی حیثیت رکھتا ہے۔ایسے زبان وادب کے شیدائی اس فکر میں رہتے ہیں کہ ہائر اسکنڈری، کالج اور یونیورسٹی کی پوسٹ پہ کس طرح اپنے من چاہے نالائق اُمیدوار کی سلیکشن کروائی جائے۔اُن کی پیشہ ورانہ ذہنیت، قابلیت اور معیار پر دھیان نہیں دیتی بلکہ اُن کے نزدیک سازش، زور زبردستی اور اپنے نفع ونقصان کی اہمیت ہوتی ہے۔ لکھنے پڑھنے یا زبان وادب کی خدمت کرنے کے بجائے وہ اپنا وقت سازشوں، چاپلوسیوں اور ادھر اُدھر کی جھوٹی تعریفوں میں بتا دیتے ہیں اور پھر المیہ یہ کہ وہ اپنے کاروبار میں کامیاب بھی ہوتے ہیں! اردو دُنیا میں ابھی کچھ لوگ ایسے ضرور موجود ہیں جنھیں اردو شعر وادب سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔اُن کے لئے زبان وادب ذریعۂ معاش نہیں ہے بلکہ اُن کا بنیادی مقصد اپنے صالح اور بصیرت افروز جذبات واحساسات، تجربات ومشاہدات اور افکار ونظریات کے اظہار کے علاوہ سماج میں وقوع پذیر حالات وواقعات کی فنکارانہ عکاسی کرنا ہوتا ہے۔اُنھیں ستائش کی تمنّا ہوتی ہے نہ صلے کی پرواہ۔ زبان وادب کا خمیر اُن کی رگ رگ میں بسا ہوتا ہے۔اُن کے اوصافِ حمیدہ اُنھیں اُن کے تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی ذوق وشوق میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ چناں چہ وہی لوگ زبان وادب کے سچّے شیدائی اور خدمت گار ہوتے ہیں۔ وہ روایت کے پاسدار تو ہوتے ہیں لیکن روایت پرست نہیں ہوتے۔اُن کے دل ودماغ میں ہر وقت کچھ نیا کر دکھانے کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔اُن کا زبان وادب سے جنون کی حد تک لگاؤ جب اُن کی عرق ریزی اور بے لوث خدمت میں ڈھل جاتا ہے تو تب پروفیسر قدوس جاوید جیسے شرافت وادبیت کے شیدائی اپنے ادبی شہکار لے کر ادبی دُنیا میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ

یونیورسٹیوں میں ایسے موجود ہیں جو ایماندار ہیں اور حقدار اُمیدواروں کو اُن کا حق دلانا چاہتے ہیں۔ ورنہ اکثر دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ سلیکشن سے پہلے ہی سلیکشن ہو چکی ہوتی ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید صاحب میرے مزاج کے آدمی ہیں۔ میں اُن کی ذہانت اور علمی وادبی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ وہ سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنے کا مادہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے یونیورسٹیوں میں اُردو کی پوسٹوں پہ سلیکشن کے بارے میں اپنے ایک مضمون ''اُردو دُنیا کا المیہ۔ جرِ ثقیل کے قتیل'' میں اُردو کے مستحق اُمیدواروں کو اُردو شعبوں سے دُور رکھے جانے کی وجوہات کا ذکر بڑے عالمانہ اور منصفانہ انداز میں کیا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید اردو تحقیق وتنقید اور فکریات ونظریات کے لحاظ سے ایک معتبر ومنفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ مابعد جدید ادبی تھیوری کا شعری ونثری اصناف پہ اطلاق، اسکے مزاج ومنہاج کی افہام وتفہیم میں اُنھوں نے نہایت عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر اور صدرِ شعبہ کے فرائض بحسن وخوبی انجام دینے کے بعد اُنھیں سبکدوش ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ گذشتہ آٹھ برس پہلے اُنھیں سینٹرل یونیورسٹی کشمیر کے شعبۂ اردو کا صدر ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ اس طرح اُنھیں ایک بار پھر ایک بڑے علمی وادبی ادارے میں تقریباً ڈیڑھ برس اردو کی خدمت کا موقع ملا۔ پروفیسر قدوس جاوید کی ادبی نگارشات کا مطالعہ کرنے کے دوران اس بات کا پتا چلتا ہے کہ موصوف کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔ اُن کی عقابی نگاہیں ادب کے سمندر پر محوِ گردش رہتی ہیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی، ہندی، فارسی اور کسی حد تک عربی اصطلاحات سے بھی کماحقہ واقف ہیں۔ اُن کے بصیرت افروز مضامین اخبارات ورسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ تحقیق وتنقید میں دلائل وشواہد اور حوالے وحواشی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے بلکہ ان کے بغیر تو تحقیق وتنقید غیر معتبر اور مشتبہ ٹھہرتی ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کے تحقیقی وتنقیدی مضامین میں دلائل وشواہد اور حوالے وحواشی

کا پاس ولحاظ تو نظر آتا ہی ہے اس کے علاوہ اُن کا منطقی اسلوب بیان دلگرفتہ کہا جا سکتا ہے۔حق بات تو یہ ہے کہ لکھتے لکھتے اور پڑھتے پڑھتے اُن کا ذہن کافی مشاق اور دل حساس ہو گیا ہے۔موضوعاتی تنوع اور نئی اصطلاحات وتراکیب کے استعمال نے اُن کی تحریروں کو اور زیادہ معلوماتی اور قابل مطالعہ بنایا ہے۔اُردو کی نابغۂ روزگار ہستیوں کی طرح پرفیسر قدوس جاوید کو بھی اس بات کا شدید احساس ہے کہ اُردو کی بقا اس کے فروغ اور عمدہ خدمات کے لیے ذہین، محنتی، قابل ترین، ایماندار، شریف النفس اور اُردو زبان وادب سے جنون کی حد تک لگاؤ رکھنے والے اسکالروں کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر سلیکٹ کیا جانا نہایت ضروری ہے لیکن پروفیسر موصوف کو اس سلسلے میں عملی صورتحال بہت مایوس کُن اور روح فرسا نظر آرہی ہے۔ اس تلخ حقیقت کا اظہار اُنھوں نے بڑی بے باکی، نیک نیتی اور اصلاحی جذبے کے ساتھ اپنے ایک مضمون بعنوان ''اُردو دنیا کا المیہ۔جرِثقیل کے قتیل'' میں کیا ہے جو جموں وکشمیر کے مشہور اور معیاری روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' مورخہ 12 مئی 2016ء بروز جمعرات، ص نمبر 6 پہ شائع ہوا ہے۔فاضل مصنف نے اس مضمون میں ذاتی تجربے اور مشاہدے کی شفاف عینک سے بالخصوص یونیورسیٹیوں کے اُردو شعبوں میں ذہین، باصلاحیت، محنتی اور دیانتدار اُمیدواروں کے بدلے نااہل اور ناآشنائے علم وادب اُمیدواروں کی سلیکشن کا جو ڈراما دیکھا ہے اُس کا موثر اظہار تحریری صورت میں اپنے مضمون میں کیا ہے۔جو ذہن ودل کو جھنجھوڑتا ہے اور ہر خاص وعام کے لیے ایک المیہ اور لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرا یہ ماننا ہے کہ زندہ ضمیر زندہ وتابندہ تحریریں لکھواتا ہے جبکہ مردہ ضمیر آدمی کو موہ مایہ کے مکڑ جال میں پھنسائے رکھتا ہے۔پروفیسر قدوس جاوید کے مذکورہ مضمون کو پڑھنے کے بعد اس پُرمسرت بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایک روشن ضمیر، حق گو حق پرست ادبی شخصیت ہیں کہ جنھوں نے یونیورسٹیوں کے اُردو شعبوں میں اساتذہ کی تقرری

کے معاملے میں باصلاحیت امیدواروں کے ساتھ قابل مذمت برتاؤ کو تعلیمی دہشت گردی (Educatonal terrorisim) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو اُن کا مضمون بالکل ایک نئے موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ جو سو فیصدی صداقت پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گذشتہ پانچ سات برسوں میں بعض ایسے اساتذہ جو خوشامد، چاپلوسی اور تگڑم بازی میں ماہر ہیں پروفیسر بننے میں کامیاب ہوئے جن کی وجہ سے کئی باصلاحیت اور حقدار امیدواروں کا حق بڑی بے رحمی سے چھینا گیا ہے۔ بقول پروفیسر قدوس جاوید:

> ''گذشتہ پانچ سات برسوں میں بعض ایسے اساتذ اردو شعبوں میں ''پروفیسر'' بننے میں کامیاب ہوگئے ہیں جن کی زبان دانی، ادبی ذوق وشوق، مبلغ علم، حتیٰ کہ عام اخلاقیات تک مشتبہ ہے۔ یہ حضرات اپنی علمیت، ادبی خدمات یا دیگر اکیڈمک سرگرمیوں کے بجائے جوڑ جگاڑ کی بے پناہ خوبیوں کی بنا پر پروفیسر اور پھر صدرِ شعبہ کے عہدے پر فائز ہوئے ہیں، مبینہ طور پر ایسے چند پروفیسران اور صدور کا ایک ''محاذ'' ہے۔ کسی بھی یونیورسٹی یا کالج میں کوئی بھی انٹرویو ہو اس متحدہ محاذ کے پروفیسر حضرات ہی ایکسپرٹ ہوتے ہیں اور انٹرویو میں متفقہ طور پر اُنھیں اُمیدواروں کا انتخاب ہوتا ہے جن کا انتخاب وہ کرنا چاہتے ہیں۔ معاملہ اُردو کا ہوتا ہے، اس لیے سلیکشن کمیٹی کے غیر اُردو داں ممبران عموماً خاموش ہی رہتے ہیں اور سلیکشن کا پورا اختیار صدرِ شعبہ اور ایکسپرٹ کو سونپ دیتے ہیں جو پہلے سے ہی آپس میں طے کئے ہوتے ہیں کہ کس امیدوار کو سلیکٹ کرنا ہے اور کسے ریجکٹ، آسامیاں ایک سے زیادہ ہوں تو ایسے پروفیسر اور صدور سلیکشن میں اکثر ایک تیرا ایک میرا کی بنیاد پر آپس میں بندر

بانٹ بھی کر لیتے ہیں۔ انٹرویو کی حیثیت محض ایک رسمی خانہ پُری کی ہو کر رہ گئی ہے''

مندرجہ بالا اقتباس کے تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر قدوس جاوید نے ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں اساتذہ کی تقرری کے سلسلے میں پس پردہ ہورہی جس دھاندلی، بے ایمانی اور بندر بانٹ کا ذکر کیا ہے وہ تشویشناک بھی ہے اور حیران کُن بھی۔ ویسے سبھی یونیورسٹیوں میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں کے اُردو شعبوں میں اب بھی قابل، ایماندار اور حق پرست پروفیسر موجود ہیں لیکن اُن کی تعداد قلیل ہے۔ دراصل یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ یونیورسٹیوں کے اُردو شعبوں میں اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پروفیسر کی پوسٹ کی تشہیر(Advertisement) سے پہلے صدرِ شعبہ یہ طے کرتا ہے کہ اس پوسٹ پہ کس کی سلیکشن کروانی ہے اور کیسے کروانی ہے۔ اُس کے بعد پوسٹ کی تشہیر کی جاتی ہے۔ ایکسپرٹس کی لسٹ چونکہ صدرِ شعبہ کے ہاتھوں وائس چانسلر صاحب کے آفس میں جاتی ہے اور اس طرح صدرِ شعبہ پہلے ہی ایکسپرٹس سے رابطہ قائم کر لیتا ہے اور انٹرویو کی رسمی خانہ پری کے تحت وہ بآسانی اپنے من چاہے امیدوار کی سلیکشن کروانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے مضمون میں ایک جگہ قابل نوجوانوں کو اُردو شعبوں سے دُور رکھے جانے کی دوسری وجہ ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''باصلاحیت نوجوانوں کو ارادتاً اُردو شعبوں سے دُور رکھا جارہا ہے کیونکہ ایسے قابل نوجوان اگر شعبے میں آگئے تو تدریس و تحقیق کا معیار تو یقیناً بلند ہوگا لیکن نا منہاد، خودغرض اور مفاد پرست اُردو کے سینئر پروفیسران اور اردو شعبوں کے صدور کے لسانی اور ادبی سوجھ بوجھ کے معیار کا بھانڈا پھوٹ جائے گا''

پروفیسر قدوس جاوید کی تحقیق کے مطابق یہ تو واضح ہوگیا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے اُردو شعبوں میں انٹرویو سے پہلے ہی صدرِ شعبہ اور ایکسپرٹس (Experts) آپس میں یہ طے کرلیتے ہیں کہ کس امیدوار کو سلیکٹ اور کس کو ریجیکٹ کرنا ہے لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ اس ناانصافی اور حق تلفی پہ قابو کیسے پایا جائے؟ اس کے لیے میں یہاں چند سجھاؤ دینا چاہتا ہوں۔ میں وثوق سے یہ کہتا ہوں کہ ان سجھاؤ یا مشوروں کو اگر یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (UGC) اور تمام ریاستوں کے حکام باضابطہ طور پر منظوری دیں تو راتوں کو اپنا لہو جلانے والے ذہین، شریف النفس، دیانت دار اور محنتی اُمیدواروں کو ضرور اُن کا حق مل کے رہے گا۔

پہلا سجھاؤ یہ کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی تقرری کا پورا اختیار ہر ریاست کے گورنر صاحب کو دیا جائے۔ ایکسپرٹس کی لسٹ وہ خود تیار کروائیں۔ ایکسپرٹس کہاں سے بلائے گئے ہیں اور اُنھیں کہاں ٹھہرایا گیا ہے اس کا علم صرف گورنر صاحب کو ہو۔ انٹرویو کی کاروائی مقررہ تاریخ پر وائس چانسلر صاحب کے خوش نما اور روح پرور ہال میں ہو۔ اُن کے دلکش علم وادب کے ٹیبل پہ سامنے ترتیب وار قرآن مجید، انجیل مقدس، شریمد بھگوت گیتا اور گروگرنتھ صاحب یہ تمام مقدس کتابیں رکھی جائیں۔ انٹرویو کی کاروائی شروع کروانے سے پہلے وائس چانسلر صاحب انٹرویو لینے والے تمام ممبران سے اپنے اپنے دین دھرم کے مطابق حلف برداری کی مقدس رسم ادا کروائیں اور خصوصی طور پر اُنھیں یہ ہدائت دیں کہ وہ ایشور اللہ کو حاضر وناظر رکھ کر عدل وانصاف برتیں۔

دُوسرا سجھاؤ یہ کہ یونیورسٹی کے کسی بھی شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر یا پروفیسر کی پوسٹ کے لیے آئی۔اے۔ایس کے ضابطے کو نافذ کیا جائے یعنی ایک ایسا مسابقتی امتحان (Secreening Test) رکھا جائے جو آئی۔اے۔ایس کے معیار کا ہو۔

تیسرا اور آخری سجھاؤ یہ کہ یونیورسٹیوں کے تمام طلبہ چاہے وہ ایم۔اے، ایم۔ایس۔سی، ایم۔کام یا ایم۔فل، پی۔ایچ۔ڈی کررہے ہوں یا کرچکے ہوں

مندرجہ بالا مطالبات کی منظوری کے لیے صدائے احتجاج بلند کریں کیونکہ مشہور ضرب المثل ہے کہ "بن روئے ماں بچے کو دودھ نہیں دیتی"

پڑھے لکھے بے عمل سماج کا تقاضہ یہ ہے کہ مصلحتاً جھوٹ بولا جائے۔ اس پہ مستزاد یہ کہ عصری خباثت آمیز معاشرے کی منافقت ایماندار، شریف النفس، محنتی اور ذہین لوگوں کو چہرے بدل بدل کر نوچ رہی ہے۔ ایک بہت بڑے دُکھ کی بات یہ ہے کہ ظلم کو مقدر سمجھا جاتا ہے۔

میرے خیال میں کالجوں کے اسسٹنٹ پروفیسروں اور پروفیسروں کو یونیورسٹی کا اسسٹنٹ پروفیسر یا پروفیسر بننے کا شوق دل میں نہیں پالنا چاہیے کیونکہ یونیورسٹی کے پروفیسر اور کالج کے پروفیسر میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا ہے۔

کاش! پروفیسر قدوس جاوید کے مبارک ہاتھوں مذکورہ مضمون بہت پہلے لکھا گیا ہوتا تو کچھ اور بات ہوتی لیکن اس کے باوجود آفریں اور صد ہا آفریں اُنھیں کہ اُنھوں نے "اُردو دنیا کا المیہ۔ جرِ ثقیل کے قتیل" جیسا معرکتہ الآرا مضمون لکھ کر درجنوں قابل ترین، محنتی، ایماندار اور علم وادب کے متوالوں کی حق تلفی اور ظلم وزیادتی کے خلاف ایک طرح کا بگل بجادیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہوں کہ پروفیسر قدوس جاوید کی طرح میرا رشتہ بھی کاغذ، قلم اور کتاب کے ساتھ زندگی کے آخری لمحے تک برقرار ہے۔ اگر چہ کہ رفعت شروش کے یہ اشعار میرے علمی وادبی ذوق وشوق اور حق تلفی پہ صادق آتے ہیں۔

ہزار بار حادثات میرے ہم سفر بنے
مگر میں راہِ شوق میں یونہی رواں دواں رہا
ہزار بار دامن حیات خارزار میں الجھ گیا
مگر میں گامزن رہا بہار کی تلاش میں

....

جنوری 2013ء میں میرا تبادلہ دیولتا نام کی ایک انتہائی قابل، رحم دل اور اعلیٰ

تعلیم یافتہ لوگوں کی قدر دان خاتون اور اُس وقت کی ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن جموں نے گورنمنٹ ہائی اسکول دھناس (زون چھنی، ضلع اُدھم پور) سے گورنمنٹ ہائی اسکول چک لارگن بجالتہ (زون گاندھی نگر) جموں کر دیا۔ یہ دن بھی میرے لیے ایک بڑی خوشی کا دن تھا۔ میں چونکہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ نجواں فردوس آباد میں اپنے مکان میں رہائش پذیر تھا۔ اس لیے بجالتہ میرے گھر سے کوئی زیادہ دُور نہیں تھا۔ قصبہ بجالتہ اور خاص کر ہائی اسکول چک لارگن بجالتہ سے جُڑی کئی کھٹی میٹھی یادیں میرا دامنِ دل تھامے ہوئی ہیں۔ میرے دوست محمد سلیم ملک میرے جوائن کرنے کے چھ ماہ بعد ہائی اسکول بجالتہ سے بحثیت ہیڈ ماسٹر سُبکدوش ہوگئے تھے۔ میرے عزیز ہم پیشہ ساتھیوں میں وجے شرما، رویندر، دویندر اور روہت شرما کے علاوہ محمد جمیل اور جناب محمد پرویز ہیڈ ماسٹر آج بھی میری نظروں کے سامنے ہیں۔ مجھے یاد ہے اپریل 2015ء میں ریڈیو کشمیر جموں نے ہائی اسکول چک لارگن بجالتہ میں ایک ڈوگری مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ بجالتہ کے ڈوگری کلب کے ممبران نے مجھے بھی اس مشاعرے کا حصہ بننے پر مجبور کیا تھا اور باضابطہ طور پر اپنی ڈوگری نظم یا غزل کے ساتھ آنے کی دعوت دی تھی۔ میں نے پہلی فرصت میں انکار کر دیا لیکن ڈوگری کے شیدائیوں نے میری کوئی بھی بات نہیں مانی۔ میں نے اسکول سے گھر آ کر اپنی ایک مخصوص دُھن میں اپنے ہی دل کو بہلانے کے لیے ڈوگری میں ''میریاں گلاّں'' نام کی ایک نظم تیار کر دی۔ میری اہلیہ ٹھیٹھ ڈوگری بولتی ہے۔ میں نے جب اُسے اپنی نظم سُنائی تو وہ پہلے مُسکرائی اور پھر پوچھنے لگی ''کیا آپ نے خود لکھی ہے؟'' میں نے کہا ''ہاں میں نے خود لکھی ہے'' اُسے میری نظم پسند آ گئی تھی۔ دوسرے دن جب میں نے مشاعرے میں یہ نظم پڑھی تو تمام سامعین نے اسے بہت پسند کیا، خاص کر ریڈیو کشمیر جموں کے اُس وقت کے اسٹیشن ڈائریکٹر سمبیال صاحب بہت خوش ہوئے۔ دراصل اس نظم میں رواداری، بھائی چارے اور آپسی میل ملاپ کی باتیں شامل تھیں۔ مجھے ریڈیو کشمیر جموں کی جانب سے

اس ڈوگری نظم پر 4000 روپے معاوضہ ملا تھا۔ بجالتہ ہائی اسکول میں، میں نے 15 اگست کے دن اپنا لکھا ایک ڈراما بچّوں سے اسٹیج کروایا تھا جسے وہاں کی عوام نے بہت پسند کیا تھا۔

2014ء میں اُتر پردیش اُردو اکادمی نے میری تحقیقی وتنقیدی مضامین پہ مشتمل کتاب ''اعتبار و معیار'' کو انعام کا مستحق قرار دیا اور مجھے اس کتاب پہ 5000 روپے کا انعام موصول ہوا۔ اسی سال مالیگاؤں (مہاراشٹر) میں مجھے یک روزہ قومی سیمینار میں جانے کا موقع ملا تھا جہاں مجھے ''وقارِ ادب'' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس سیمینار میں، میں نے ''اُردو افسانچے میں انسانی نفسیات اور معاشرے کی عکّاسی'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا تھا۔ اُردو افسانچے پہ یہ ایک اہم سیمینار تھا جس میں میری ملاقات پہلی بار اُردو کے معروف افسانچہ نگار جناب رونق جمال سے ہوئی تھی۔ اُن کے علاوہ احمد عثمانی (مدیر ماہنامہ ''بیباک'') عظیم راہی، ہارون اختر اور ایم مبین جیسے افسانہ نگاروں سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

ہائی اسکول چک لارگن بجالتہ، زون گاندھی نگر (جموں) میں ڈیوٹی کے دوران ایک روز مجھے گورنر آفس جموں سے فون آیا کہ مجھے آنے والے کل گورنر صاحب کے آفس میں حاضر ہونا ہوگا۔ میں نے چونکہ کچھ روز قبل گورنر صاحب کے نام ایک دراخوست لکھی تھی کہ میں اُن کے ہاتھوں اپنی تازہ مطبوعہ کتاب ''اُردو ادب میں تانیثیت'' (Feminism in urdu Literature) کی رسم رونمائی چاہتا ہوں۔ اس لیے میری درخواست منظور کر لی گئی تھی۔ دوسرے دن میں پورے گیارہ بجے دن کو راج بھون پہنچ گیا۔ این این وہرا صاحب اُن دنوں ریاست جموں وکشمیر کے گورنر تھے۔ نہایت شریف، جہاں دیدہ، کمال کے منتظم اعلیٰ اور ادب نواز بھی۔ مجھے خدام نے الگ ایک کمرے میں بٹھایا۔ فوراً میرے لیے چائے بسکٹ اور مٹھائی لائی گئی۔ چائے پینے کے بعد مجھے این این وہرا صاحب نے اپنے پاس بلایا۔ میں اُن کی

خدمت میں بڑے ادب واحترام کے ساتھ دروازے کے اندر داخل ہوا تو وہ اپنی شاہانہ کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھ سے بڑے پُر تپاک انداز میں ہاتھ ملایا پھر دوسری کرسی پہ میرے رُبرو بیٹھ گئے۔ میں نے اپنی کتاب اُنھیں پیش کی۔ اُنھوں نے فوراً کیمرہ مین کو بلایا۔فوٹو کھنچوایا اور پھر کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہنے لگے

''آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے''

میں نے عاجزی کے ساتھ کہا

''جناب کوشش کرتا ہوں کہ کوئی اچھا کام کر جاؤں''

پھر اُنھوں نے نوابی دور کے لکھنو میں اُردو کلچر کے بارے میں بڑی معلوماتی باتیں بتائیں۔ اُنھیں جب یہ معلوم ہوا کہ میں اب تک ایک اسکول ٹیچر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں تو مایوس ہوئے۔ پھر مجھے یہ مشورہ دیا کہنے لگے

''جب بھی کہیں کسی یونیورسٹی میں اُردو پوسٹ کی تشہیر ہو تو آپ فارم بھر دیجیے''

میری یادوں کے البم میں یہ دن بھی محفوظ ہو گیا ہے۔

....

2014ء میں مجھے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کی جانب سے ایک دفتری دعوت نامہ موصول ہوا جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے 10 اگست 2014ء کو جموں میں راجوری یونیورسٹی کے گیسٹ ہاوس میں دن کو 10 بجے اُردو اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ کے لیے انٹرویو میں شامل ہونا ہے۔ انٹرویو سے تین دن قبل میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والے اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ کشمیر چلا گیا۔ اُردو کے ایک اچھے فکشن نگار جناب وحشی سعید نے اُن اُدبا اور شعراء کو کشمیر کی سیر وتفریح اور اپنے شہنشاہ ہوٹل میں ادبی مجلس کی رونق بننے کی خاطر مدعو کیا تھا۔ ان بیرون ریاست اُدبا اور شعرا نے ایک ہفتہ کشمیر میں ٹھہرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں نے جب جناب وحشی سعید اور جناب نور شاہ جیسے بُزرگ ادیبوں کے سامنے اپنے انٹرویو

کی بات رکھی اور اُن سے مشورہ چاہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تو اُنھوں نے مجھے انٹرویو دینے پر آمادہ کیا، میں کسی بھی صورت میں انٹرویو دینے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے مجبور ہو کر ہوائی جہاز کا ٹکٹ بنوایا اور دوسرے دن نہ چاہتے ہوئے سرینگر سے جموں بذریعہ ہوائی جہاز انٹرویو دینے چلا آیا۔ یہ میرا پہلا ہوائی سفر تھا۔ بچپن سے اکثر زمین سے اوپر اور آسمان سے نیچے یعنی خلا میں ہوائی جہازوں کو بڑی اونچی آواز میں اڑتے دیکھتا آیا تھا لیکن جہاز پہ سوار ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دوسرے دن انٹرویو دینے چلا گیا۔ اس انٹرویو میں کُل آٹھ اُمیدوار شامل ہوئے تھے۔ میرا نمبر آٹھواں تھا۔ 45 منٹ تک میرا انٹرویو ہوا تھا۔ سوالات پہ سوالات، میری کتابوں اور رسائل کی نمائش کے بعد جب مجھ سے آخر پہ یہ پوچھا گیا کہ

> ''آپ اب تک اپنے حق سے کیوں محروم رہے؟ کیا آپ کے خلاف کوئی مشن تو نہیں ہے؟''

میں نے انٹرویو لینے والے حضرات کو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ

> ''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میرے خلاف کوئی مشن ہے یا نہیں لیکن گھر میں میری کمسن بیٹی کبھی کبھی مجھ سے یہ سوال ضرور پوچھتی ہے کہ پاپا! کیا جنت میں بھی شعبۂ اُردو قائم کیا گیا ہوگا؟ اس دُنیا میں تو آپ کو آپ کا حق نہیں ملا، کیا آخرت میں ملنے کی کوئی اُمید ہے؟ تو میں اُس کے سوال کا جواب نہیں دے پاتا ہوں، سوائے اس کے کہ میری آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہنے لگتے ہیں!''

میں اس انٹرویو میں سلیکٹ ہو گیا تھا۔ ممتحین (Experts) نے مجھے انصاف دلا دیا تھا لیکن اُس وقت کے وائس چانسلر نے مجھے سلیکشن آڈر نہیں دیا تھا۔ آڈر کا انتظار کرتے کرتے نو مہینے بیت گئے اور قابل حیرت بات یہ کہ اُس پوسٹ کی ایک بار پھر تشہیر کی گئی جس پہ میں سلیکٹ ہو چکا تھا۔ اُس کے فوراً بعد میں ہائی کورٹ

چلا گیا اور اُس پہ روک لگوادی۔ تقریباً دو سال تک میں ہائی کورٹ جموں میں اپنا حق حاصل کرنے کے لیے کیس لڑتا رہا۔ بالآخر میں نے بہ فضل اللہ دسمبر 2016ء کے پہلے ہفتے میں کیس جیت لیا۔ جموں کے ایک سینئر وکیل جناب شیخ شکیل احمد نے میری وکالت کی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب میں گورنمنٹ ہائی اسکول کشن پور منوال میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔

2015ء میں، میں نے مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی حیدر آباد میں اردو کی اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ کے لیے انٹرویو دیا تھا۔ میں جموں ایئر پورٹ پہ جہاز میں سوار ہوا تو میری فلائٹ سرینگر سے دہلی چلی گئی۔ رات کو اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے نزدیک ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور دوسرے دن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری فلائٹ کسی وجہ سے کینسل ہوگئی ہے تو اُس وقت میں سخت ذہنی اور نفسیاتی خلفشار میں مبتلا ہوگیا تھا۔ تیسرے دن انٹرویو تھا۔ میں نے فوراً جموں اپنے ٹریول ایجنٹ کرن کو فون کیا تو اُس نے فوری طور پر مجھے دوسری ایئر ٹکٹ بنا کر میل کر دی اس طرح میں نے راحت کی سانس لی تھی اور دوسرے دن حیدر آباد کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔ حیدر آباد میں میرے دو چاہنے والے اردو کے معروف اور ذہین پروفیسر رہتے ہیں اُن میں ایک کا نام پروفیسر مجید بیدار ہے اور دوسرے کا نام پروفیسر بیگ احساس ہے (بیگ احساس اب دُنیا میں نہیں ہیں)۔ جموں سے روانہ ہونے سے پہلے ہی میں نے پروفیسر مجید بیدار صاحب کو اپنے انٹرویو دینے اور حیدر آباد آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ مجھے حیدر آباد کے ایئر پورٹ پر اپنے دوست کے ساتھ گاڑی میں لینے آئے تھے۔ بڑی مشکل سے مسافروں کے ہجوم میں، میں نے پروفیسر مجید بیدار صاحب کو پہچان لیا تھا۔ رات کا وقت تھا اور میں پہلی بار حیدر آباد جیسے گنجان اور وسیع و عریض شہر میں داخل ہوا تھا۔ مجید بیدار صاحب کے دوست کو رات کے وقت گاڑی چلاتے پتہ نہیں چلا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے، وہ تقریباً بیس کیلومیٹر دُور کسی اور ہی راستے پر چلا

گیا۔ بعد میں یہ معلوم ہوا کہ ہم ایک غلط راستے پر آ گئے ہیں۔ بہر حال اُنھوں نے مجھے رات کے تقریباً بارہ بجے ایک ہوٹل میں چھوڑ دیا تھا اور مجھے اپنی نیک دُعاؤں اور مشوروں کے ساتھ رخصت کرتے ہوئے انٹرویو میں کامیاب ہونے کا یقین دلایا تھا۔ دوسرے دن انٹرویو ہوا۔ بس وہی اپنی کتابوں اور رسالوں کا بوجھ لیے لیے پھرتا رہا۔ میرا یہ انٹرویو بھی بہت اچھا ہوا تھا لیکن اس سب کے باوجود میری یہاں بھی سلیکشن نہیں کی گئی تھی کیونکہ سلیکشن سے پہلے ہی سلیکشن ہو چکی تھی۔ اللہ نے شاید میری فریاد سُن لی تھی کہ اس سلیکشن کو بعد میں مسترد کر دیا گیا۔ میرے دوست جناب پروفیسر مجید بیدار نے مجھے اپنے ساتھ حیدر آباد کی ایک شادی میں لیا تھا۔ بہت اچھی ضیافت کھانے کا موقع تھا۔

دو سال دو ماہ ہائی اسکول چک لارگن بجالتہ میں رہنے کے بعد میں جولائی 2015ء میں ہائی اسکول کشن پور منوال میں آ گیا تھا۔ کشن پور ہائی اسکول میں ٹرین میں آتا جاتا تھا۔ میں نے بہت سے مضامین اور کہانیاں ٹرین میں سفر کے دوران لکھی ہیں۔ ریلوے اسٹیشن جموں اور منوال کا پورا نقشہ میری یادداشت میں محفوظ ہے۔ مختلف محکمہ جات کے ملازمین کی اپنی ڈیوٹی پہ جانے کی دوڑ بھاگ آج بھی میری نظروں کے سامنے آ رہی ہے جو کئی کہانیوں کو جنم دے سکتی ہے۔ جموں سے کشن پور جانے والے میرے ساتھیوں میں ماسٹر نریندر پال شرما اور ماسٹر ہری سنگھ کے ساتھ بھی میری یادوں کا ایک سلسلہ جُڑا ہوا ہے۔ کشن پور ہائی اسکول کا تمام اسٹاف بہت اچھا تھا خاص طور پر میں ماسٹر سوم راج کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر نہیں بھول پاؤں گا جن کی انسان دوستی، شرافت، دیانتداری اور ہنس مکھ چہرے کا میں بہت قائل ہوں۔ اُنھوں نے کئی بار میری حق تلفیوں پر اظہارِ تاسف کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اللہ تعالیٰ سے پُر اُمید اور خوش رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پہ بہت بڑا احسان رہا ہے کہ میں نے اسکول ایجوکیشن محکمے میں 29 سال 9 ماہ اور 4 دن بحیثیت معلّم کام کیا اور جہاں کہیں بھی رہا

مجھے لوگوں نے اور اپنے اسٹاف کے ممبران نے عزت واحترام کی نظر سے دیکھا۔

2015ء ہی میں، میں نے گورمنٹ ہائی اسکول کشن پور میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے جموں سجنواں میں اپنے مکان کی دوسری منزل کی تعمیر کے لئے آٹھ لاکھ روپے جی پی فنڈ سے اپنے بینک اکاونٹ میں ڈلوائے اور دوسری منزل کا کام شروع کروادیا۔ میرے ایک جانے پہچانے دوست رندھیر چند انتال نے مکان کا نقشہ تیار کیا۔ دو بیڈ روم، ملحقہ غسلخانے، ایک بڑی لابی، رسوئی، باہر چھوٹی سی بالکونی کو مکمل کرتے تقریباً ساڑھے تین سال لگ گئے۔ اس دوسری منزل کی تعمیر کا ٹھیکہ میں نے رویندر نام کے ایک بہاری مستری کو دیا۔ اُس نے مناسب ریٹ پر میرا کام کسی حد تک اچھا کیا۔ بجلی، پانی، کھڑکیاں دروازے، رنگ روغن اور دوسری بہت ساری چیزیں لگاتے کرتے تقریباً بیس لاکھ روپیہ صَرف ہوا۔ اب بھی بہت ساری چیزیں میرا مکان مجھ سے مانگتا ہے۔ میرے تجربے اور مشاہدے میں یہ بات آگئی ہے کہ مکان بنانے کے لئے کافی سرمایہ چاہیئے۔ بہ فضل اللہ دوسری منزل کا جو خواب میں نے کسی زمانے میں دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر ہوا۔

2016ء میں بہار اُردو اکادمی نے میری تحقیقی وتنقیدی مضامین کی کتاب ''شعورِ بصیرت'' پہ 10,000 روپے کا انعام دیا۔ میں نے اللہ کا شکرادا کیا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بس یہ سب اللہ کا کرم ہے، میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ 2016ہی میں مجھے بہار اُردو اکادمی کے دوروزہ قومی سیمینار میں شرکت کرنے کا موقعہ ملا اس سیمینار کا موضوع تھا ''اُردو فکشن کے دوسو سال'' میں نے اس سیمینار میں اپنا افسانہ ''قبر میں زندہ آدمی'' سُنایا تھا جسے کافی پسند کیا گیا تھا۔

12 جنوری 2016ء کو مجھے ممبئی میں گلوبل اچیور ایوارڈ سے نوازا گیا۔ دادر ویسٹ ممبئی میں یہ انعامات کی تقریب منعقد کی گئی تھی۔ میرے مقدر کا ستارہ بڑے عجیب وغریب انداز میں چمکتا رہا ہے۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا کہ

ایک دن مجھے ممبئ میں گلوبل اچیور ایوارڈ ملے گا۔ یہ سب اللہ کا مجھ پہ خصوصی کرم تھا کہ میری علمی وادبی خدمات، محنت ولگن اور ذوق وشوق کو ممبئ جیسے بڑے شہر میں انعام واعزاز کے ساتھ سراہا گیا۔

میں کشن پور ہائی اسکول میں ڈیوٹی دے رہا تھا کہ چیف ایجوکیشن آفیسر جموں کی جانب سے مجھے ایک روز یہ حکم نامہ موصول ہوا کہ مرکزی سرکار کی تعلیمی اسکیم رمسا(RMSA) کے تحت ایک ہفتے کی فردِ آگہی(Resourse Person) ٹرینگ میں شرکت کرنی ہے۔ میں جموں میں ایک ہفتے کی ٹرینگ پہ چلا گیا۔ ایک ہفتے کے بعد جب میں اسکول آیا تو معلوم ہوا کہ چند دنوں کے بعد جموں کے مختلف زونس میں پچاس پچاس ٹیچروں کو ٹرینگ دینی ہے۔ ٹرینگ دلانے والوں میں میرا نام بھی شامل تھا۔ ہمارا ٹرینگ کیمپ ماڈل ہائر اسکنڈری اسکول نگروٹہ میں تھا۔ تین مہینے تک یہ ٹیچرس ٹرینگ پروگرام چلتا رہا۔ ایک بڑے ہال میں پچاس ٹیچروں کا گروپ ایک ہفتے تک زیر ٹرینگ رہتا۔ اسٹاف اور ٹیچروں کے طعام کا انتظام محکمے کی طرف سے تھا۔ ہم کُل چھ اساتذہ تھے جو پچاس ٹیچروں کو ٹرینگ دیتے تھے۔ اُن میں ماسٹر راجیو ترکھا، میڈم سریتا شرما، جوشل شرما، کرن سنگھ، راجیش سنگھ جموال اور کماری کومل بنگوترہ کے نام شامل ہیں۔ میرا کام مارننگ اسمبلی میں اخلاقی درس دینا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اُردو تدریس کے طریقۂ کار سے واقف کرانا بھی میرے ذمے تھا۔ تمام خواتین وحضرات اساتذہ کو میں چھٹی ہونے کے وقت اکثر جموں کے یک اچھے شاعر وِدیا رتن عاصیؔ کا یہ شعر سُنا کر ہنسا دیتا تھا کہ ؎

بیٹھے ہو سرِ راہ گزر کیوں نہیں جاتے
تُم لوگ تو گھر والے ہو گھر کیوں نہیں جاتے

اسی ٹرینگ کے دوران اللہ تعالیٰ نے مجھے ہائی کورٹ جموں سے انصاف دلایا تھا۔ اس کے بعد میرے بڑے بھائی جناب نذیر احمد وانی اور میرے بہنوئی

جناب محمد اسداللہ وانی میرے ہمراہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں آئے تھے۔ ہم نے جونہی فرشتہ صفت انسان محترم پروفیسر جاوید مسرت صاحب (اُس وقت کے وائس چانسلر بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری) کے دربار میں قدم رکھا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میری فیصلے کی کاپی دیکھی تو مجھے مبارک باد دی۔ اُس وقت کے رجسٹرار اطاعت حُسین صاحب کو اپنے پاس بلایا اور اُنھیں فوری طور پر میرا آرڈر تیار کرنے کو کہا (یہاں یہ بات یاد رہے کہ میری حق تلفی پروفیسر جاوید مسرت صاحب سے پہلے کے لوگوں نے کی تھی)۔ چند دن کے بعد مجھے یونیورسٹی کے ایک ہیڈ کلرک نے یہ اطلاع دی کہ آپ فوری طور پر راجوری یونیورسٹی میں آکر اپنا آرڈر حاصل کریں۔ میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری پہنچا اور آرڈر حاصل کیا۔ اُن دنوں ہائی اسکول کشن پور میں اُدھم پور کی ایک خاتون ہیڈ ماسٹر تھی۔ اُس کے پاس ٹیچروں کی تنخواہ نکالنے اور دوسرے اہم اختیارات نہیں تھے۔ زونل ایجوکیشن آفیسر ڈنسال کو ہمارے اسکول کے اختیارات برتنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ میں میڈم کرن بالا شرما جو اُس دوران زونل ایجوکیشن آفیسر ڈنسال تھی، کا بھی شکر گزار ہوں کہ جس اچھی خاتون نے میرے اسکول ایجوکیشن محکمے سے رُخصتی کے کاغذات پر دستخط اور اپنی افسری مہر ثبت کی تھی اور اس طرح میں نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں 2 جنوری 2017ء کو اسسٹنٹ پروفیسر اُردو کی پوسٹ پہ جوائن کیا تھا۔ یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ 10 اگست 2014ء کو جب جموں میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے مہمان خانے (Guest House) میں اسسٹنٹ پروفیسر کا انٹرویو ہوا تھا تو مجھے انٹرویو کے کچھ دن بعد معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ میں سلکیٹ کیا گیا ہوں۔ تقریباً پچیس دن تک آرڈر کا انتظار کرتے کرتے جب مجھے تشویش ہوئی تو میں ایک دن جموں سے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری چلا آیا۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ میری سلیکشن ہو چکی ہے لیکن آرڈر تب موصول ہوگا جب میں اسکول ایجوکیشن کمشنر

سے غیر اعتراض سرٹیفکیٹ (No objection Certificate) دوں گا۔ اُن دنوں میری ڈیوٹی گورنمنٹ ہائی اسکول چک لارگن (بجالتہ، جموں) میں تھی۔ میں نے فوری طور پر اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر پرویز احمد سے اپنے تمام ضروری کاغذات کی فائل تیار کر کے دستی چیف ایجوکیشن آفیسر جموں کے دفتر میں پہنچائی۔ دوسرے ہی دن وہاں سے فائل میں نے خود ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن جموں کے دفتر پہنچائی۔ وہاں سے تقریباً ایک ہفتے کے بعد فائل حاصل کی اور بذریعہ ہوائی جہاز سری نگر پہنچ گیا۔ 2014ء ہی میں کشمیر میں پانی کا جان لیوا سیلاب آیا تھا سینکڑوں انسان اور ہزاروں جانور موت کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ وادیٔ کشمیر کے عوام پر اللہ کی طرف سے پانی کی صورت میں یہ ایک طرح کی قیامت صغریٰ آئی تھی۔ میں جب سری نگر کے ہوائی اڈے پر پہنچا اور وہاں سے ایک چھوٹی گاڑی میں سوار ہو کر اپنے دوست مشتاق مہدی (مشہور افسانہ نگار و شاعر) کے گھر کی طرف روانہ ہوا تو مجھے پانی میں سڑے جانوروں کی بدبُو نے سخت پریشان کیا، مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ مجھے متلی آجائے گی۔ رات کو اپنے دوست مشتاق مہدی کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اُنھوں نے مجھے بڑے آرام سے اپنے گھر پر رکھا۔ دوسرے دن میں اپنی فائل لے کر سیکریٹریٹ چلا گیا۔ گیٹ پر شناختی کارڈ، پوچھ گچھ اور جسمانی تلاشی کے بعد میں خدا خدا کر کے اند چلا گیا۔ سیکریٹریٹ کے باہر احاطے میں ہزاروں کی تعداد میں مختلف محکموں سے تعلق رکھنے والی فائلیں نیچے فرش پر سکھانے کے لئے رکھی گئی تھیں۔ یہ وہ فائلیں تھیں جو سیلاب کی زد میں آچکی تھیں۔ سیکریٹریٹ میں ملازمین نہ کے برابر تھے۔ اللہ کا کرم یہ کہ اسکول ایجوکیشن کمشنر کے آفس میں زیادہ تر جموں کے لوگ موجود تھے۔ میرے دوست شمیم احمد ایڈوکیٹ اور اجے بھارتی بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ سینئر اور جونیئر کلرک بھی موجود تھے۔ میں رام سنگھ کو نہیں بھول پاؤں گا۔ اُس شخص نے میری مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے فوری طور پر میری فائل تیار کر دی تھی۔ جناب ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی کے صاحبزادے

جناب خالد نجیب نے بھی میری مدد کی تھی۔ دوسرے دن فائل کمشنر کے پاس دستخط کے لئے بھیج دی گئی اور کوئی دو گھنٹے کے بعد اُس نے دستخط کیا۔ مجھے غیر اعتراض سٹرفکیٹ (No objection Certificate) حاصل ہوا۔ میں بہت خوش ہوا۔ اُسی دن میں ایک چھوٹی گاڑی میں پہلی دفعہ پلوامہ، شوپیاں اور پیر کی گلی سے ہوتے ہوئے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری پہنچا اور غیر اعتراض سٹرفکیٹ جمع کرایا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے آرڈر نہیں دیا گیا۔ بلکہ 9 مہینے کے بعد پھر وہی پوسٹ مشتہر کی گئی جس پر میری سلیکشن ہو چکی تھی۔ اس کے بعد میں ہائی کورٹ چلا گیا۔ اس پوسٹ کی تشہیر پر روک لگوادی۔ تقریباً دو سال تک میں نے ہائی کورٹ میں کیس لڑا اور بالآخر میرے وکیل شیخ شکیل احمد نے کیس جیت لیا۔ پرفیسر جاوید مسرت صاحب جیسے خوب صورت اور نیک سیرت وائس چانسلر نے میرے فیصلے کی کاپی حاصل کرنے کے دس دن بعد مجھے آرڈر دلایا۔ اُنھوں نے دراصل میری سلیکشن کی فائل کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ پایا تھا کہ مشتاق احمد وانی کا حق بُری طرح سے چھینا گیا ہے۔ اسی احساس بلکہ دُکھ نے اُنھیں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی میں شعبہء اردو قائم کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ اُن سے پہلے خطہء پیر پنچال کے لوگوں کے کئی وفد شعبۂ اردو قائم کرنے کے لئے یہاں آچکے تھے لیکن سابق وائس چانسلروں نے اُن کی مانگ سننے کے بعد کوئی بھی عملی قدم نہیں اُٹھایا تھا۔

....

جہاں تک میری ادبی زندگی کا تعلق ہے مجھے اُردو کے ساتھ چھوٹی ہی عمر سے بے حد لگاؤ رہا ہے۔ شمیم کرہانی، اسمٰعیل میرٹھی، حفیظ جالندھری، مائل خیر آبادی، علامہ اقبالؔ کی مشہور نظمیں خاص کر ''ایک مکڑا اور مکھی'' ''بزمِ انجم'' اور ''ایک آرزو'' مجھے زبانی یاد تھیں۔ برج نارائن چکبستؔ کی مشہور نظم ''رام چندر جی بن باس جاتے وقت'' بھی مجھے ازبر تھی۔ میر تقی میرؔ، غالبؔ، جوشؔ، حسرتؔ، حالیؔ، محمد حُسین آزادؔ، فراق

گورکھپوری، رواں اُنّاوی، سیماب اکبرآبادی، تلوک چند محروم، فیض احمد فیضؔ اور جگن ناتھ آزادؔ کے کئی اشعار مجھے آج بھی یاد ہیں۔ شعروشاعری، ناول، ڈراما اور افسانہ میں بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ میری پہلی ادبی تخلیق ''احساسِ خطا'' کے نام سے 1988ء میں ماہنامہ ''بھیانک جرائم'' (دہلی) میں شائع ہوئی۔ پہلی بار ایک رسالے میں اپنی تحریر چھپی دیکھ کر مجھے انتہائی مسرّت ہوئی تھی۔ ''احساس خطا'' کہانی نہیں تھی بلکہ میں نے اپنے ایک گناہ کا اظہار واعتراف کیا تھا۔ مجھ سے یہ گناہ کچھ اس طرح سرزد ہوا تھا کہ ہمارے پچھلے گھر (مرمت، ضلع ڈوڈہ) میں مُرغی اپنے دس بچّوں کے ساتھ کُٹ کُٹ کرتی آنگن میں گھوم رہی تھی اور اُس کے بچّے اب تقریباً بڑے ہو رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایک بلّا جو ہمارے اپنے ہی گھر کا تھا کہیں سے آنکلا اور ایک چوزے پہ جھپٹ پڑا۔ وہ اُسے گردن سے پکڑ کر لے بھاگا۔ میں نے بلّے کا پیچھا کیا اور کچھ ہی دُوری پر اُس کے منہ سے مرغی کا بچّہ گر گیا لیکن وہ مر چکا تھا۔ بلّا فوراً درخت پر چڑھ گیا۔ میرے ہاتھ میں ڈنڈا تھا، میں آہستہ سے درخت پر چڑھا اور زور سے بلّے کی کمر پر ڈنڈا مارا۔ اُس کی کمر ٹوٹ گئی اور ایک دلدوز چیخ اُس کے مُنہ سے نکلی۔ وہ چلنے سے معذور ہو گیا۔ میں نے اُسے ہاتھوں پہ اُٹھایا اور گھر میں لاکر ایک تاریک سی کوٹھری میں رکھ دیا۔ اب میں نے اُسے دُودھ میں روٹی بھگو کر کھلانے کی کوشش کی لیکن درد کے مارے اُس نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ وہ آدھی رات تک کراہتا رہا اور سویرے جب میں اُسے دیکھنے گیا تو وہ مر چکا تھا۔ میں اُسے مُردہ پاکر بہت دُکھی ہوا۔ میں نے کدال لے کر اُسے کھیت میں ایک جگہ گاڑھ دیا! اسی واقعے کو میں نے بعد میں ''احساسِ خطا'' کا عنوان دیا۔ میری پہلی باضابطہ کہانی ''تڑپتے پنچھی'' کے نام سے 1989ء میں چھپی تھی۔ یہ کہانی بھی ماہنامہ ''بھیانک جرائم'' (دہلی) میں شائع ہوئی تھی۔ یہاں یہ ذہن نشین رہے کہ میں نے افسانے لکھنے سے پہلے شاعری کی ہے۔ 1987ء میں جب میں اپنے آبائی گاؤں کے گورنمنٹ مڈل اسکول بھوتہ میں تعینات کیا گیا تو میں نے

بچّوں کے لیے ایک دُعا لکھی تھی جسے وہ صبح کی محفل میں گایا کرتے تھے اور آج بھی ہائر اسکنڈری اسکول گوہا میں یہ گائی جاتی ہے۔ اس دُعا کا پہلا شعر آج بھی مجھے یاد ہے:

اے دو جہاں کے مالک کر نظر کرم تیرے سوا کوئی بھی ہمارا نہیں
ہے گرداب میں سفینہ یہ ڈوب نہ جائے نظر آتا کوئی بھی کنارا نہیں

میں نے اس کی طرز بھی خود تیار کی تھی اور بڑے پُر سوز انداز میں بچّے اسے اسکولوں میں گایا کرتے تھے۔ میں نے پہلی بے وزن غزل 1983ء میں کہی کہ جب میں گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ میں بی اے پارٹ فسٹ میں پڑھتا تھا لیکن اُس کے بعد جب میں نے ناگپور کے ایک ماہر عروض دوست جناب خلیل انجم سے اصلاح لینا شروع کیا تو کچھ اچھی باوزن غزلیں بھی کہیں۔ علاوہ ازیں کہنہ مشق شاعروں کا کلام پڑھنے اور مشق سخن کرنے کے بعد مجھ میں شعر کہنے کی تھوڑی سی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ میں نے جناب عرشؔ صہبائی سے بھی اصلاح لی ہے۔ شاعری میں اُنھیں اپنا اُستاد مانتا ہوں۔ میں نہ عروض جانتا ہوں اور نہ ہی سخن شناس ہوں، البتہ شعر کو جب میں اپنے مخصوص انداز میں پڑھتا ہوں تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا شعر وزن میں ہے اور کون سا بے وزن۔ مزید برآں شاعری صرف ردیف و قافیہ جوڑنے کا نام نہیں ہے۔ شاعری نازک ترین فن ہے۔ میں نے جب اپنے اندرون میں جھانکا تو مجھے اپنی طبعیت شعر کہنے کے لیے غیر موزوں معلوم ہوئی۔ تقریباً آج تک کُل بیس پچیس غزلیں کہی ہیں۔ اُنھیں اپنی بیاض میں محفوظ رکھا تھا لیکن میری وہ بیاض کوئی چُرا کے لے گیا ہے۔ موجودہ دور میں شاعروں کی تعداد ان گنت ہے۔ ہزاروں شاعر ہیں لیکن شاعری بہت کم ہے کیونکہ شاگرد بننا کوئی پسند نہیں کرتا اور اساتذہ کے پاس وقت نہیں۔ مشاعروں میں زیادہ تر ایسے شاعر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جنھوں نے دو چار غزلیں کسی ماہر عروض سے اصلاح کروالی ہیں اور مشاعروں میں اُنھیں کو بار بار پڑھتے ہیں اور اس طرح حکومت کے ثقافتی اداروں سے اپنا کشکول بھرتے ہیں۔ میرے نزدیک شعر و شاعری وہی جو

قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے۔ آج کا شاعر واہ واہ کا طلب گار ہے اور اپنی روح کی تسکین کے لیے جھوٹی داد چاہتا ہے۔ اُس میں محنت و لگن اور خون جگر جلانے کا یارا نہیں۔ تمام ادبی فنون انسان سے سخت محنت و ریاضت چاہتے ہیں۔ جنونِ عشق انسان کو ہر حال میں منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔

کہانی یا افسانے میں ہمیشہ زندہ رہنے کے امکانات موجود ہیں۔ ادب کی ایک اہم صنف 'ناول' لکھنے اور پڑھنے کا رُجحان بہت حد تک ختم ہو چکا ہے۔ عصر حاضر میں دو ڈھائی سو صفحات پہ مشتمل ناول پڑھنے کے لیے بھلا کس کے پاس وقت ہے۔ ہمیں تو ٹیلی ویژن، ریڈیو، موبائل فون، انٹرنیٹ، اخبار، فیس بُک، وٹس ایپ، یوٹیوب، کمپیوٹر اور گوناگوں مسائلِ حیات سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اس سب کے علاوہ کہانی مختصر وقت میں پڑھی جاتی ہے اور ہمیں زندگی کے کسی اہم واقعے، جذبے، خیال اور فکری پہلو سے نہ صرف واقف کراتی ہے بلکہ ہمیں اپنا صحیح زندگی کا رُخ اختیار کرنے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ کہانی کا خمیر میری رگ رگ میں رچ بس چکا ہے۔ 1988ء میں جب میں اور میرا چھوٹا بھائی اشفاق احمد وانی پانی میں تیرتے ہوئے گرداب میں پھنس گئے تھے تو میں نے اُسی جان لیوا واقعے کو ''موت کا جھٹکا'' نام دے کر ماہنامہ ''بھیانک جرائم'' میں چھپنے کے لیے بھیج دیا اور وہ اُس میں چھپ گیا۔ میرے افسانے زندگی میں رُونما ہونے والے واقعات سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔ سماجی بُرائیوں پر گہرا طنز کرنے کے ساتھ ساتھ آفاقی قدروں کی بحالی اور بقا پر زور دیتا ہوں۔ زندگی میں خوشگوار ماحول اور اعتدال و توازن ہنستے ہنستے قائم نہیں ہوتا، اس کے لیے برسوں کی محنت و ریاضت درکار ہوتی ہے۔ میں کہانی کے تمام فنی لوازمات کا خیال رکھتا ہوں اور کہانی یا افسانہ تخلیقنے کے دوران میری یہ کوشش رہتی ہے کہ میرا قاری میرا مونس و غم خوار بن جائے۔ وحدت تاثر کو میں کہانی کی جان سمجھتا ہوں۔ جہاں تک میرے افسانوں کے موضوعات کا تعلق ہے میں نے ہر ممکن نئے موضوعات کو اپنایا ہے۔ گھسے پٹے موضوعات پر میں افسانے نہیں لکھتا۔ زندگی کے

کئی رنگ ہیں، ہر رنگ کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ میں نئے موضوعات کی تلاش میں رہتا ہوں اور تب تک کوئی بھی افسانہ نہیں لکھتا جب تک میں شدید تخلیقی کرب میں مُبتلا نہ ہو جاؤں۔ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو تھوڑا تھوڑا لکھتا ہوں۔ اُسے بار بار پڑھتا ہوں اور زبان و بیان پہ غور و فکر کرتا چلا جاتا ہوں۔ کس لفظ اور واقعے سے قاری پر کیا اثر پڑے گا ؟ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں رہتی ہیں۔

2001ء میں میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ہزاروں غم'' منظر عام پر آیا۔ اس میں کُل سولہ افسانے شامل ہیں۔ بہ فضل اللہ میری اُمید سے زیادہ ادبی حلقوں میں اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ میرے دوست جناب امین بنجارا کا لکھا ہوا دیباچہ اس میں شامل ہے۔ اس مجموعے میں شامل کہانیوں میں مجھے جو کہانیاں سب سے زیادہ پسند ہیں وہ ہیں ''اجنبی دو دل اجنبی'' ''تنہا پرندہ'' میں تجھے آواز دیتا ہوں'' ''مکّار'' ''شفاخانہ'' اور'' ہزاروں غم'' میرے نزدیک کہانی میں کہانی پن نہ ہو تو سب بے کار ہے۔ ''ہزاروں غم'' کی کہانیاں زیادہ تر ماہنامہ ''بیسویں صدی'' گلابی کرن'' (دہلی) اور ماہنامہ ''پروازِ ادب'' (پٹیالہ) جیسے ادبی رسائل میں چھپی ہیں۔

2002ء میں میرا تحقیقی مقالہ ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا۔ اس ادارے نے میرے اس مقالے کے دو ایڈیشن شائع کر دیئے ہیں۔ میں اس معاملے میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی مالی تعاون کے میری یہ کتاب مفت میں چھپ گئی اور مجھے رائلٹی کے طور پر کتابیں بھی دستیاب ہوئیں۔ مزید برآں اس کتاب کی اشاعت سے پوری اُردو دُنیا میں میری شناخت بنی۔ 452 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اُردو کے دیدہ ور ناقدین، محققین اور مفکّرین نے لفظ لفظ پڑھی اور مجھے اپنا لہو نچوڑنے پر مبارک باد دی۔ مذکورہ کتاب نہ صرف برصغیر ہندوستان و پاکستان بلکہ ناروے، امریکہ، جرمنی

اور کنیڈا میں بھی مقبول ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں یہ میرے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ پبلشر نے اس کتاب پہ کافی روپیہ کمایا۔

2004ء میں میرے تحقیقی وتنقیدی مضامین پہ مشتمل کتاب ''آئینہ در آئینہ'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب بھی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے بڑی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کی۔ مذکورہ کتاب میں شامل میرے وہ مضامین ہیں جو میں نے جموں یونیورسٹی میں منعقدہ سیمیناروں میں پڑھے ہیں یا کسی رسالے کے مدیر کی فرمائش پر لکھے ہیں۔

2008ء میں میرے افسانوں کا دُوسرا مجموعہ ''میٹھا زہر'' کے نام سے شائع ہوا جس میں میرے کُل بارہ افسانے شامل ہیں۔ میرا یہ دوسرا افسانوی مجموعہ میرے پہلے افسانوی مجموعے ''ہزاروں غم'' سے بالکل مختلف ہے۔ یہ افسانے کتابی صورت میں چھپنے سے پہلے اُردو کے اہم اور موقر رسائل میں شائع ہوئے جن میں ماہنامہ ''شاعر'' (ممبئی) ماہنامہ ''شاندار'' (اعظم گڑھ) ماہنامہ ''بیباک'' (مہاراشٹر) بھاشا وبھاگ پنجاب پٹیالہ سے شائع ہونے والا دو ماہی ''پروازِ ادب'' اور اُڑیسہ سے شائع ہونے والا سہ ماہی ''روزن'' اہم ہیں۔ کتابی صورت میں منظر عام پر آنے سے پہلے میں نے یہ چاہا کہ اُردو فکشن کے اہم ناقدین کی نظروں سے یہ افسانے گزریں۔ چنانچہ میں نے محترم پروفیسر گوپی چند نارنگ، محترم وہاب اشرفی، محترم پروفیسر عتیق اللہ، محترم پروفیسر حامدی کاشمیری، محترم پرفیسر ظہورالدّین، محترم پروفیسر قمر رئیس، محترم جوگندر پال، محترم پروفیسر علی احمد فاطمی۔ محترم پروفیسر ارتضیٰ کریم، محترم انیس امروہوی، محترم پروفیسر اسلم جمشید پوری، محترم محمد شاہد پٹھان اور ڈاکٹر محمد ریاض احمد کو مسّودہ پیش کیا۔ ان تمام صاحب بصیرت افراد نے میرے افسانوں کا موضوعاتی اور ہیئتی اعتبار سے جائزہ لیا اور اپنے اپنے تاثرات مجھے لکھ بھیجے۔ اُردو کی ہمہ جہت شخصیت جناب مناظر عاشق ہرگانوی نے ''میٹھا زہر'' پر ایک جامع اور فکر انگیز مضمون

بعنوان ''مُشتاق احمد وانی کے افسانوں کا سچ'' لکھا۔ ماہنامہ ''بیباک'' کے مدیر نے 2009ء کے افسانہ نمبر میں اس مجموعے پر تبصرہ لکھوایا۔ انجمن ترقیِ اُردو ہند نئی دہلی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''ہماری زبان'' کے مدیر جناب خلیق انجم نے یکم تا سات اکتوبر 2009ء کے شمارہ میں محمد ابوذر سے ''میٹھا زہر'' پر تبصرہ لکھوایا۔ اس کے علاوہ وہاب اشرفی صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی ''مباحثہ'' میں بھی ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے تبصرہ لکھا۔ جناب قاضی مشتاق احمد پونہ والے اور محترمہ سیدہ نسرین نقاش اور جناب محمد شاہد پٹھان بھی ''میٹھا زہر'' کو موضوع بنا چکے ہیں۔

1999ء میں پی ایچ ڈی کرنے کے فوراً بعد مجھ میں یہ شوق پیدا ہوا کہ میں ڈی لٹ کروں۔ اُس وقت پروفیسر ظہورالدّین صاحب (مرحوم) جموں یونیورسٹی میں رجسٹرار کے عہدے پر کام کرتے تھے۔ میں نے اُن سے مشورہ کیا کہ میں ڈی لٹ کرنا چاہتا ہوں اور میری دلچسپی اُردو ادب کی خواتین قلمکاروں سے ہے تو ظہور صاحب نے مجھے ''اُردو ادب میں تانیثیت'' کے موضوع پر ڈی لٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ اُنھوں نے مجھے فیس، فارم اور مذکورہ موضوع کا خاکہ (Synopsis) تمام ضروری لوازمات کے ساتھ ریسرچ سیکشن میں جمع کرانے کو کہا۔ چنانچہ میں نے تقریباً دو ہزار روپیہ فیس، فارم اور اکیس کاپیاں اپنے تفصیلی خاکے کی جمع کرائیں۔ کئی بار مختلف مسائل پر جنرل باڈی کی میٹنگیں ہوتی رہیں لیکن میری ڈی لٹ کی میٹنگ کو ہر بار چند اشخاص کی بے توجہی نے نہیں ہونے دیا اور میری تمام محنت اور وقت یعنی تقریباً آٹھ سال میری زندگی کے ضائع ہوگئے۔ البتہ میں ''اُردو ادب میں تانیثیت'' کے موضوع سے متعلق مواد اکٹھا کرتا رہا۔ بالآخر جب میں نے کوئی تین سال کے بعد اپنی فیس واپسی کا فارم بھرا تو مجھے کُل نو سو روپے واپس ملے۔ باقی پتا نہیں کہاں گئے! جموں یونیورسٹی میں ڈی لٹ نہیں ہوتی ہے۔ میں نے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے 2004ء میں بیرون ریاست یونیورسٹیوں میں ڈی لٹ کروانے کا پتا لگوایا تو معلوم ہوا کہ ہندوستان کی چند

یونیورسٹیوں میں ڈی لٹ ایک ضابطے کے تحت ہوتی ہے اور اُن یونیورسٹیوں میں ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی بھی شامل ہے۔ میں نے 2004ء میں ڈی لٹ کا فارم، فیس اور دیگر ضروری شرائط کے علاوہ اپنے موضوع کا تفصیلی خاکہ مذکورہ یونیورسٹی میں جمع کرایا۔ 7، اپریل 2007ء کو مجھے ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی میں بلایا گیا اور میرے موضوع ''اُردو ادب میں تانیثیت'' کو منظوری مل گئی اور میرا ڈی لٹ کے لیے رجسٹریشن ہوگیا۔ محترم جناب پروفیسر احمد لاری، جناب پروفیسر فضل امام اور جناب پروفیسر سید شریف الحسن کو اس میٹنگ میں مدعو کیا گیا تھا۔ اب میں نے دن کو اسکول جانے سے پہلے اور رات کو گیارہ بجے تک اپنا ڈی لٹ کا مقالہ لکھنے کا معمول بنایا۔ میں نے دن رات میں محنت کی اور مسلسل ساڑھے چار سال کے بعد 20 فروری 2010ء کو ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی میں ڈی لٹ کا مقالہ داخل کر دیا۔ میرے ایک مخلص اور خیر خواہ نے کہ جس نے مجھے نہ صرف اپنا دوست سمجھا بلکہ میرے ساتھ ایک سگّے بھائی سے بھی اچھا سلوک کیا وہ افضل حسین بستوی (دہلی) ہیں کہ جنھوں نے میرے مقالے کی کمپوزنگ کی اور پورے ایک مہینے تک کمپوزنگ چلتی رہی۔ ہر صفحے پر پچیس سطریں رکھنے کے باوجود میرا مقالہ 780 صفحات پر پھیل گیا۔ جولینا جامعہ ملّیہ اسلامیہ نئی دہلی کے نزدیک شرما فوٹو اسٹیٹ اور بک بائنڈر نے اس مقالے کی جلد بندی کی اور میں نے پانچ جلدیں ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی (اُتر پردیش) میں جمع کرادیں۔ بڑی سخت آزمائشوں اور ذہنی کوفتوں کے بعد فروری 2012ء میں میرا ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی میں (Viva Voce) زبانی امتحان ہوا۔ پروفیسر فضل امام صاحب، لکھنو یونیورسٹی، پروفیسر انور پاشا صاحب جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی اور پروفیسر محمد زاہد صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میرے ڈی لٹ کے وائیوے میں آئے تھے۔ مئی 2012ء کو مجھے ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی کے آڈی ٹوریم میں اُس

وقت کے گورنر جناب بی ایل جوشی کے ہاتھوں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل ہوئی تھی۔ اس کنووکیشن میں انتہائی نیک سیرت اور میرے بھائیوں سے بھی زیادہ مجھے چاہنے والے محترم ڈاکٹر شریف احمد قریشی کو بھی ڈی لٹ کی ڈگری حاصل ہوئی تھی۔ اُنھوں نے میری آج تک بہت مدد کی ہے، مجھے اپنے بھائی کی طرح سمجھا ہے۔ میں آج بھی علمی وادبی کاموں میں اُن سے مشورہ کرتا ہوں۔ ایسا پیارا، مخلص اور قابل ترین انسان کسی خوش نصیب ہی کو مل سکتا ہے۔

آج تک میری جو کتابیں شائع ہوکر اُردو کے سنجیدہ قارئین سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں اُن میں ''ہزروں غم'' (افسانے) ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' (تحقیق وتنقید) ''آئینہ در آئینہ'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''میٹھا زہر'' (افسانے) ''اعتبار ومعیار'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''شعورِ بصیرت'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''اُردوادب میں تانیثیت'' (تحقیق وتنقید) ''اندر کی باتیں'' (افسانے) ''قبر میں زندہ آدمی'' (افسانے) ''ترسیل وتفہیم'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''کیا حال ہے جاناں!'' (افسانے) ''تناظر وتفکر'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''نئی تنقیدی معنویت'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''تنقیدی فکر وفن'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''کہکشانِ خیال'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) اورافسانوں کا چھٹا مجموعہ ''آج میں کل تُو'' شامل ہیں۔ ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ''خارستان کا مسافر'' (خودنوشت سوانح حیات) اور ''ادبی اقدار کی بازیافت'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) زیرِترتیب ہیں۔

میں اپنی خودنوشت سوانح حیات کو ''خارستان کا مسافر'' نام دے رہا ہوں، وہ اس لیے کہ میری نظر میں یہ دُنیا خارستان ہے، گلستان نہیں بالفاظ دیگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کانٹوں کا بچھونا ہے، پھولوں کی سیج نہیں۔ اس میں مجھے درد والم زیادہ نظر آتے ہیں اور خوشیاں بہت کم۔ زندگی کا ہر لمحہ ہر چیز میں جُدائی جُدائی کا اعلان کرتا ہوا گزر جاتا ہے!

....

1992ء میں، میں ادبی پروگرام 'خرمن' کے نشریاتی سلسلے میں ریڈیو کشمیر جموں سے وابستہ ہوا۔ میں نے پہلی مرتبہ جب اپنی آواز ریڈیو پہ سُنی تو دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اُن دنوں جناب مہاراج کرشن پاریمو ریڈیو کشمیر جموں میں اُردو پروگرام ''خرمن'' کے انچارج ہوا کرتے تھے۔ پہلے ہی پروگرام میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔ میرا تلفّظ اور آواز اُنھیں بھا گئی۔ وہ میری آواز کے گرویدہ ہوگئے اور باقاعدہ طور پر مجھے ریڈیو پر بلاتے رہے۔ 1992ء سے لے کر تا حال میرے درجنوں تحقیقی وتنقیدی مضامین اور افسانے ریڈیو کشمیر جموں کے ذریعے اُردو کے شیدائیوں نے سُنے ہیں اور بہ فضل اللہ تعالیٰ بہت پسند کیے گئے ہیں۔ ریڈیو کے ذریعے اپنے دل کی بات عوام تک پہنچانا نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ وقت کی بندش، تھتلاہٹ سے بچنا اور ایک خوب صورت تلفّظ کے ساتھ دلکش آواز کا پایا جانا انتہائی اہم باتیں ہیں۔ کوئی بھی لفظ زبان سے غلط نہ نکلے اور ایک اعتماد کے ساتھ اپنا مافی الضّمیر بیان ہو، یہ تمام باتیں ذہن میں رکھنی پڑتی ہیں۔

اُردو شعروادب کی جن عظیم ہستیوں کی تخلیقات ونگارشات نے مجھے بے حد متاثر کیا اُن میں میرامن دہلوی، میر تقی میر، مرزا غالبؔ، علامہ اقبال، سرسید احمد خان، حالیؔ، محمد حسین آزادؔ، مولانا شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا محمد ہادی رُسوا، منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، پطرس بخاری، ممتاز شیریں، بانو قدسیہ، شوکت صدیقی، اوپندر ناتھ اشک، رام لعل، جوگندر پال، رتن سنگھ، عزیز احمد، انتظار حسین، جمیلہ ہاشمی، واجدہ تبسّم، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، اقبال متین، عبدالصّمد، صلاح الدّین پرویز، سلام بن رزاق، حسین الحق، سید محمد اشرف، شوکت حیات، مناظر عاشق ہرگانوی، شریف احمد قریشی، سیدہ نسرین نقاش، غزال ضیغم، ذکیہ مشہدی، کنور سین کے علاوہ اور بھی فکشن نگار ہیں جو میرے مطالعے میں رہے ہیں۔ شاعروں میں

میر تقی میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، حسرت موہانی، سیمابؔ اکبرآبادی، مائلؔ خیرآبادی، فراقؔ گورکھپوری، نظیرؔ اکبرآبادی، اکبرؔ الہ آبادی، عرشؔ ملسیانی، ساحرؔ ہوشیار پوری، جگرؔ مراد آبادی، فیض احمد فیضؔ رفعت سروشؔ، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، ساحرؔ لدھیانوی، حفیظؔ جالندھری، تلوک چند محرومؔ، جگن ناتھ آزادؔ، ن م راشدؔ، اخترؔ الایمان، جان نثار اخترؔ، بکل اُتساہیؔ اور جدید شاعروں میں بشیر بدرؔ، مخمور سعیدیؔ، ندا فاضلیؔ، علیم صبا نویدی، زُبیر رضویؔ، منوّر رانا، احمد فرازؔ، فرحت احساس، اصغر ویلوری، مجیب شہزرؔ، راحت اندوری کے علاوہ بہت سے نام اور بھی ہیں۔

تحقیق وتنقید میں جن نابغۂ روزگار ہستیوں نے متاثر کیا اُن میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، گوپی چند نارنگ، گیان چند جین، رشید حسن خان، قمر رئیس، حامدی کاشمیری، وہاب اشرفی، یوسف حسین خان، کالی داس گپتا رضا، شمیم حنفی، مناظر عاشق ہرگانوی، قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، خلیق انجم، قدوس جاوید، محمد یوسف ٹینگ، غلام نبی خیال، شمس الرحمٰن فاروقی، ارتضیٰ کریم، پروفیسر عبدالحق، اسلم پرویز، پروفیسر ظہورالدّین، وزیر آغا، یوسف سرمست، اسلم آزاد، رحمت یوسف زئی، محمد حسن، مظفر حنفی، ملک زادہ منظور احمد، مجید بیدار، شریف احمد قریشی، ابوالکلام قاسمی، عتیق اللہ، شارب ردولوی، علی احمد فاطمی، اسلم جمشید پوری، ہمایوں اشرف، حقانی القاسمی کے علاوہ بہت سے لوگ اور بھی ہیں جو اُردو کی بہت اچھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہاں علمائے دین کا ذکر کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جن کی دینی کتب نے مجھ میں دینِ اسلام کی عظمت کے ساتھ ساتھ مذاہبِ عالم کو جاننے کی تڑپ پیدا کی۔ اس سلسلے میں پہلا نام مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کا ہے۔ اُن کے بعد سید ابوالحسن علیٰ ندوی صاحب، شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا صاحب، مولانا منظور نعمانی صاحب، مولانا وحیدالدّین خان صاحب، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، مولانا محمد یوسف صاحب، مولانا عاشق الٰہی بلند شہری، مولانا احمد رضا خان، مولانا سید قطب

شہید صاحب، مولانا عمر پالن پوری صاحب، ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب اور مولانا طارق جمیل صاحب نے مجھے کافی متاثر کیا۔

....

پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے تحقیقی مقالے لکھنے کے دوران میں نے اُن تمام ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے علاوہ علمائے دین کی کتب کو نہ صرف پڑھا بلکہ اُن کے حوالے بھی دیئے۔ میرے ڈی لٹ کے تحقیقی مقالے کا خاکہ کچھ اس طرح ہے:

پہلا باب: تانیثیت

1۔ مفہوم
2۔ حدود
3۔ عورت سے متعلق قدیم نظریات
4۔ مذہب اور قانون کا رویّہ
5۔ عورت کی آزادی کا پہلا اعلانیہ انقلابِ فرانس (1792ء)
6۔ تانیثیت کی تحریک (1848ء)
7۔ عورت کی آزادی کا دوسرا اعلانیہ، مکمل آزادی، تعلیم اور تجارت کے مکمل حقوق کا تقاضا، معاوضے کی برابری اور ووٹ کا حق۔
8۔ امریکہ میں عورتوں کو ووٹ دینے کے حق کی منظوری (1930ء)
9۔ عورتوں کے تحفظ کے قوانین۔
10۔ عورتوں سے متعلق یُو این کمیشن (1948ء)
11۔ امریکہ میں عورتوں کی تحریکِ آزادی کا احیا (1960ء کے دہے میں)
12۔ اسقاطِ حمل اور بچّوں کی پرورش کے مراکز، برابری کے حقوق کی ترمیم (1972ء)
13۔ بھارتی سماج میں عورت کا مقام، قانونی حیثیت اور عملی صورتِ حال۔

14۔ حقوق سے متعلق بیداری۔
15۔ اہم انجمنیں اور ادارے۔

دوسرا باب: تانیثیت اور ادب

1۔ عالمی سطح پر
2۔ ملکی سطح پر

تیسرا باب: اُردو شاعری میں تانیثیت، آزادی سے قبل (مختصر جائزہ)

چوتھا باب: آزادی کے بعد اُردو شاعری میں تانیثیت (خواتین شعراء کے حوالے سے)

ادا جعفری، کشور ناہید، پروین شاکر، شفیق فاطمہ شعریٰ، فہمیدہ ریاض، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، رفیعہ شبنم عابدی، بلقیس ظفیر الحسن، شہناز نبی، عذرا پروین، ریحانہ عاطف، صادقہ نواب سحر، فریدہ رحمت اللہ، سارا شگفتہ، شاہین مفتی، صوفیہ انجم تاج، حمیرا رحمانی، نزہت صدیقی، گلنار آفریں، سلطانہ مہر، پروین شیر، اندار شبنم اندو، شاہدہ نسیم سالک، ترنم ریاض، نصرت آراء چودھری، شبنم عشائی، سیدہ نسرین نقاش، رُخسانہ جبیں، زہرہ نگاہ، انوری بیگم، تسنیم عابدی۔

پانچواں باب: اُردو ناول میں تانیثیت

ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا محمد ہادی رسوا، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، صغرا ہمایوں مرزا، نذر سجاد حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، واجدہ تبسم، رضیہ فصیح احمد، صغرا مہدی، ثروت خان، فریدہ رحمت اللہ۔

چھٹا باب: اُردو افسانے میں تانیثیت

نذر سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی، ممتاز شیریں، رشید جہاں، صالحہ عابد حسین، بُشریٰ رحمٰن، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، آمنہ ابوالحسن، ذکیہ مشہدی، واجدہ تبسم، آشا پربھات، قمر جہاں، شمیم صادقہ، نگار عظیم، غزال ضیغم، ترنم ریاض، بانو سرتاج، صادقہ نواب سحر، شکیلہ رفیق، قمر جمالی، سمیرا حیدر، فرحت جہاں، سلطانہ مہر، نعیمہ ضیاالدّین، فرخندہ ضمیر، عائشہ صدیقی، مُحسنہ جیلانی، حمیدہ معین رضوی، نجمہ عثمان، صفیہ صدیقی، کہکشاں انجم، کہکشاں پروین، رینو بہل، فریدہ رحمت اللہ، زنفر کھوکھر، نکہت فاروق نظر۔

ساتواں باب

حاصلِ مطالعہ

کتابیات

....

1989ء میں ہماری ریاست جموں وکشمیر میں میلی ٹینسی کا قہر برپا ہوا۔ آگ اور خون کی اکا دُکا وارداتیں وادیٔ کشمیر میں سامنے آنے لگیں، کئی پڑھے لکھے اور خاص کر کئی اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے نوجوانوں کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیا گیا۔ اُنھیں علم وادب، تہذیب وشائستگی، اخلاق وکردار کی تربیت کے بدلے آگ لگانے، بارُود بچھانے، بندوق چلانے اور دہشت وبربریت کی تعلیم دی جانے لگی۔ امن وسکون انسانی معاشرے سے عنقا ہوگیا اور جب ریاستی سرکار مفلوج ہوگئی تو گورنر راج نافذ کردیا گیا۔ اب فوج اور میلی ٹینٹوں کی باہمی رقابت میں عام آدمی پِسا جانے لگا۔ فوج گھر گھر تلاشیاں لینے اور پوچھ تاچھ کرنے لگی۔ ہر آدمی کو اپنی شناخت کروانے

پر مجبور کیا جانے لگا۔ زندگی سے جڑے رہنے اور ماحول کو سازگار بنائے رکھنے کے لیے شناختی کارڈ کو لازمی قرار دیا گیا۔ بدقسمتی کا عالم یہ کہ چور، غنڈے، بدمعاش، بددیانت اور بدکردار قسم کے لوگ جہاد کے نام پہ سامنے آئے جنھوں نے ڈبل رول ادا کیا۔ وہ میلی ٹینٹوں کا بھی ساتھ دیتے رہے اور فوجیوں کے ساتھ بھی شانہ بشانہ چلتے رہے۔ نتیجہ یہ سامنے آیا کہ شکایتی سلسلہ چل پڑا اور حق و باطل کی شناخت مسخ ہو کر رہ گئی۔ اب ایک عام، بے بس و بے قصور آدمی کی زندگی اُن بددیانت لوگوں کے رحم و کرم پر تھی کہ وہ اُسے سلامت رکھوائیں یا موت کے گھاٹ اُتروادیں!

1992ء میں میلی ٹینسی نے پورے جموں و کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اُس کی روک تھام کے لیے فوج کی مختلف ٹکڑیوں کو جنگلوں، بیابانوں سڑکوں اور چوک، چوراہوں پر تعینات کیا گیا۔ عام لوگوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ شام کے بعد گھروں سے باہر نہیں نکلیں۔ صوبہ جموں کے جن اضلاع کو میلی ٹینٹوں کے ٹھکانے تصور کیا گیا اُن میں راجوری، پونچھ، ڈوڈہ اور اُدھم پور شامل تھے۔ چنانچہ زیادہ تر فوجی اِنھیں علاقوں میں پورے ساز و سامان کے ساتھ بھیجے گئے، اور اُنھیں بڑا چوکس رہنے کی ہدایات دی گئیں۔ بم، ہتھ گولے، راکٹ لانچر اور بندوق کا استعمال انسان پہ ہونے لگا۔ گویا صورت حال انتہائی تشویشناک اور بحرانی دکھائی دینے لگی۔ 1993ء کی بات ہے میری ڈیوٹی گورنمنٹ مڈل اسکول بشٹ (زون چھنینی، ضلع ادھم پور) میں تھی یہ اسکول اُن دنوں بشٹ میں بالکل سڑک کے کنارے تھا (بعد میں مڈل اسکول کا درجہ بڑھا کر ہائی اسکول کر دیا گیا اور آج یہ اسکول ایک دوسری جگہ پہ منتقل کیا گیا ہے) مجھے اچھی طرح یاد ہے، پولیس کا خصوصی عملہ عوامی پوچھ تاچھ کے لیے بشٹ، سُدھ مہادیو، چلیہاڑ، رینگنی، گوری گنڈ اور کٹوالت وغیرہ کے علاقوں میں تعینات کیا گیا تھا۔ میں مانتلائی اپنے گھر سے روز بشٹ میں ڈیوٹی دینے آتا تھا۔ ایک دن اچانک پولیس نے بشٹ میں بس کا گھیراؤ کیا اور تمام سواریوں کو ایک ہی قطار میں کھڑا کرا دیا اور پوچھ تاچھ

کا سلسلہ شروع کردیا۔ سکھ منوہر سنگھ ڈی ایس پی تھا۔ ایک سپاہی نے جب میری شناخت چاہی تو میں نے اُسے بتایا کہ میں اسکول ٹیچر ہوں اور اسی مقام پہ میری ڈیوٹی ہے۔ ڈی ایس پی صاحب کو جب یہ پتا چلا کہ میں ٹیچر ہوں تو مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ تُم اسکول چلے جاؤ۔ بعد میں منوہر سنگھ ڈی ایس پی کے ساتھ میری دوستی ہوگئی۔ اُن دنوں میں اُردو میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ میں نے اُنھیں اردو کے کچھ رسالے پڑھنے کو دیے تو بہت خوش ہوئے۔ وہ تقریباً ڈیڑھ سال تک سدھ مہادیو، ماتلائی، لاٹی دھونہ، گوری گنڈ اور بشٹ وغیرہ کے علاقوں پر چھائے رہے کئی لوگ اُن کے ہاتھوں زدوکوب بھی ہوئے۔

علاقہ مرمت کہ جو میری جائے پیدائش ہے، وہاں میلی ٹینسی عروج پر تھی۔ یہ علاقہ 1992ء میں مکمل طور پر میلی ٹینسی کی زد میں آچکا تھا۔ مجھے انتہائی افسوس ہو رہا ہے کہ 1987ء میں جب میں اپنے آبائی گاؤں بہوتہ کے مڈل اسکول میں مُدرس تھا تو میرے پاس ساتویں اور آٹھویں میں جو لڑکے پڑھتے تھے، اُن میں چند لڑکوں کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیا گیا۔ وہ بعد میں میلی ٹینٹ بنادیئے گئے۔ اُن کی زندگی کے ساتھ کھیلا گیا۔ آج وہ دُنیا میں نہیں ہیں! وہ بے قصور لڑکے کہ جن میں پڑھنے لکھنے کی بہترین صلاحیتیں موجود تھیں اُن کے ساتھ گزارے دن یاد آتے ہیں تو آنکھیں نم ہوجاتی ہیں! جناب رحمت اللہ ڈار کا نُورِ چشم محمد عرفان ڈار کو گزرے کافی سال ہوگئے ہیں، سعداللہ ولد عبدالکریم وانی سکنہ بہوتہ بھی اللہ کو پیارا ہوگیا ہے، مولوی عطا محمد صاحب کا لختِ جگر عبادالرحمٰن ساکنہ روٹ مجھے بے حد عزیز تھا آج دُنیا میں نہیں ہے! خورشید احمد ولد غلام حسین ڈار ساکنہ بہوتہ، نُور محمد ولد غلام قادر ساکنہ بہوتہ کے علاوہ میرے خاندان کے دونو جوان جن میں میرے چچیرے بھائی کا لڑکا زبیر احمد والدِ محمد صادق ساکنہ کھتراڑ اور دوسرا میرے خاندان کا چچیرا بھائی عبدالرّزاق ولد عبدالکریم وانی ساکنہ سروال (بہوتہ) بھی میلی ٹینسی کی آندھی کا شکار ہوا! ان نوجوانوں

کے علاوہ غلام حسن خان ساکنہ گلی (بہوتہ) کو علاقہ مرمت کے چند غنڈوں نے محض شکایت کی بنیاد پر پکڑا اوراپر بہوتہ کے پیچھے دُور پہاڑوں کی طرف لے گئے۔ اُنھوں نے اُسے وہاں پہلے شدید اذیتیں پہنچائیں اور پھر اُسے وہاں گولی ماردی! یہ المناک واقعہ 1998ء میں ہوا جب کہ محمد لطیف وانی ولد غلام محی الدّین ساکنہ اپر سروال (جو محکمۂ تعلیم میں ملازم تھا اور ایک ہاتھ سے معذور تھا) کو فوجیوں نے اتنا زدوکوب کیا کہ وہ بعد میں برین ٹیومر کا مریض بن کے دُنیا سے چل بسا۔ جاوید احمد ولد عبدالغنی وانی ساکنہ لنگدھار (بہوتہ) یہ لڑکا بھی نہایت شریف اور نیک تھا، میں نے اُسے پڑھایا ہے) یہ دونوں باپ بیٹا بھی میلی ٹینٹوں کی گولیوں کا نشانہ بنے! سینکڑوں افراد ہیں جو علاقہ مرمت (ضلع ڈوڈہ) میں فوجیوں اور میلی ٹینٹوں کی باہمی رقابت میں مارے گئے ہیں۔ کئی بے گھر ہوئے اور کئی بے قصور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے! جن گھرانوں کے نوجوانوں کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیا گیا تھا اُن کے افرادِ خانہ کو مختلف طرح کی پریشانیوں سے گزرنا پڑا۔ کئی جیلوں میں بند کیے گئے اور کئی بُری طرح فوج اور پولیس کے ہاتھوں زدوکوب ہوئے۔

1989ء سے لے کر 2001ء تک ریاست جموں و کشمیر میلی ٹینسی کی آگ میں جلتی رہی۔ یہاں کی سرزمین خون سے رنگی گئی۔ وہ ہتھیار کہ جو عہد گذشتہ میں وحشی درندوں کو مارنے کے لیے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ اب اُن سے انسانوں کو مارا جانے لگا! انسانی اقدار نے دم توڑ دیا۔ وحشت و بربریت کا یہ ننگا ناچ ساری دُنیا نے دیکھا۔ تقریباً نو برس تک مسلسل گورنری راج ریاست میں نافذ رہا۔ اس دوران ہزاروں قیمتی جانیں تلف ہوگئیں۔ علاحدگی پسند رہنماؤں نے اپنے بیٹے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے نہ صرف ہندوستان کے مختلف شہروں میں بھیجے بلکہ امریکہ، لندن، دبئ اور فرانس جیسے ملکوں میں بھیجے جب کہ غریب اور بے سہارا لوگوں کے جگر گوشوں کو میلی ٹنیٹ بنوایا! آزادی کے نام پر الجہاد، حذب المجاہدین اور لشکر طیبہ جیسی

تنظیمیں قائم کی گئیں۔ ہر تنظیم کا منشور اور فکری رویّہ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ ان تمام تنظیموں کا عملی رویّہ نہج نبوت ﷺ سے بالکل میل نہیں کھاتا تھا۔ جان کا خراج دین اسلام کی آبیاری، بقا اور فروغ کے لیے آخری خراج ہے۔ دراصل 'اسلام' تمام مذاہب عالم میں ایک سچّا اور اچھا مذہب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دُنیا کا واحد وہ مذہب ہے جو عالمی امن، بھائی چارے کے علاوہ خوشحالی کی ضمانت دیتا ہے لیکن کچھ لوگوں نے اسلام پھیلانے کے لیے تلوار اور بندوق کو اوّلیں اہمیت دی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پہلے ہر شخص اپنے اخلاق و کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا، دین عملی زندگی میں ہوتا۔ صبر و تحمل، خوش مزاجی اور نرم لہجے میں دعوتِ حق دی جاتی تو واقعی اسلام عام ہو جاتا اور کفر و شرک اور بدعات کا خاتمہ ہو جاتا لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ وہ لوگ اسلام کے نام پہ اُٹھ کھڑے ہوئے جنھیں روزہ، نماز، ذکواۃ اور دوسرے بنیادی تقاضائے اسلام سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ سامنے آیا کہ وہ لُوٹ مار کے بعد ایک طرف بیٹھ گئے اور جو واقعی بلند اخلاق اور عالم و فاضل لوگ تھے یا جنھوں نے ہندو مسلمان سے اُوپر اُٹھ کر محض قوم کی خوشحالی کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا تھا وہ قابل احترام ٹھہرے۔

....

1992ء میں مجھے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عملی طور پر سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ مسلمان اُس کو کہتے ہیں جو مسلسل ایمان پہ قائم و دائم رہے اور اپنے نیک اعمال اور نیک نیتی سے سب کو فائدہ پہنچاتا رہے۔ کسی اسکول ریکارڈ، ووٹر لسٹ اور راشن کارڈ میں مسلمان نام ہونے سے کوئی مسلمان نہیں ہوتا ہے۔ مسلمان تو دُنیا میں بادل کی مانند ہوتا ہے جو ہر چیز کو سیراب کرتا ہے۔ اپنے قول و فعل سے سب کا دل جیتتا ہے، صبر و شکر سے کام لیتا ہے، مخلوق کے بدلے خالق کی عبادت کرتا ہے اور محمد عربیؐ کو آخری نبی مان کر اُن کے پاکیزہ اور نُورانی طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے، قرآن حکیم

کی تعلیمات کو محمدؐ کے پاکیزہ اور نورانی طریقوں کے مطابق عمل کرنے کی بلالحاظ مذہب وملّت سب کو دعوت دیتا ہے اور سب سے بڑی اور اہم بات یہ کہ عالمِ انسانیت کا درد رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جان، اُس کا دیا ہوا مال اور وقت اللہ تعالیٰ کی منشا اور نبیؐ کے پاکیزہ طریقوں کے مطابق خرچ کرتا ہے تو اُسے مسلمان کہتے ہیں۔ نام غلام محمد ہو یا حبیب اللہ لیکن شراب پیتا ہو، زنا کرتا ہو، چوری کرتا ہو، جھوٹ بولتا ہو، دھوکہ وفریب دیتا ہو، ہر کسی کا دل دُکھاتا ہو، دُودھ میں پانی ملاتا ہو، ماں بہن کی گالی دیتا ہو، رشوت کھاتا ہو، اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہو، نماز نہیں پڑھتا ہو، روزہ نہیں رکھتا ہو، ذکواۃ نہیں دیتا ہو غرضیکہ تمام بُرے کام کرتا ہو تو وہ مسلمان کہاں ہے؟ عصر حاضر میں برائے نام مسلمانوں کا کردار کیا ہے؟ سب جانتے ہیں۔ دُنیا میں مسلمان کا ایک خاص مقام اور کام ہے۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی کتاب ہے جو رہتی دُنیا تک انسانوں کے لیے نُورِ ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ محمدؐ کی ذاتِ اقدس تمام جہان کے لیے رحمت ہے۔ آپؐ نے ماں کی گود سے قبر کی گود میں جانے بلکہ جنت میں جانے تک انسان کی مکمل رہنمائی کی ہے۔ تمام انسانوں کا خالق و مالک ایک اللہ ہے۔ دُنیا کی مختلف زبانوں میں اُس کے مختلف نام ہیں لیکن اصل میں وہ ایک ہی ہستی ہے۔ جس طرح ایک کمہار کو اپنے سارے بنائے ہوئے برتن بہت پیارے ہوتے ہیں اُسی طرح اللہ تعالیٰ کو تمام انسان بلکہ پوری مخلوق پیاری ہوتی ہے۔ خداوندِ قدوس کی فیکٹری سے ہم سب انسان ایک ہی انسانی سانچے میں ڈھل کر پیدا ہوتے ہیں۔ بچہ جب ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے تو اُس کے ماتھے پہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بُدھ، جین، یہودی اور شعیہ نہیں لکھا ہوتا ہے۔ گویا زمین ایک، آسمان ایک، سورج ایک، چاند ایک، پانی ایک، ہوا ایک، آگ ایک غرضیکہ تمام مظاہرِ فطرت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بانگ دُھل اعلان کر رہے ہیں لیکن انسان سینکڑوں فرقوں میں بٹ چکا ہے۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی کتاب ہے جو نہ

صرف مسلمانوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی ہے بلکہ اس میں بلالحاظ مذہب وملّت تمام رُوئے زمین پر بسنے والے انسانوں کی ہدایت وکامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ قیامت کے روز برائے نام مسلمانوں کا سخت محاسبہ ہوگا۔ وہ اس لیے کہ اُنھیں وراثت میں دین اسلام کی عظیم نعمت حاصل ہوئی ہے، جب کہ غیر مسلم قرآن وحدیث کی عظیم نعمت سے محروم ہیں۔ لہٰذا دین اسلام کی تعلیمات کو عام کرنا، اُس پر خود عمل کرنا اور دوسروں کو بھی عمل کی دعوت دینا مسلمانوں کا ایک اہم فریضہ ہے۔ گویا دین کے معاملے میں مسلمانوں پر دوہری ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ دعوتِ الی اللہ تمام نبیوں کی ایک مستقل سُنت رہی ہے۔ حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر نبی آخرالزّماں حضرت محمد ﷺ تک اور آپؐ کے پردہ فرمانے کے بعد صحابہ کرام، تابعین، تبا تابعین، اولیائے کرام اور بزرگانِ دین غرضیکہ اِن سب برگزیدہ ہستیوں نے عوام النّاس کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کا تعارف کرایا۔ آج برائے نام مسلمان اس اہم فریضے سے دُور ہیں۔ ہم سب رب چاہی زندگی کے بدلے من چاہی زندگی گزار رہے ہیں۔ خدا وندِ قدوس کے احکامات اور محمدؐ کے پاکیزہ اور نُورانی طریقوں سے ہٹ کر ہم زندگی جی رہے ہیں۔ ہمارے قول وفعل میں تضاد ہے۔ دُنیا طلبی اور دُنیا پرستی کے سبب ہم سے تمام اخلاقی وروحانی قدریں چھن گئی ہیں۔ ہمارے اخلاق، ہمارے معاملات، ہمای معاشیات اور عبادات کی لائن میں بگاڑ آچکا ہے۔ مسلمان جب اپنے فرضِ منصبی سے ہٹ گئے تو اُن میں بدعات وخرافات پیدا ہوگئیں۔ آج مسلمان عالمی سطح پر دہشت گرد تصوّر کیا جاتا ہے، گویا غیر مسلم اقوام کی نظر میں مسلمان اور اسلام کے معنیٰ دہشت گردی کے ہیں۔ حالانکہ اسلام امن وسلامتی کا پیغام دیتا ہے۔ دراصل اسلام نیک اعمال سے پھیلا ہے۔ غیر مسلم ہماری تقریروں اور تحریروں کو نہیں دیکھتے ہیں بلکہ وہ ہمارے اخلاق وکردار اور عملی زندگی کو دیکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں قرآن وحدیث کے مطابق اپنا سفرِ حیات طے کرنا چاہیے۔ آج ہم برائے نام مسلمانوں نے اپنا مقصد

زندگی صرف کمانا، کھانا اور سونا بنالیا ہے۔ ہم کلمہ اور نماز رسمی طور پر پڑھتے ہیں۔ روزے کی فضیلت کو دھیان میں رکھ کر روزہ نہیں رکھتے ہیں اور حج میں بھی ہماری غرض سیر وتفریح اور تجارتی ذہنیت سے ہوتی ہے۔ غرضیکہ تمام ارکانِ اسلام کے صحیح طور پر بجا لانے میں ہم کوتاہی اور بے فکری کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہماری دُعائیں قبول نہیں ہوتی ہیں اور کمائی میں برکت نہیں ہے جب کہ ہمارے اسلاف نے دین کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں، وہ اپنے تمام مسائل اور اُلجھنوں کا حل دین میں تلاش کرتے تھے۔ جب ہم دین اسلام سے دُور ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی مدد ہم سے ہٹ گئی۔ ہم کتابِ الٰہی پر غور وتدبر نہیں کرتے، اخلاق رسول سیکھنے اور اپنانے کی تڑپ اپنے اندر پیدا نہیں کرتے کیونکہ ہمیں سائنس، فلسفہ، سیاسیات اور دیگر فنون سیکھنے ہی سے فرصت نہیں ملتی! چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج ہم مذہبِ اسلام سے دُوری کے سبب جہالت، گمراہی اور پستی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ تاریخ اسلام اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ مسلمان دُنیا میں جب تک ایمان کی محنت میں لگے رہے تو حکومت اور سلطنت اُن کے ہاتھ میں رہی، قیصر وکسریٰ کے تاج اُن کے قدموں میں آئے لیکن جب اُن پہ دُنیا کی حرص وہوس سوار ہوئی تو سب کچھ اُن کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ آج ہمیں تقدیر پہ کم اور تدبیر پہ زیادہ یقین ہے۔ قرآن وحدیث سے بے تعلقی اور خداوندِ قدوس کی نافرمانی میں ہمارے شب وروز گزرتے ہیں تو بھلا خدائی مدد کہاں سے آئے گی۔ طاغوتی نظام کو بدلنے کے لیے ایمان کی محنت کو نہجِ نبوتؐ پر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہم ہر کام نبیؐ کی سُنت کے خلاف کرتے رہیں اور خواب دیکھیں اسلامی حکومت کا یہ تب تک ممکن ہی نہیں جب تک ہم پورے کے پورے ایمان میں داخل نہ ہو جائیں۔ پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت ہے لیکن اسلامی حکومت نہیں ہے۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ ایمانیات پر محنت نہیں ہوئی۔ وہاں کے عوامی قلوب پر مغربی فکر وفلسفے کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ وہاں جب ایمان پر محنت نہیں ہوئی تو مسجدیں

بھی مقتل بن گئیں۔ گویا معلوم یہ ہوا کہ ایمان والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ہوتی ہے اور وہ جہاں بھی جائیں گے امن و سلامتی پھیلے گی، جب کہ بغیر ایمان کے شر ہی شر پھیلتا ہے۔ 80 فی صدی مسلمان شادی بیاہوں میں نماز نہیں پڑھتے، یہاں تک کہ ماتمی مجلسوں میں بھی نمازوں کا اہتمام نہیں کرتے، ہاں نماز جنازہ میں شرکت کرنا فرضِ عین سمجھتے ہیں، جب کہ نمازِ جنازہ فرض کفایہ ہے۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ 1992ء میں، مجھے اللہ تعالیٰ نے عملی طور پر اسلام کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی، مطلب یہ کہ میرا دینی شعور اسی سال بیدار ہوا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایمان ایک مستقل محنت کا تقاضا کرتا ہے اور جب دل کی زمین ایمان کے بیج سے زرخیز ہو جاتی ہے تو پھر انسان کو جینے کی لذّت حاصل ہوتی ہے۔ مزید برآں انسان کی نفسیاتی اور روحانی دُنیا جب ایمان کے نُور سے منوّر ہو جاتی ہے تو انسان کو سکون قلب نصیب ہو جاتا ہے جو تمام نعمتوں میں سب سے بڑھ کر نعمت ہے۔ نماز تو میں چھوٹی عمر سے پڑھتا آ رہا تھا لیکن جاندار نماز کیا ہوتی ہے؟ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ میری نماز کی ظاہری شکل یعنی قیام، رکوع، سجدہ اور تشہد دُرست نہیں تھا۔ نماز میں خشوع و خضوع کیسے پیدا کیا جاتا ہے؟ ان تمام اہم باتوں سے میں ناواقف تھا۔ یہاں تک کہ مجھ سے کلمے کے بول بھی زبان سے صحیح طور پر ادا نہیں ہوتے تھے۔ کلمہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ اس کے بنیادی تقاضوں سے بھی میں ناواقف تھا۔ غرضیکہ میری نماز اور روزہ سب فیشن کے طور پر چل رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، آمین!

....

1992ء میں اللہ تعالیٰ نے میرے حال پر رحم فرمایا کہ مجھے اُس نے دعوتِ حق کی عظیم محنت میں لگا دیا۔ حاجی محمد بشیر خان قاضی صاحب چنیوٹ والے اور حاجی عبدالرّشید صاحب چوبڑہ شاپ (اُدھم پور) والے کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان دونوں بزرگ ہستیوں نے مجھے دعوت حق سے متعارف کرایا اور مجھے اللہ

تعالیٰ کی دی ہوئی جان، اُس کا دیا ہوا مال اور اُس کا دیا ہوا وقت اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کرنے کی ترغیب دی۔ اُن دنوں میری ڈیوٹی گورنمنٹ پرائمری اسکول مانتلائی میں تھی۔ غالباً 15 دسمبر 1992ء کو ڈھائی مہینے کے لیے سرد خطوں کے اسکول بند ہو گئے تو میں، جناب ماسٹر محمد اقبال خان قاضی، جناب محمد ایوب شیخ اور حاجی محمد بشیر خان قاضی صاحب کے فرزندِ ارجمند جناب سرفراز خان قاضی ہم چاروں پہلی مرتبہ اپنے تزکیۂ نفس اور دین کے عین مطابق زندگی گزارنے کی عملی مشق کی خاطر چالیس دن کے لیے ایک جماعت کی شکل میں اپنے اپنے گھروں سے چلے گئے۔ ہم سیدھے جموں کی جامع مسجد کھٹیکاں تالاب میں پہنچا دیئے گئے، وہاں سے چند دن پہلے ہی سینکڑوں افراد صوبہ جموں کے مختلف علاقوں میں جماعتوں کی صورت میں بھیج دیئے گئے تھے۔ ہم تقریباً دو دن جامع مسجد کھٹیکاں تالاب میں رہے اور تیسرے دن ہمیں دو الگ الگ جماعتوں کے ذمہ داروں کے حوالے کر دیا گیا۔ جناب محمد ایوب شیخ (جو اس وقت ہائر اسکنڈری اسکول چنہنی میں اُردو کے لیکچرار ہیں) اور جناب سرفراز خان کو محمد امین صاحب (مرحوم) انجینئر ساکنہ بھلیسہ تا حال بھٹنڈی جموں کی جماعت میں بھیج دیا گیا، مجھے اور جناب محمد اقبال خان قاضی کو ڈاکٹر عبدالمجید صاحب ساکنہ بھلیسہ کی جماعت میں بھیج دیا گیا۔ محمد امین انجینئر صاحب کی جماعت نگروٹہ بائی پاس کے علاقے میں کام کر رہی تھی جب کہ ڈاکٹر عبدالمجید صاحب کی جماعت سانبہ اور بڑی برہمناں کے علاقے میں کام کر رہی تھی۔ پہلی مرتبہ جب میں اپنے چار ماہ کے بچے رضاالرحمٰن، اپنی بیوی راشدہ اختر، والدین، بھائی، بہنوں رشتے داروں، خاندان والوں یہاں تک کہ اپنے پورے علاقے سے دُور چلا گیا تو دل میں رشتوں کے درد کی اک ہُوک سی اُٹھی اور یہ احساس بھی ہوا کہ میرا گھر سے محض دین کی خاطر جانا تو وقتی ہے لیکن ملکِ عدم کا سفر دائمی ہے۔ یہاں تو میرے گھر والوں کو میرے واپس آنے کی پوری اُمید ہے مگر سفرِ آخرت سے تو کوئی بھی واپس نہیں آتا! بستر پیٹھ پہ اُٹھائے جب

میں ڈاکٹر عبدالمجید صاحب کی جماعت میں پہنچا تو دن کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ تمام جماعت کے ساتھی مسجد کے احاطے میں ایک دائرے میں بیٹھے قرآن وحدیث کی تعلیم سُن رہے تھے۔ امیر جماعت ڈاکٹر عبدالمجید صاحب اُنھیں تعلیم دے رہے تھے اور کچھ ساتھیوں پہ ایک خاص قسم کی رحمت جسے 'سکینہ' کہتے ہیں نازل ہورہی تھی۔ اپنا بسترِ اور بیگ اپنے ساتھیوں کے سامان کے ساتھ رکھ کر میں بھی تعلیم کے حلقے میں بیٹھ گیا۔ ''فضائل اعمال'' حصہ اوّل پڑھی جارہی تھی، پورے دھیان اور توجہ کے ساتھ تمام جماعت کے ساتھی قرآن وحدیث کی تعلیم سُن رہے تھے۔ حکایات الصّحابہ میں حضرت بلال حبشی کا المناک واقعہ سُنا تو میرا دل نرم پڑ گیا، آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دودو، چار چار حدیثیں فضائل نماز، فضائلِ ذکر، فضائل قرآن، فضائل تبلیغ، فضائلِ درود شریف، فضائل اکرامِ مسلم اور مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج کے حصے میں سے پڑھی جارہی تھیں۔ تقریباً دو ڈھائی گھنٹے تک قرآن وحدیث کی تعلیم فضائلِ اعمال کی صورت میں سُنی تو فکر واحساس کے تمام دروازے کھل گئے۔ اُس کے بعد امیرِ جماعت ڈاکٹر عبدالمجید صاحب نے چھ نمبروں یعنی کلمہ طیّبہ، نماز، علم وذکر، اکرام مُسلم، اخلاص نیت، تفریغِ وقت اور لایعنی سے پرہیز کی وضاحت شروع کردی۔ اُنھوں نے کلمہ طیّبہ کے متعلق سمجھایا کہ کلمہ سے متعلق چار باتوں کو دھیان میں رکھیں۔ پہلی بات یہ کہ کلمے کے بول ہماری زبان سے دُرست طور پر ادا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اس کے معنی کا پتا ہو۔ تیسری بات یہ کہ اس کے مطلب کا علم ہو۔ چوتھی بات یہ کہ اس کے تقاضوں کو جانتے ہوئے ہم اُنھیں پورے کرنے والے بنیں۔ ہر ایک ساتھی سے باری باری کلمہ پڑھایا اور تقریباً سبھی ساتھی کلمہ کے بول صحیح طور پر اپنی زبان سے ادا نہیں کر پا رہے تھے۔ امیر جماعت بار بار کلمہ دُرست پڑھنے کی مشق کرا رہے تھے۔ جب میری باری آئی تو میں نے بھی روایتی طور پر کلمہ پڑھا۔ امیر صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر خود کلمہ پڑھا اور مجھے سمجھانے لگے 'لا' کو لمبا کیجیے محمدؐ کے ح کو حلق

سے نکالیے اور رُسولُ اللہ کے بجائے رَسولُ اللہ کہیے، اعراب کا خیال رکھیے، یہ عربی زبان ہے۔ میں نے دو تین مرتبہ کلمہ پڑھا تو امیر صاحب فرمانے لگے محنت کرنی پڑے گی۔ میرے پسینے چھوٹ گئے، 32 برس زندگی کے رائگاں معلوم ہونے لگے۔ میرا ضمیر مجھ سے پوچھنے لگا کہ تُو پڑھا لکھا ہونے کے باوجود اگر کلمہ طیبہ صحیح نہیں پڑھ پا رہا تو ان پڑھ لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ امیر جماعت نے تمام ساتھیوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی اور کہنے لگے

''دیکھو میرے ساتھیو! کلمہ طیّبہ کے دو جُز ہیں۔ پہلا جز توحید ہے اور دوسرا رسالتؐ۔ کلمہ طیّبہ کا معنی یہ ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے حضرت محمدؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ کلمہ طیّبہ کا مطلب یہ ہے کہ ذرّے سے لے کر پہاڑ تک، قطرے سے لے کر سمندر تک، چیونٹی سے لے کر جبریل علیہ السّلام تک یہ تمام چیزیں یا پھر جو کچھ ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ یہ سب چیزیں ہمیں نفع یا نقصان پہنچانے میں اللہ کی محتاج ہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں ہے''

پھر امیر صاحب نے تاریخی حقائق کی روشنی میں کلمہ طیّبہ کے فیوض و برکات بیان کرتے ہوئے دلائل پیش کیے اور سمجھانے لگے

''میرے ساتھیو! ہمیں کلمہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے اور تعلق پیدا کرنے کی تعلیم دیتا ہے کہ کرنے دھرنے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا ہے۔ کلمہ طیبہ کا دوسرا جز رسالتؐ ہے یعنی محمدؐ کے پاکیزہ اور نورانی طریقوں میں سو فی صدی کامیابی ہے اور اُن کے طریقوں سے ہٹ کر جتنے بھی دوسرے طریقے ہیں وہ سب جہنم میں لے

جانے والے طریقے ہیں۔ آپؐ کی پوری زندگی ہدایت اور رحمت والی زندگی ہے۔ آپؐ نے زندگی کے ہر معاملے میں انسان کی مکمل رہنمائی فرمائی ہے۔''

پھر امیر صاحب سمجھانے لگے

''دیکھیے حضرت موسیٰ علیہ السّلام اللہ کے حکم سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریائے نیل میں کود پڑے اور دریائے نیل نے اُنھیں بارہ راستے دیے، وہ سلامتی کے ساتھ دریا کے پار چلے گئے جب کہ فرعون کو اللہ تعالیٰ نے مع اپنے لشکر کے دریائے نیل میں غرق کر دیا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا باغی تھا جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور اُن کے ساتھی اللہ کی مرضی اور حکم کے مطابق عمل کرتے تھے۔ گویا معلوم یہ ہوا کہ پانی بھی اللہ کے حکم کا محتاج ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو نمرود نے آگ میں جلانا چاہا لیکن آگ میں ڈالنے کے باوجود وہ اس لیے نہیں جلے کہ آگ کو اللہ نے حکم دیا کہ سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا تاکہ میرے خلیل کو گرمی اور سردی کا احساس نہ ہو۔ گویا اس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ میں بظاہر اگر چہ جلانے کی تاثیر موجود ہے لیکن وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی محتاج ہے۔ اسی طرح چُھری میں کسی چیز کو کاٹنے کی صفت موجود ہے لیکن حضرت اسماعیل علیہ السّلام کے گلے پر تیز دھار والی چھری بار بار چلانے کے باوجود اُن کا ایک بال بھی نہیں کاٹ سکی۔ ان تمام عبرت آمیز واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔''

اس کے بعد امیر صاحب دوسرے نمبر یعنی نماز پر آئے کہنے لگے

''نماز سے یہ چاہا جاتا ہے کہ ہماری چوبیس گھنٹے کی زندگی صفت

صلوٰۃ پر آجائے یعنی نماز والی صفت پر آجائے۔ چونکہ نماز میں ہم
ادھر اُدھر نہیں دیکھتے، کوئی بھی بے ہودہ بات نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ
کو حاضر و ناظر رکھ کر نماز ادا کرتے ہیں۔ اُسی طرح ہمیں نماز کے
بعد جو باہر کی زندگی ہے اُس میں بھی دل میں یہ یقین رکھیں کہ اللہ
تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔ نماز ہر عاقل، بالغ مرد و عورت پر وقت کے
اہتمام کے ساتھ فرض ہے۔ نماز کے لیے وضو ضروری ہے۔ وضو
کرتے ہوئے تمام فرائضِ وضو، سنتوں اور مستحبات کا خیال رکھیں اور
جب نماز کے لیے کھڑے ہو جائیں تو چند باتوں کا دھیان رکھیں۔
پہلی بات یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں اور اگر یہ خیال نہ جمے تو کم
از کم یہ ذہن میں رکھیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔ دوسری بات یہ
کہ میرے سامنے خانۂ کعبہ ہے، دائیں جانب جنت ہے اور بائیں
جانب جہنم ہے۔ تیسری بات یہ کہ میں پُل صراط پہ کھڑا ہوں اور
میرے پیچھے ملک الموت کھڑا میری روح قبض کرنے کے لیے تیار
ہے اور یہ میری زندگی کی آخری نماز ہے۔ جب ہم اس فکر و احساس
کے ساتھ نماز پڑھیں گے تو یقینی بات ہے کہ ہمیں نماز میں بیوی، بچے
اور دُکان، روٹی، کپڑا اور مکان کے علاوہ کسی طرح کا کوئی بھی خیال یا
وسوسہ نہیں آئے گا۔ ہر مسلمان پہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ ایک
نماز قضا کرنے کا عذاب دو کروڑ اٹھاسی لاکھ سال جہنم میں جلنا لکھا
ہے۔ اس لیے کسی بھی حالت میں نماز قضا نہ کریں۔ تیسرا نمبر علم و ذکر
ہے، علم ایک راستہ ہے اور ذکر روشنی ہے۔ علم سے یہ چاہا جاتا ہے کہ
ہمارے اندر تحقیق کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ ہر شخص کے لئے اتنا علم
سیکھنا ضروری ہے جس سے اُس میں حلال و حرام کی تمیز پیدا ہو اور

ذکر سے یہ چاہا جاتا ہے کہ ہمیں ہر وقت اللہ کا دھیان نصیب ہو۔ بغیر علم کے انسان اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچان سکتا ہے۔ نماز میں کیا پڑھا جاتا ہے؟ کتنے فرائض، سُنتیں، واجبات اور مُستحبات ہیں یا غُسل و وضو کا سُنتی طریقہ کیا ہے؟ یہ سب جاننے کے لیے علم نہایت ضروری ہے۔ جہاں تک ذکرِ الٰہی کا تعلق ہے اس سے ہمارے دلوں کی صفائی ہوتی ہے، جس طرح کپڑا میلا ہونے کے بعد اُسے صابن سے دھویا جاتا ہے یا لوہے کو زنگ دُور کرنے کے لیے اُسے آگ کی بھٹی میں ڈالا جاتا ہے، اُسی طرح ہمارے دلوں کو بھی زنگ لگتا ہے یعنی گناہ کرتے کرتے سیاہ ہو جاتے ہیں۔ اس سیاہی کو دُور کرنے کے لیے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس لیے صبح فجر کے بعد اور عصر نماز کے بعد تین تین تسبیحات کی پابندی یعنی ایک سو مرتبہ تیسرا کلمہ، ایک سو مرتبہ درود شریف اور ایک سو مرتبہ استغفار بڑے دھیان اور عظمت کے ساتھ پڑھیں تو آپ کو یقیناً سکونِ قلب حاصل ہونے کے علاوہ معرفتِ الٰہی کا نُور بھی حاصل ہوگا، مگر شرط یہ ہے کہ دورانِ تسبیح کسی سے بات نہ کریں۔ تسبیحات کے علاوہ قرآنِ حکیم کی تلاوت اور مسنون دُعاؤں کا بھی اہتمام کریں، یہ سب ذکرِ الٰہی میں آتا ہے۔ چوتھا نمبر اکرامِ مسلم ہے۔ اس نمبر سے یہ چاہا جاتا ہے کہ ہم دوسروں کے حقوق معاف کرتے ہوئے اپنے حقوق ادا کرنے والے بنیں۔ حقوق کی دو قسمیں ہیں، ایک حقوق اُللہ اور دوسرا حقوق اُلعباد۔ پوری دُنیا میں انسان آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ ہر شخص اپنا حق مانگتا ہے، ملازم اور مزدور ایجی ٹیشن کرتے ہیں، بھوک ہڑتال پہ بیٹھ جاتے ہیں۔ فضا میں اکثر یہ نعرہ گونجتا ہے کہ ''ہم کیا چاہتے ہیں؟ اپنا حق''

لیکن دعوتِ حق ہمیں اپنے حقوق معاف کرنے اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کا درس دیتی ہے۔ اگر تمام دُنیا میں بسنے والے انسانوں میں اپنے حقوق معاف کرنے اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی صفت پیدا ہو جائے تو پوری دُنیا امن وسلامتی کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اکرامِ مسلم سے یہ بھی چاہا جاتا ہے کہ ہم علمائے دین کی قدر کریں، بڑوں کی تعظیم کریں اور چھوٹوں پہ شفقت کریں۔ علمائے دین چونکہ انبیاؑ کے وارث ہیں، اُنہی کی وساطت سے دین کا علم ہم تک پہنچا ہے اس لیے ہم اُن کے پاس جا کر پوچھ پوچھ کے فضائل ومسائل معلوم کریں۔ بڑوں کی عزت واحترام اس لیے کریں کیونکہ وہ عمر میں ہم سے بڑے ہیں اور اُنھوں نے ہم سے پہلے اس کائنات کو دیکھا ہے، اُن کا تجربہ ومشاہدہ زیادہ ہی ہوگا۔ چھوٹوں پہ شفقت اس لیے کریں کیونکہ وہ معصوم ہیں اور اُن کے گناہ ہم سے کم ہیں۔ جانوروں کے بھی ہم پہ حقوق ہیں۔ جانور بے زبان ہوتے ہیں، اُن سے کام لینا لیکن اُنھیں پیٹ بھر کر خوراک نہ دینا یا بڑی بے رحمی سے مار پیٹ کر زیادہ کام لینا گناہ ہے۔ اکرامِ مسلم میں عشر وزکوٰۃ اور صدقہ وخیرات بھی آتا ہے۔ دُنیا میں اگر بھوک مری اور مفلسی ونا داری ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ امیر طبقے کے زیادہ تر لوگ صدقہ وزکوٰۃ نہیں دیتے۔ اگر تمام مالدار لوگ زکوٰۃ اور صدقہ دیں تو دُنیا میں مفلس کوئی بھی نہیں رہے گا، سب کو روٹی کپڑا اور مکان نصیب ہوگا۔ پانچواں نمبر اخلاصِ نیت ہے۔ اس سے یہ چاہا جاتا ہے کہ ہم جتنے بھی نیک اعمال کریں وہ محض اللہ کے لیے کریں۔ دکھاوا، نمود ونمائش، ریاکاری اور کسی پر احسان جتانا یہ تمام ذہنی خباثتیں اللہ

تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ اخلاصِ نیت ایک ایسی صفت ہے جو کافی
ریاضت کے بعد انسان کو حاصل ہوتی ہے اور سب سے پہلے بعض
اوقات انسان سے رُخصت ہو جاتی ہے۔ جب ہم اپنے تمام نیک
اعمال محض اللہ کو راضی کرنے کے لیے کریں گے تو پھر ہمارے دل
میں کسی کے لیے شر پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ بُری نیت انسان کو ذلیل
ورُسوا کر دیتی ہے۔ آج دُنیا میں جتنے بھی قتل، ڈاکے، لُوٹ مار، جادو
ٹونا اور کئی طرح کی وارداتیں ہوتی ہیں یہ سب نیت میں بگاڑ کی وجہ
سے ہو رہی ہیں۔ کہتے ہیں قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالتِ عالیہ
میں تین طرح کے آدمی پیش کیے جائیں گے۔ ایک سخی، دُوسرا عالم
اور تیسرا شہید۔ سخی سے اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ میں نے تجھے دُنیا میں
بہت زیادہ مال ودولت دی تھی تُو نے میرے دین کی خاطر کیا کیا؟ وہ
عرض کرے گا اے! باری تعالیٰ میں نے تیرے غریب ومفلس
بندوں کو کپڑے پہنوائے، اُنھیں کھانا کھلاتا رہا اور اُن کا ہر طرح سے
خیال رکھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا نہیں نہیں ہرگز نہیں تُو اپنے بیان میں
جھوٹا ہے کیونکہ تُو نے یہ کام محض اس لیے کیے تھے تاکہ لوگ تجھے سخی
کہیں، سو کہا جا چکا۔ میرے پاس تیرا کوئی بھی حصہ نہیں ہے۔ پھر
فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے گھسیٹ کر جہنم میں پھینک آؤ۔ چنانچہ اُسے
جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ اس کے بعد عالم کو بارگاہِ ایزدی میں
حاضر کیا جائے گا۔ اُس سے اللہ تعالیٰ پوچھے گا میں نے تجھے علم دیا تھا
تُو نے اس سے میرے دین کی کیا خدمت کی؟ وہ کہے گا اے اللہ
! میں نے تیرا علم سیکھا، قرآن لوگوں کو پڑھایا۔ سارا علم، دین کی
آبیاری میں صرف کیا اور اُس پر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا نہیں

تُو نے میرے لیے علم نہیں سیکھا تھا بلکہ تیری علم سیکھنے کی نیت یہ تھی کہ لوگ تجھے عالم اور مُفتی کہیں سو اُنھوں نے تجھے عالم و مفتی کہا۔ یہاں میرے پاس تیرا کچھ بھی حصہ نہیں ہے۔ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے جہنم میں ڈال دو۔ اُسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد شہید کو بلایا جائے گا۔ اُس سے بھی اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ میں نے تُجھے طاقت دی تھی تُو نے اس طاقت سے میرے دین کے لیے کیا کچھ کیا؟ وہ کہے گا اے باری تعالیٰ میں نے تیرے دین کی خاطر اپنی جان گنوا دی لڑتے لڑتے شہادت پائی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا نہیں تُو جھوٹ کہتا ہے۔ تیری غرض تو یہ تھی کہ لوگ تُجھے بہادر کہیں سو دُنیا والوں نے تجھے بہادر کہہ دیا، یہاں میرے پاس تیرا کوئی بھی حصہ نہیں ہے۔ چنانچہ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے گھسیٹ کے جہنم میں پھینک آؤ۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ان تینوں افراد کے ساتھ یہ مایوس کُن سلوک محض نیت میں کھوٹ ہونے کی بنیاد پہ ہوگا۔ اس لیے ایماندار آدمی کو چاہیے کہ اپنی نیت کو ضرور ٹٹولے اور یہ دھیان رکھے کہ میں جو بھی کام کرنے جا رہا ہوں اُس میں کہیں ظاہر داری کا شائبہ تو نہیں، کیا اس میں للّٰہیت ہے کہ نہیں۔ ان پانچ صفات کو اپنی زندگی میں لانے کے لیے چھٹا نمبر تفریغ وقت ہے یعنی یہ وہ نمبر ہے جس کے تحت یہ پانچوں صفات ہماری زندگی میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ تفریغِ وقت کے معنی ہیں وقت فارغ کرنا۔ جب تک نہ ہم اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر اپنا وقت، اپنی جان اور اپنا مال لے کر اللہ کے راستے میں نہیں جاتے تب تک ہمیں مکمل دین پہ چلنا نصیب نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں متذکرہ صفات بھی ہماری زندگی میں نہیں آ سکتی ہیں۔

دراصل ہم جس ماحول و معاشرے میں سانس لیتے ہیں وہ مختلف
برائیوں کا ماحول ہے۔ اُس میں رہتے ہوئے ہم ولی اللہ نہیں بن
سکتے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اُس شیطانی ماحول
سے نکل کر نورانی ماحول میں آجائیں کہ جہاں سوائے اللہ اور اللہ کے
رسولؐ کی باتوں کے اور کسی طرح کے تذکرے نہ ہوں۔ وہ مسجدوں
کے سوا کہیں بھی ممکن نہیں ہے۔ کلمہ، نماز، علم و ذکر، اکرام مسلم،
اخلاصِ نیت، ان پانچوں صفات یا خوبیوں کو حاصل کرنے کے لیے
بزرگوں نے پہلی فرصت میں چار ماہ اور پھر چلّہ، دس دن اور تین دن
کو خصوصی اہمیت دی ہے یعنی جب ایک کلمہ گو پہلی بار اپنے گھر والوں
اور اپنے وطن سے دُور اپنا روپیہ، وقت اور اپنی جان کو مُشقت میں
ڈال کر محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے چار ماہ یا چلّہ کے لیے
جاتا ہے تو اُسے بیک وقت مجاہدے، مشاہدے اور ایک نئے تجربے
سے گزرنا پڑتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ایک مخصوص ماحول میں رہتے
ہوئے اُس میں اپنے آپ کو ڈھالتا ہے۔ اُس میں داعیانہ جذبہ پیدا
ہونے لگتا ہے۔ اب اُسے زندگی کی معنویت اور وقت کی قدر و قیمت
کا احساس ہونے لگتا ہے۔ امیر جماعت کی اطاعت کے آگے وہ اپنی
مرضی کو اہمیت نہیں دیتا۔ غرضیکہ چار ماہ اور چلّہ سے اُس کی زندگی
میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوجاتی ہے۔ چاہ ماہ دین کے مطابق
زندگی بسر کرنے کی عملی مشق کی خاطر ایک شخص کا اپنی مصروفیاتِ دُنیا
سے نکل کر ایک نورانی ماحول میں رہنا اور مخصوص عملیات کے تحت
وقت کا صحیح استعمال انتہائی ضروری اور مفید ہے۔ صاحبِ کشف
لوگوں کا کہنا ہے کہ چار ماہ تین چلّے ہوتے ہیں۔ پہلے چلّے میں انسان

کے دل سے گناہوں کا زنگ اُترتا ہے۔ دُوسرے چلّے میں نورانی رنگ حاصل ہوتا ہےاور تیسرے چلّے میں دین پر چلنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ایک حدیثِ پاک کا مفہوم ہے کہ روزِ محشر میں ایک آدمی تب تک اپنی جگہ سے قدم نہیں اُٹھا سکے گا جب تک وہ چار سوالات کا جواب نہیں دے گا۔ پہلا یہ کہ زندگی کن کاموں میں صرف کی؟ دوسرا یہ کہ جو علم دیا تھا اُس پر کیا عمل کیا؟ تیسرا یہ کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ چوتھا سوال یہ کہ جوانی کہاں لگائی؟ اس لیے ہر شخص اپنے وقت، جان اور مال کا ذمہ دار اور جواب دہ ہوگا''

امیر جماعت کہنے لگے

''دوستو! زندگی آمد برائے بندگی، زندگی بے بندگی شرمندگی، ہم زندگی کی قدر کریں، اسے عیاشیوں اور گناہوں میں نہیں گزاریں''

اُنھوں نے جماعت کے تمام ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

''آپ سبھی چالیس دن کے لیے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہیں۔اس لیے اپنی تکبیرِ اُولیٰ کا خیال رکھیں یعنی ہر نماز امام کے پیچھے پڑھیں، جب امام صاحب اللہ اکبر کہیں تو آپ بھی اُن کے ساتھ اللہ اکبر کہیں۔ حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ جس نے چالیس دن تک نماز تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ پڑھی اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو پروانے ملتے ہیں، ایک جہنم سے چھٹکارے کا اور دوسرا نفاق سے بری ہونے کا۔اس لیے تکبیرِ اولیٰ کا خیال رکھیں کہ فوت نہ ہو''

ظہر نماز کے بعد کھانے کا عمل شروع کیا گیا۔ سب سے پہلے دسترخوان بچھایا گیا پھر پانی رکھا گیا۔امیر جماعت کہنے لگے

''میرے ساتھیو! مسجد میں کھانا پینا ناجائز ہے لیکن اعتکاف کی نیت

کر لینے کے بعد جائز ہو جاتا ہے''

پھر کھانے کے آداب سکھائے گئے۔امیر صاحب کہنے لگے

''ساتھیو! تمام جاندار مخلوق کھاتی ہے لیکن ایمان والے کا کھانا پینا بھی عبادت ہے، بشرطیکہ وہ نبی پاکؐ کے پاکیزہ اور نورانی طریقے پر کھانا کھائے۔ ہمارے کھانے میں بھی چھ نمبروں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ جب ہم کھانا کھانے بیٹھیں تو کلمہ طیبہ کے یقین کے ساتھ کھائیں کہ ہمارے کھانا کھانے سے کچھ بھی نہیں ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔یعنی ہر شخص اس بات کو ذہن میں رکھے کہ یہی کھانا میرے لیے بیماری کا باعث بھی بن سکتا ہے اور میرے لیے صحت کا ذریعہ بھی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ کھانا پینا ہماری ضرورت ہے اور نبی پاکؐ کے نورانی طریقے پر کھائیں۔سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ گٹوں تک دھوئیں اور پھر کلی کریں پھر دسترخوان کے سامنے بیٹھیں۔ بیٹھنے کے بھی دو طریقے ہیں، ایک یک زانو اور دوسرا دوزانو۔ نماز والی صفت کے ساتھ کھانا کھائیں یعنی ماننے کے جذبے سے کھائیں مطلب یہ کہ کھانا اللہ کی نعمت ہے۔کھانے میں عیب نہ نکالیں۔علم رکھتے ہوئے کھانا کھائیں کہ یہ کھانا حرام ہے یا حلال؟ کسی کا حق تو نہیں مارا ہے؟ یا یہ کہیں چوری کر کے تیار تو نہیں کیا گیا ہے؟ غرضیکہ تحقیق کر کے کھائیں۔ اللہ کا ذکر کرتے ہوئے کھائیں۔ الحمد للہ، سبحان اللہ پڑھیں۔ اپنے ساتھیوں کا اکرام کرتے ہوئے کھائیں۔ دودو، تین تین، چار چار ساتھی آپس میں مل کر کھانا کھائیں۔ پہلا لقمہ تین اُنگلیوں سے کھائیں اور کھانا کھانے سے پہلے پانی کے دو تین گھونٹ ضرور پییں۔ پانی پینے کی سات

سُنتیں ہیں۔ سب سے پہلے بسم اللہ، پانی دیکھ کے پییں، سرڈھانپ
کے پییں ، پانی نیچے بیٹھ کے پییں، تین سانسوں میں پییں، پانی
دائیں ہاتھ سے پییں اور ساتویں سُنت الحمدللہ پڑھیں۔ اکرام کے
معاملے میں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ کھانا تین طرح کا ہوتا
ہے۔ ایک اکرامی، دوسرا انصافی، تیسرا ظلمی۔ پلیٹ کے بیچ میں لُقمہ نہ
اُٹھائیں اس لیے کہ بیچ میں اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ دل میں
یہ نیت رکھیں کہ جو کھانا میں کھا رہا ہوں اس سے میرے اندر جو طاقت
پیدا ہوگی اُس سے میں اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کروں گا۔ چھوٹے
چھوٹے لقمے کھائیں۔ کھاتے وقت منہ سے چپڑ چپڑ کی آواز نہ
آئے اور جب کھانے سے فارغ ہوجائیں تو پلیٹ کو بالکل صاف
کرلیں۔ دسترخوان پہ جو دانہ گرے اُسے اُٹھا کے کھالیں۔ حدیث
پاک کا مفہوم ہے کہ ایسا کرنے سے صالح اولاد پیدا ہوتی ہے۔
جب کھانا کھالیں تو دُعا پڑھیں اور ہاتھوں کو دھو کر فارغ ہوجائیں''

کھانا کھانے کے بعد تمام ساتھی امیر صاحب کے حکم کے مطابق ظہر نماز کے لیے وضو کرنے لگے۔ بستی کے لوگ اذان سُن کر مسجد میں آنا شروع ہوئے۔ امیر صاحب اپنی جماعت کے تمام ساتھیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اُنھیں یہ فکر سوار تھی کہ کسی ساتھی کی تکبیرِ اولیٰ فوت نہ ہوجائے۔ مقامی امام صاحب آگے بڑھے اور نماز کی ادائیگی کے لیے تمام مقتدی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب امام صاحب نے سلام پھیری تو ہماری جماعت کا ایک ساتھی چند لمحوں کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا اور اعلان کے طور پر کہنے لگا

''محترم بھائیو، بزرگو اور ساتھیو! اللہ تعالیٰ نے میری، آپ کی اور تمام
دُنیا میں بسنے والے انسانوں کی کامیابی دین اسلام میں رکھی ہے اس
لیے بقیہ نماز کے بعد تشریف رکھیں، ان شا اللہ دین کی بات ہوگی''

بقیہ نماز ادا کرنے کے بعد کچھ لوگ بیٹھے اور کچھ چلے گئے۔ جماعت کا ایک ساتھی دو سُنتیں پڑھنے کے بعد منبر پر جا بیٹھا اور نماز سے فارغ ہونے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا

''تھوڑی دیر کے لیے تشریف رکھیں، منبر کے قریب آ جائیں۔ مل مل کے بیٹھیں۔ ان شاءاللہ بڑے نفع کی بات ہوگی۔ نمازیوں کا خیال رکھتے ہوئے آگے بڑھیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین جب حضورِ اکرمؐ کی بابرکت مجلس میں تشریف لاتے تو اس عقیدت، عظمت اور محبت کے ساتھ آپؐ کی پیاری باتیں سُنتے کہ اگر اُن پر چادر ڈال دی جاتی تو اُس میں جھول پیدا نہ ہوتا۔ آج ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور ہمدردی نہیں رہی ہے، اسی لیے ہماری زندگیاں دین سے عاری ہیں''

جب سب بقیہ نماز کے بعد منبر کے قریب بیٹھ گئے تو ہمارے ساتھی نے کہا

''سب درود شریف پڑھیں''

درود شریف پڑھنے کے بعد اُس نے کہا

''میرے دینی بھائیو! اور بزرگو! اس پوری کائنات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور قدرت سے پیدا فرمایا ہے۔ ہم قدرت کے اس کارخانے میں آزاد نہیں ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا ہے۔ انسان کے لیے قدرت کی بے شمار نعمتوں میں اگر کوئی عظیم نعمت ہے تو وہ ایمان ہے۔ بہت خوش نصیب ہے وہ شخص جس کو دین اسلام کی نعمت نصیب ہو جائے۔ خداوند قدوس نے اعضائے بدنی اور اشیائے خوردنی جیسی نعمتیں سب کو مرحمت فرمائی ہیں لیکن ایمان جیسی عظیم نعمت اُس نے اپنے خاص

بندوں کو مرحمت فرمائی ہے۔اس لیے یہ کائنات اوراس کی ہر شے خدا وند کریم نے انسان کے فائدے کے لیے پیدا فرمائی ہے اور انسان کو اُس نے اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔حضرت محمدؐ آخری نبی ہیں اور اُن کے طریقوں میں سو فی صدی کامیابی ہے۔لہٰذا میرے دوستو! بزرگو اور بھائیو! یہ جماعت جو آپ کی بستی میں آئی ہے، یہ محض نہ صرف قرآن کریم اور نبی اکرم ﷺ کے پاکیزہ اور نورانی طریقوں کو دُنیا میں عام کرنے کی دعوت دیتی ہے بلکہ اُنھیں عملی جامہ پہنانے کی بھی مشق کرواتی ہے۔دُنیا میں چونکہ کفر وظلمت اور گناہ کھلے عام ہو رہے ہیں۔اس لیے اب نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ ہی کوئی نیا دین۔ چنانچہ امرِ بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام یعنی اچھی باتوں کا حکم کرنا اور بُری باتوں سے منع کرنے کی ذمہ داری اس اُمتِ محمدؐیہ کو سونپی گئی ہے۔نبوت کا سلسلہ بند ہو چکا ہے اور کارِ نبوت کا دروازہ قیامت کی صبح تک کھلا رہے گا۔لہٰذا اس اُمتِ محمدؐیہ کی دوہری ذمہ داری ہے، ایک خود دین پر چلنا اور دوسری غیر مسلموں کو دین کی دعوت دینا۔گویا اس اُمت کا تمغۂ امتیاز ہی یہی ہے کہ خیر کی طرف بلاتی ہے اور شر سے منع کرتی ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں اس اُمت کی تعریف فرمائی ہے کہ تُم بہترین اُمت ہو تمھیں لوگوں کی نفع رسانی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔آج برائے نام مسلمان خود دین سے دُور ہیں۔دُنیا کی حرص اور مغربی تہذیب نے اُن میں مختلف طرح کی بُرائیاں پیدا کر دی ہیں۔آج دُنیا میں جتنی بھی برائیاں ہیں یہ سب برائے نام مُسلمانوں کی دین ہیں، چونکہ جب وہ اپنے فرضِ منصبی سے ہٹ گئے تو دُنیا میں کفر، شرک اور بدعات کے علاوہ بہت سی

معاشرتی بُرائیاں پیدا ہوگئیں۔ میرے بزرگو! اور ساتھیو! دُنیا میں دین ہجرت اور نُصرت سے پھیلا ہے۔ ہم نے ہجرت کی ہے، وقتی طور پر اپنے گھروں اور بیوی بچّوں کو چھوڑ کر محض اللہ کو راضی کرنے اور دین کے مطابق زندگی گزارنے کی عملی مشق کے لیے اللہ کے راستے میں اپنا مال، جان اور وقت کی قربانی دے کر آپ کی بستی میں آئے ہیں۔ ہم نہ تو نوٹ چاہتے ہیں اور نہ ووٹ بلکہ ہم اعمال صالح کرنے اور قبر، جو آخرت کی منزلوں میں پہلی منزل ہے اُس میں کامیاب ہونے کی تربیت دیتے ہیں۔ اس لیے آپ حضرات سے ہماری استدعا ہے کہ آپ سب ہمارا ساتھ دیں۔ حدیث کی تعلیم ہوگی، اُس میں بیٹھیں، عصر نماز کے بعد یہاں سے گشت کے لیے جماعت جائے گی اُس میں ہمارا ساتھ دیں۔ ایمان والے بھائیوں سے ہماری ملاقاتیں کروائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کا دین ہر کچے اور پکّے گھر میں داخل ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کہنے اور سُننے سے زیادہ عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین!۔ اس لیے کون کون بھائی ہمارا ساتھ دے گا؟''

چندلوگوں نے حامی بھری۔ یہ نُورانی مجلس برخاست ہوئی امیر جماعت نے ہم تمام ساتھیوں کو قیلولہ کرنے کو کہا (دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد گھنٹہ پون گھنٹہ آرام کرنے یعنی سو جانے کو قیلولہ کہتے ہیں۔ یہ بھی حضورِ اکرمؐ کی سُنت ہے) تمام ساتھیوں نے اپنے امیر جماعت کے حکم کی تعمیل کی اور بستر ے بچھا کر سو گئے۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ہم سب کو نیند سے جگایا گیا۔ تمام ساتھی باوضو ہو کر بعد ازِ ظہر تعلیمِ حدیث (فضائل اعمال، حصہ دوم) میں بیٹھ گئے۔ باری باری تمام ساتھیوں سے حدیث کی کتاب پڑھوائی گئی۔ زکوٰۃ اور صدقات کے فضائل، بزگان دین کی قربانیاں اور اُن کا دین کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے واقعات نے تمام ساتھیوں کو بے حد متاثر

کیا۔امیر جماعت ساتھیوں کی توجہ اور دھیان کے لیے بیچ بیچ میں پوچھتے بھی تھے کہ کیا پڑھا اور کیا سُنا؟ دو گھنٹے مسلسل حدیث کی تعلیم کے بعد سولہ اُصولوں کا مُذاکرہ کیا گیا۔ امیرِ جماعت کہنے لگے

''ساتھیو! اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلنے اور دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں کچھ اُصولوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔اُن اُصولوں کی درجہ بندی اس طرح ہے:

چار کام ایسے ہیں جن میں ہم نے زیادہ وقت لگانا ہے۔ پہلا دعوتِ الی اللہ یعنی اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی دعوت دینا۔دُوسرا تعلیم وتعلّم یعنی سیکھنا اور سکھانا۔تیسرا عبادات وذکر اور چوتھا خدمت۔ چار کام ایسے ہیں جن میں ہم نے کم وقت لگانا ہے۔ پہلا کھانے میں۔ دوسرا سونے میں۔ تیسرا انفرادی ضروریات میں اور چوتھا ضروری بات چیت میں۔ چار کام ایسے ہیں جو ہم نے ہرگز نہیں کرنے ہیں۔ پہلا، دل کا سوال۔ دوسرا زبان کا سوال۔تیسرا بغیر اجازت کے کسی کی چیز کا استعمال نہیں کرنا۔ چوتھا، فضول خرچی۔ چار کام ایسے ہیں جن سے ہم کو پرہیز کرنا ہے۔ پہلا، سیاست سے۔ دوسرا، حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ نہیں کرنا۔تیسرا کسی کے عقیدے کو نہیں چھیڑنا اور چوتھا مسلک اور مسائل پر بحث نہیں کرنا''

نمازِ عصر کی اذان سُنتے ہی امیر جماعت نے سب ساتھیوں کو یہ نورانی مجلس برخاست کرنے کی دُعا پڑھائی اور کہنے لگے

''پیارے ساتھیو! حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ جو مجلس اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ذکر کے بغیر برخاست ہو جائے تو اُس کی مثال ایسی ہے جیسے وہ مردار گدھے کا گوشت کھا کر اُٹھی ہو۔اس لیے اللہ تعالیٰ

ہم سب کو ذکر کی توفیق عنایت فرمائے! آمین ثمہ آمین"

عصر نماز میں امام صاحب نے جونہی سلام پھیری تو ہماری جماعت کا ایک ساتھی فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور محراب کے سامنے ایک طرف یہ اعلان کرنے لگا

"میرے محترم بھائیو! بزرگو! اور ساتھیو! دُعا کے بعد تشریف رکھیں ان شا اللہ فضائل گشت بیان ہوں گے"

اعلان کرنے کے بعد وہ اگلی صف میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد امام صاحب نے دُعا مانگی۔ دُعا کے بعد بہت سے لوگ باہر نکل آئے اور چند لوگ اندر بیٹھے رہے۔ جماعت کا ایک ساتھی منبر پر بیٹھ گیا۔ درود شریف پڑھنے کے بعد اُس نے کہا

"میرے محترم بھائیو اور بزرگو! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ جس اللہ نے ہمیں ابھی تک زندہ رکھا، ہمیں اپنا ایک اہم فریضہ نمازِ عصر باجماعت ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ دوستو! کتنے ہی ہمارے دوست واحباب، خاندان کے بزرگ اور ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں قبروں میں پہنچ گئیں۔ ایک دن ہم بھی ملکِ عدم کی طرف کوچ کر جائیں گے۔ اس زندگی کو قیمتی بنانے کے لیے ایمان کی محنت میں لگ جائیں۔ عصر کا وقت فرشتوں کی تبدیلی کا وقت ہوتا ہے۔ حدیثِ پاک کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر تھوڑی دیر بیٹھنا یا غور وفکر کرنا ساٹھ یا ستر سال کی نفلی عبادت سے افضل ہے۔ دوستو اور ساتھیو! مسجد میں اذان ہوئی ہم نے نمازِ عصر باجماعت ادا کی مگر کتنے ہی ہمارے بھائی بزرگ ایسے ہیں جنھوں نے اذان سُنی اور اُس کے بعد بھی نفس اور شیطان کے دھوکے میں آ کر نماز پڑھنے نہیں آئے۔ اس لیے ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اُن کے پاس اللہ کے دین کی دعوت لے کر جائیں تا کہ وہ بھی مسجد میں آنے

والے بنیں۔ آج ہمارے بھائی دُنیا پرستی اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں خداوند کریم اور رسول پاکؐ کے نُورانی طریقوں سے ہٹ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ دوستو! دُنیا کی ہر چیز گشت کرتی ہے، کسی چیز کی حرکت وعمل کو گشت کہتے ہیں۔ اس لیے ہماری گشت محض دین کی خاطر ہے۔ دین کے لیے جب کوئی جماعت گشت کرتی ہے تو سمندر کی مچھلیاں اور جنگل کے موذی جانور اُس کے لیے دُعائے مغفرت کرتے ہیں۔ یہ کام چونکہ نبیوں والا کام ہے اس لیے اس کے اُصول بھی نہایت اُونچے ہیں۔ اُصول وآداب کے مطابق اگر ہم گشت کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت ہمارے شاملِ حال رہے گی لیکن اگر بے اُصولی کے ساتھ یہ عظیم کام کریں گے تو خدا کی پکڑ آئے گی۔ اس لیے چند اُصول وآداب کو ذہن میں رکھتے ہوئے گشت کریں۔ پہلی بات یہ کہ جس بستی کا گشت کرنا ہو اُس کا ایک مقامی رہبر ہونا چاہیے۔ ایک جماعت کا امیر ہو، ایک متکلّم۔ ان تینوں افراد کو الگ الگ کام سونپا جاتا ہے۔ رہبر کا کام یہ ہے کہ وہ متکلّم کی ملاقات اپنے ایمان والے بھائیوں کے ساتھ کروائے اور جس سے ملاقات کروائے اُسے اچھے نام سے پکارے۔ متکلّم کا کام یہ ہے کہ وہ جب دین کی بات کرے تو جماعت کے تمام ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے قبر وحشر کی بات سمجھائے، انسان کے مقصدِ حیات کو مختصر مگر مُدلّل انداز میں بیان کرے۔ دین کی بات اتنی مختصر بھی نہ کرے کہ اعلان ہو جائے اور اتنی طویل بھی نہ کرے کہ بیان ہو جائے۔ جب متکلم دین کی بات سمجھائے تو سبھی ساتھی بڑی توجہ کے ساتھ اُس کی بات سُنیں۔ امیر کا کام یہ ہے کہ وہ پوری جماعت پر

نظر رکھے اور اگر جماعت ذکرِ الٰہی سے غافل ہونے لگے یا سیاست بگھارنے لگے تو فوراً اُنھیں ذکر کی تلقین کرے یا پھر خود ذکر کرے۔

جب جماعت مسجد سے باہر نکلے تو گشت پر جانے سے پہلے دُعا کرے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ دورانِ گشت چار طرح کی جماعتیں بنائی جاتی ہیں۔ ایک ذکر میں بٹھا دی جاتی ہے اور ایک دُعا میں۔ ایک بستی میں چلی جاتی ہے اور ایک استقبالیہ جماعت ہوتی ہے جو باہر سے آنے والوں کو بڑے ادب واحترام کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے رہبری کرتی ہے۔ گلی کوچوں میں سے جب گشت کرنے والی جماعت گزرے تو تیسرے کلمے کا ورد کرے اور جب بازار میں سے گزرے تو چوتھا کلمہ پڑھتی ہوئی گزرے، راستے میں کوئی تکلیف دہ چیز پڑی ہو تو اُسے ہٹا دیا جائے کیونکہ یہ بھی صدقہ ہے۔ جب واپس مسجد کی طرف آئے تو استغفار پڑھتے ہوئے آئے کیونکہ یہ نبیوں والا کام ہے۔ اس لیے اگر اس میں کوئی بے ادبی یا بے اُصولی ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ سے بخشش چاہی جائے''

فضائلِ گشت بیان کرنے اور اُصول و آداب ذہن نشین کروانے کے بعد دو جماعتیں مقامی رہبروں کے ساتھ پوری بستی میں بھیج دی گئیں۔ مجھے بھی ایک جماعت کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ دونوں جماعتیں مسجد سے باہر آئیں، مجموعی طور پر دُعا کی گئی اور امیر جماعت نے گشت پر جانے والوں کو ہدایت دی۔ اُنھوں نے کہا

''سب ساتھی اپنی اپنی نظروں کی حفاظت کریں اور بڑی فکر و احساس کے ساتھ اس طرح چلیں کہ جیسے ہماری کوئی قیمتی چیز گم ہو چکی ہو اور ہم اُسے ڈھونڈنے نکلے ہوں''

اس میں بھی کیا شک ہے کہ عہدِ حاضر میں اُمتِ مسلمہ دین جیسی عظیم نعمت کھو

چکی ہے۔ جماعت کے ایک ساتھی کو امیرِ جماعت نے مسجد کے ایک گوشے میں بٹھا دیا اور دوسرے کو دُعا کے لیے بٹھا دیا۔ ان دونوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ جب تک گشت کرنے والی جماعت واپس مسجد میں نہیں آتی تب تک آپ مسلسل ذکر کرتے رہیں اور خود امیر جماعت نے بقیہ ساتھیوں اور بستی کے چند افراد کو اپنے قریب بلایا اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور اُس کی ربوبیت کے ساتھ حضرت محمدؐ کے اُسوۂ حسنہ اور نورانی اوصاف بیان کرنے لگے۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد گشت والی جماعتیں پوری بستی کا گشت کر کے واپس آ گئیں۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مغرب نماز کے لئے اذان دی گئی۔ دیکھتے دیکھتے مسجد میں کافی لوگ آ گئے۔ امام صاحب آگے بڑھے اور نماز پڑھانے لگے۔ سلام پھیرنے کے بعد جماعت کا ایک ساتھی اُٹھا اور اُس نے اعلان کیا

> ''میرے محترم بزرگو! بھائیو! اور دوستو! ہم سب کی کامیابی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے احکامات کے ماننے اور نبیٔ اکرمؐ کے پاکیزہ اور نورانی طریقوں کے اپنانے میں رکھی ہے۔ اس لیے بقیہ نماز کے بعد تشریف رکھیں ان شااللہ دین کی بات ہوگی''

سنتوں اور نفلوں کی ادائیگی کے بعد کچھ ہی لوگ مسجد میں دین کی بات سننے کے لیے بیٹھ گئے اور زیادہ تر باہر نکل گئے۔ امیر جماعت منبر پر تشریف لے گئے اور خدا کی حمد وثنا اور محمدؐ پر درود بھیجنے کے بعد اُنھوں نے بڑے مفکرانہ اور مُبلغانہ انداز میں کائنات اور خالقِ کائنات، انسان کے مقصدِ حیات، خداوندِ قدوس کے کلام پاک یعنی مقتضائے قرآن کے علاوہ جنت وجہنم اور دعوتِ حق کی عظیم محنت کی غرض وغایت کو تقریباً ایک آدھ گھنٹے میں بیان کیا تو سننے والے اشکبار ہو گئے پھر چالیس دن، عشرہ اور تین دن کے لیے چند افراد نے اپنے اپنے ناموں کا اظہار کیا۔ آخر پہ دُعا کی گئی اور اس طرح یہ نورانی مجلس برخاست ہوگئی۔ کچھ ہی وقت کے بعد دستر خوان لگا دیا گیا۔ کھانے کے آداب سکھائے گئے اور آداب کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے تمام ساتھی کھانا

کھانے لگے۔کھانا کھانے کے چند لمحوں بعد عشا نماز کے لیے اذان دی گئی۔

نمازِ عشا کے بعد ایک حدیث پڑھی گئی اور اُس کے بعد تمام جماعت کے ساتھی ایک گول حلقے میں بیٹھ گئے اور کارگذاری کا عمل شروع ہوا۔ امیر جماعت جناب ڈاکٹر عبدالمجید نے ہر ایک ساتھی سے پوچھا کہ آج دن میں کیا سیکھا۔ ہر ساتھی نے اپنے اپنے تاثرات اور مشاہدات بیان کیے۔آخر پر سونے کے آداب سکھائے گئے۔ڈاکٹر عبدالمجید صاحب نے میری اور جناب محمد اقبال خان قاضی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

''یہ دونوں ساتھی نئے ہیں۔آج ہی آئے ہیں، باقی ساتھیوں کو اپنے گھروں سے آئے آج پورے دس دن ہو گئے۔اس لیے سونے کے آداب میں خود سکھاؤں گا تا کہ یہ ساتھی بھی سیکھ سکیں''

پھر وہ تمام ساتھیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہنے لگے

''میرے دوستو! اور ساتھیو! اللہ کے نبی حضرت محمدؐ نے انسان کی ہر قدم پہ رہبری و رہنمائی فرمائی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ماں کی گود سے لے کر قبر کی گود میں جانے تک اللہ کے پیارے محبوب جناب آقائے نامدار سردار الانبیا حضرت محمد مُصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بسر کرنے کے تمام پاکیزہ اور نورانی طریقے انسان کو سکھائے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔کھانے کی طرح، سونا اور آرام کرنا بھی ہماری ایک فطری اور نفسیاتی ضرورت ہے۔تمام جاندار مخلوق رات کو سوتی ہے لیکن ایمان والے کا سونا بھی عبادت بن جاتا ہے۔اس صورت میں کہ اگر وہ آنحضورؐ کے نورانی طریقے پر سوئے۔اس لیے جب ہم سوئیں تو نبیؐ کے طریقے کے مطابق سوئیں۔سونے کا سُنتی طریقہ یہ ہے کہ باوضو سوئیں۔سب سے پہلے بستر پہ ہاتھ پھیریں۔ہو سکے تو

بستر پہ بچھی چادر کو اچھی طرح جھاڑیں پھر دایاں پاؤں پہلے بستر پہ رکھیں بایاں بعد میں اور بیٹھ جائیں۔ کوشش کریں سورۂ ملک کی تلاوت کرلیں اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات بھی پڑھیں، الحمد شریف، آیۃ الکرسی، چار قُل اور تسبیح فاطمہ پڑھ کر لیٹ جائیں اور داہنی کروٹ لیٹ جائیں۔ دایاں ہاتھ دائیں گال کے نیچے رکھیں، اکڑ کر نہ سوئیں بلکہ بڑے آرام وسکون سے اپنے پورے جسم کو کھلا چھوڑ دیں۔ بایاں پیر کا انگوٹھا اور بڑی انگلی کے بیچ میں دائیں پیر کی ایڑی کے تھوڑا اُوپر رکھیں۔ سونے کی دُعا پڑھنا نہ بھولیں، دُعا عربی میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ''اے میرے رب! میں آپ کے نام سے مرتا ہوں اور آپ ہی کے نام سے زندہ ہوتا ہوں'' کہا جاتا ہے کہ نیند موت کی بہن ہے۔ اس لیے آدمی جب سوتا ہے تو وہ ایک طرح سے موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے اور روز مرہ زندگی میں ایسے واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں کہ کئی لوگ رات کو سوتے ہیں اور پھر اُنھیں ابدی نیند پڑ جاتی ہے جاگنا نصیب ہی نہیں ہوتا! رات کو اگر کوئی ڈراونا خواب دیکھیں تو کروٹ بدلیں اور تیسرا کلمہ پڑھیں۔ مسجد میں سونا پڑے تو سب سے پہلے اعتکاف کی نیت کرلیں اور اُس کے بعد موٹا کپڑا نیچے بچھا دیں۔ نیند نہ آئے تو درود شریف پڑھ لیں، ان شاءاللہ نیند آئے گی۔ دل میں یہ نیت کریں کہ تہجد پڑھوں گا۔ اگر آنکھیں نہ کھلیں تو ان شاءاللہ تہجد پڑھنے کے برابر ثواب ملے گا کیونکہ انسان کے تمام اچھے اور برے اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ جب جاگیں تو سب سے پہلے دُعا پڑھیں کہ اے میرے اللہ! شکر ہے آپ کا کہ آپ نے مجھے موت کے بعد دوبارہ زندگی عطا

فرمائی۔ اُس کے بعد جو بھی آدمی نظر آئے اُسے سلام کریں اور تھوڑا
سامُسکرائیں پھر اُٹھ کے سب سے پہلے ہاتھ دھوئیں، پھر مسواک
کریں، وضو کریں اور اپنے معمولات میں لگ جائیں''

سونے کے آداب سکھانے کے بعد امیر جماعت نے مجلس برخاست کرنے کی دُعا پڑھائی اور تمام ساتھیوں کو اپنے اپنے بستر لگا کر سو جانے کا حکم دیا۔ رات کے تقریباً پونے چار بجے کے قریب آہستہ آہستہ کوئی میری ٹانگیں دبانے لگا۔ میں یکدم نیند سے جاگ گیا۔ میں نے دیکھا جماعت کا ایک ساتھی تہجد کی بیداری کی ذمہ داری نبھا رہا تھا۔ وہ سب ساتھیوں کو اُن کی ٹانگیں دبا کر جگا رہا تھا۔ جنوری کی یخ بستہ راتیں تھیں۔ کچھ ساتھی مجھ سے بھی پہلے جاگ چکے تھے اور کچھ تہجد پڑھ رہے تھے۔ امیر جماعت گڑگڑاتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگ رہے تھے۔ میں نے بھی وضو کیا اور تہجد کی نماز پڑھنے لگا۔ دل کو رات کی تنہائی میں اطمینان سا ہوا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ کہاں گھر میں فرض نمازوں کو ضائع کر دیتا تھا اور کہاں اللہ نے اب تہجد پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد موذن نے فجر کی اذان دی۔ بستی کے لوگ مسجد میں نماز کی ادائیگی کے لیے آنے لگے۔ امام صاحب کچھ دیر بعد اُٹھ کھڑے ہوئے اور پیچھے مقتدی بھی کھڑے ہو گئے۔ نمازِ فجر کی دو فرض رکعتیں پڑھنے کے بعد ہماری جماعت کا ایک ساتھی فوراً کھڑا ہوا اور تمام نمازیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا

''ایک ضروری اعلان سُنیے، ہم سب کی کامیابی اللہ تعالیٰ نے اپنے
احکامات کے ماننے اور نبی اکرمؐ کے پاکیزہ اور نورانی طریقوں میں رکھی
ہے۔ اس لیے دُعا کے بعد تشریف رکھیں ان شااللہ دین کی بات ہوگی''

دُعا کے بعد امیر جماعت نے تمام ساتھیوں کو منبر کے قریب بیٹھنے کو کہا۔ بستی کے زیادہ تر لوگ دین کی باتیں سُننے کے لیے بیٹھ گئے۔ امیر جماعت نے درود شریف پڑھا اور چھ نمبروں کو بڑے عالمانہ انداز میں بیان کیا۔ وہ بڑے جوش و جذبے کے

ساتھ تمام مجمع کو مقصدِ حیات اور مسلمانوں کی موجودہ پستی کے اسباب اور اُن کا دین کی روشنی میں حل سمجھا رہے تھے۔ بالآخر اُنھوں نے تمام بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا

''کیا ہمیں مرنے سے پہلے مرنے کی تیاری کرنی چاہیے کہ نہیں؟ قبر جو آخرت کی منزلوں میں پہلی منزل ہے، اُسے آرام کا مسکن بنانے کی فکر اور محنت کرنی چاہیے کہ نہیں؟ کیا ہمیں موت سے پہلے اللہ کے دین کی خاطر پہلی فرصت میں چار ماہ کے لیے اللہ کا دیا ہوا مال، اللہ کی دی ہوئی جان اور اللہ کا دیا ہوا وقت اُس کی مرضی کے مطابق خرچ کرنا چاہیے کہ نہیں؟''

سب نے کہا

''جی ہاں''

پھر امیر جماعت نے پوچھا

''اچھا یہ بتائیے کہ موت کب آئے گی''

یہ سُن کر سارے مجمع پہ سناٹا چھا گیا۔ بھلا موت کا کسے علم، کس وقت، کس حال اور کس مقام پہ آئے گی؟ پھر اللہ کے دین پر چلنے اور عملی مشق کے لیے تشکیل ہونے لگی۔ چند افراد نے چلّہ اور تین دن کے لیے اپنے اپنے نام لکھوائے۔ آخر پر امیر جماعت نے بڑے رقت آمیز لہجے میں کُل عالم میں بسنے والے انسانوں کی تندرستی، ایمان اور دُنیا و آخرت کی زندگی میں کامیابی کی خاطر دُعا کی اور اس طرح یہ نورانی مجلس اختتام پذیر ہوئی۔ اس کے بعد جماعت کے تمام ساتھی اپنی اپنی تسبیحات مکمل کرنے میں لگ گئے۔ طلوعِ آفتاب کے کچھ وقت بعد امیر جماعت نے تمام ساتھیوں کو نمازِ اشراق پڑھنے کو کہا۔ سب ساتھیوں نے نمازِ اشراق پڑھی، کچھ ہی دیر بعد خدمت والوں نے دستر خوان لگا دیا۔ تمام ساتھیوں نے اپنے ہاتھوں کو دھویا اور دستر خوان کے آس پاس بیٹھ گئے۔ خدا کا ذکر کرتے ہوئے چائے نوش کرنے لگے۔

جب تمام ساتھی چائے سے فارغ ہوئے تو سب ایک گول دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ امیر جماعت جناب ڈاکٹر عبدالمجید نے مشورے کی کاپی اور پین طلب کیا اور مشورہ کے متعلق تمام اہم امور پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے کہا

''میرے ساتھیو! مشورہ کیا ہے؟ مشورہ کیوں کرنا ہے؟ مشورہ کیسے کرنا ہے؟ اور مشورے کا کیا مقصد ہے؟ ان تمام سوالات کے جوابات پر دھیان دیجیے۔ پہلی بات یہ کہ مشورہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ عمل ہے، وحی کا بدل ہے اور نبی اکرمؐ کی مستقل سنت ہے۔ دوسری بات یہ کہ مشورہ اس لیے کرنا ہے تاکہ ہم بستی والوں پر اتنی محنت کریں کہ وہ بھی اللہ کے راستے میں نکلنے والے بنیں۔ اپنے ساتھیوں پر اس قدر محنت کریں تاکہ اُن کا مال، جان اور وقت اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال ہو۔ تیسری بات یہ کہ مشورہ کرتے وقت ایک گول حلقے میں بیٹھیں تاکہ ہر ساتھی کو تمام ساتھیوں کے چہرے نظر آئیں۔ مشورہ کا ایک امیر مقرر کیا جاتا ہے جو اکثریت یا اقلیت کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔ امیر جماعت جس سے رائے پوچھے وہی ساتھی رائے دے۔ ہر ساتھی دُوسرے کی رائے کا احترام کرے اور دین کے نفع کے لیے رائے دے جس کی رائے مان لی جائے وہ استغفار پڑھے اور جس کی رائے نہیں مانی جائے وہ مایوس نہ ہو۔ مشورے سے پہلے مشورہ کرنا سازش ہے اور مشورے کے بعد مشورہ کرنا بغاوت ہے۔ مشورے میں ماننے کے جذبے سے بیٹھا جائے نہ کہ منوانے کے جذبے سے۔ جس شخص کے ذمے جو کام مشورے میں طے ہو جائے اُسے اُس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اعلان اور خدمت کے لیے ہر ساتھی اپنے آپ کو پیش کرے کیونکہ خدمت سے خدا ملتا ہے۔ مشورہ کرتے

وقت رُوحانی اور جسمانی طور پر حاضر رہیں پوری فکر اور توجہ سے ہر بات سنیں۔ مشورے میں بھی چھ نمبروں کو ملحوظ رکھ کر مشورہ کریں یعنی اپنے آپ کی نفی کر کے بیٹھیں کہ میرے مشورے سے کچھ نہیں ہوگا جب تک اللہ نہ چاہے۔ دُوسرا ماننے کے جذبے سے بیٹھیں۔ تیسرا ذکر کریں اور یہ خیال رکھیں کہ کس چیز کا مشورہ ہو رہا ہے؟ چوتھا اپنے ساتھی کی رائے کو نہ کاٹیں بلکہ بڑے ادب واحترام کے ساتھ رائے دیں۔ پانچواں یہ کہ اپنی نیت کو خالص کر کے رائے دیں، اُس میں آپ کی ذاتی غرض شامل نہ ہو۔ چھٹا یہ کہ مشورے میں جتنے بھی امور طے ہو جائیں اُن کو ہر حال میں انجام دیں۔ مشورہ کا مقصد یہ ہے کہ پورے کا پورا دین پوری حقیقت کے ساتھ عالمِ انسانیت تک پہنچے تاکہ ساری دُنیا کے لوگ امن، خوشحالی اور نیکی کی زندگی گزار سکیں اور مرنے کے بعد اُنھیں جنت نصیب ہو۔ مشورے کی اہمیت وافادیت یہ ہے کہ مشورے سے دل جُڑتے ہیں۔ یہ شر اور ندامت سے بچنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ مشورے میں خیر ہے۔ مشورے کا مقام زندگی میں ایسا ہے جیسا جسم میں ریڑھ کی ہڈی۔ مشورے میں سب کی فکریں مجتمع ہوتی ہیں۔ مشورہ کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت برستی ہے''

مشورے کے آداب، اہمیت وافادیت بیان کرنے کے بعد امیر جماعت نے کاپی پر تمام امور لکھے۔ پہلا، خدمت، دوسرا اعلان، تیسرا تعلیم قبل ظہر، چوتھا، ظہر پر دین کی بات، پانچواں تعلیم بعد ظہر، چھٹا عصر پر فضائل گشت، ساتواں، مغرب پر دین کی بات، آٹھواں محاسبہ، نواں متفرق آداب، دسواں تہجد کی بیداری کی ذمہ داری اور گیارھواں فجر پر چھ صفات کا مذاکرہ۔ ہر ساتھی کو تقریباً کوئی نہ کوئی ذمہ داری سونپی

گئی۔تعلیم قبل ظہر کا وقت تین بجے دن کو رکھا گیا۔اس سے پہلے تمام ساتھیوں کو آرام کرنے اور انفرادی ضروریات پوری کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔پورے نو بجے تمام ساتھی مسجد میں ایک جانب گول دائرے میں بیٹھ گئے اور امیر جماعت نے فضائل اعمال (حصہ اوّل) کی تعلیم کے آداب سکھاتے ہوئے کہا

''میرے ساتھیو! حدیث کی تعلیم سُننے کے بھی آداب ہیں۔سب سے پہلے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی عظمت کو دل میں رکھیں بالفاظِ دیگر کتاب اور صاحب کتاب کی عظمت کے ساتھ حدیث سُنیں یعنی کتاب اللہ کی ہے اور صاحب کتاب ہم تک پہنچانے والے حضور اکرمؐ ہیں۔دوزانو بیٹھیں۔دھیان اور توجہ سے سُنیں۔کتاب یا پھر کتاب پڑھنے والے کی طرف دیکھیں۔جہاں حضورؐ کا بابرکت نام آئے تو صلی اللہ علیہ وسلم کہیں۔جہاں کسی نبی کا نام آئے تو علیہ السّلام کہیں۔جہاں صحابی کا نام آئے تو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہیں اور جہاں کسی ولی اللہ کا نام آئے تو رحمت اللہ علیہ کہیں۔جب جنت کی نعمتوں کا اور باغوں کا ذکر سُنیں تو خوش ہو جائیں اور جب جہنم کا ذکر آئے تو چہرے پر مایوسی کے آثار نمودار ہوں۔تعلیم قبل ظہر کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔پہلے حدیث کی تعلیم پھر قرآنی حلقے اور آخر پر چھ صفات یا چھ نمبروں کا مذاکرہ۔سب سے پہلے فضائلِ قرآن سے متعلق چند حدیثیں پڑھی جاتی ہیں پھر قرآن کے حلقے لگائے جاتے ہیں جن میں کلمہ، الحمد شریف، درود شریف، التحیات اور دس سورتیں دُرست کروائی جاتی ہیں اور اس کے بعد حکایاتُ الصّحابہ، فضائلِ نماز، فضائل علم و ذکر اور مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج والے حصے میں سے چار چار حدیثیں اور اُن کی وضاحت پڑھی جاتی ہے اور آخر پر چھ نمبروں کا

مذاکرہ ہوتا ہے''

حدیث کی تعلیم کے آداب بیان کرنے کے بعد فوراً اُصول وآداب کے تحت تعلیم قبل ظہر شروع کی گئی۔ جماعت کا ایک ساتھی جس کے ذمہ حدیث کی تعلیم تھی، فضائل اعمال کے حصہ قرآن میں سے حدیثیں پڑھنے لگا اور امیر جماعت اُن کا معنی ومفہوم ساتھیوں کو ذہن نشین کرواتے ہوئے کہنے لگے

''دوستو! اس حدیث کی تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہمارا دل تاثر لینے والا بنے۔ وعدے اور وعیدوں کے ذریعے ہمارے دل میں جنت کی طلب پیدا ہو جائے اور جہنم سے بچنے کا خوف پیدا ہو''

تھوڑی دیر کے بعد قرآن کے حلقے لگائے گئے۔ تین تین، چار چار ساتھیوں کو حلقوں میں بٹھا دیا گیا جو دُرست قرآن پڑھنا جانتے تھے اُن کو نہ جاننے والوں کی اصلاح اور دُرست پڑھانے پر مامور کیا گیا۔ میں بھی ایک حلقے میں بیٹھ گیا۔ ہم چار ساتھی تھے جن میں سے ایک ساتھی کے تین چلّے لگ چکے تھے، وہ ہم تینوں کا کلمہ، درود شریف اور التّحیات دُرست کرا رہا تھا۔ جب کلمہ پڑھنے کی میری باری آئی تو میں بڑی فکر اور دھیان کے ساتھ کلمہ پڑھنے لگا لیکن میری اصلاح وقت لگائے ساتھی نے کی۔ اُس نے مجھے کہا

''آپ آہستہ سے کلمہ پڑھیں''

پھر جب اُس نے مجھ سے الحمد شریف سُنی تو اُس میں بھی کافی غلطیاں نکالیں، تب میرے پسینے چھوٹ گئے۔ انتہائی پشیماں ہوا۔ اپنی گذشتہ زندگی پہ کفِ افسوس ملنے لگا! پھر اُس نے مجھ سے سورۂ اخلاص سُنی تو اُس میں بھی غلطی نکالی۔ وہ کہنے لگا

''دیکھیے آپ کُل پڑھ رہے ہیں جب کہ قُل پڑھنا ہے۔ نعوذ باللہ آپ تو یہ پڑھ رہے ہیں کہ کھاؤ اُس اللہ کو جو اکیلا ہے''

اب مجھے اپنی حیثیت کا مکمل پتا چلا کہ میں عربی کتنی صحیح پڑھتا ہوں۔ اُس ساتھی

نے کہا

''بہتر رہے گا کہ آپ نورانی قاعدہ خرید کر پڑھیں''

تقریباً ایک آدھ گھنٹے کے بعد امیر جماعت بولے

''میرے ساتھیو! حلقے توڑو اور حلقہ جوڑو''

تمام ساتھیوں نے فوری طور پر اُن کے حکم کی تعمیل کی اور ایک ہی گول دائرے میں بیٹھ گئے، پھر امیر جماعت نے فرمایا

''میرے دوستو! اور ساتھیو! یہ جو ابھی قرآن کے حلقے لگائے گئے تھے، ان میں کسی کو شرمندہ کرنا یا کسی کا امتحان لینا مقصد نہیں تھا بلکہ ان کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہمیں یہ احساس ہو جائے کہ ہم قرآن پاک کتنا غلط یا صحیح پڑھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اپنی بیماری کا پتا چل گیا۔ ان قرآنی حلقوں میں بیٹھنا ہمارا ایکسرے تھا۔ اس لیے چالیس دن یا چار ماہ میں کوئی حافظ قرآن تو نہیں بن سکتا، البتہ اب ہمیں چاہیے کہ جب ہم اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں تو کسی عالم اور حافظ یا قاری سے اپنا قرآن دُرست کروائیں۔ یاد رکھیے یہ قرآن کے حلقے مسجد نبویؐ کے اندر بھی لگتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین آپؐ سے قرآن سیکھتے تھے۔ علمائے کرام سے سُنا کہ نماز کی حالت میں کھڑے ہو کر قرآن پڑھنے پر ایک حرف پہ سو، نیکیاں۔ بیٹھ کر پچاس۔ بغیر نماز کے باوضو ہو کر پچیس اور بغیر وضو کے پڑھنے پر دس نیکیاں اور جو صرف سُننے تو ہر حرف پہ ایک نیکی کا ثواب ملتا ہے۔ شکر ہے اللہ کا کہ اُس نے ہمیں یہ توفیق عنایت فرمائی''

قرآنی حلقوں کے بعد حدیث کی تعلیم شروع ہوئی۔ حکایات الصّحابہ، فضائلِ

نماز، فضائلِ ذکر، فضائلِ تبلیغ، فضائل درود شریف اور مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج جیسے تمام ابواب میں سے تین تین، چار چار حدیثیں اور اُن کی صراحت ووضاحت پڑھ کر سُنائی گئی۔ اس کے بعد چھ نمبر کا مذاکرہ ہوا۔ امیر جماعت نے ہر ایک ساتھی کو کھڑا کر کے ایک ایک نمبر پر بولنے کو کہا۔ کلمہ، نماز، علم وذکر، اکرام مسلم، اخلاصِ نیت اور تفریغِ وقت ان تمام صفات کی وضاحت ہو رہی تھی۔ جب مجھے کھڑا ہو کر بولنے کو کہا گیا تو میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ دین کی باتیں کسی مجلس میں بولنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے انسان کو مکمل واقفیت ہونی چاہیے۔ میری زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور پھر ہمت کر کے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ امیرِ جماعت نے حوصلہ بڑھایا اور شاباشی دی اور پھر نیچے بیٹھنے کو کہا۔ میں نیچے بیٹھ گیا۔ پھر وہ کہنے لگے

> ''میرے ساتھیو! دین سیکھنا، دین کی باتیں کرنا اور دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے علاوہ دین کی دعوت دینا اُمتِ مسلمہ کا فرضِ اوّلیں ہے۔ اس لیے ہر ایک ساتھی خوب بولے تاکہ آپ کو دین کی باتیں بولنا آجائے''

چھ صفات کی مشق اور اُن کی تعلیم کے بعد امیر جماعت نے متفرق آداب یعنی کھانے، پینے، سونے، مسجد کے آداب، بیت الخلا کے آداب اور روانگی کے آداب سکھائے۔ مسجد کے آداب کے بارے میں اُنھوں نے سکھایا کہ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ اس لیے جب ہم مسجد میں داخل ہوں تو دُعا پڑھ کر داخل ہوں۔ دُعا عربی میں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ

> ''اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے''
>
> اور جب باہر نکلیں تو یہ دُعا پڑھ کر نکلیں کہ
>
> ''اے اللہ میں تیرے فضل کا طلبگار ہوں''

مسجد میں دُنیا کی باتیں کرنا، دوڑنا، تھوکنا، کھڑکیوں سے باہر جھانکنا یا تھوکنا،

مسجد کی کسی چیز کے ساتھ چھیڑنا یا کپڑے لٹکانا یہ سب ممنوع ہے۔ یہ تمام حرکتیں گناہ خیال کی جاتی ہیں۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ بغیر اجازت کے مسجد میں اذان دینا یا امامت کرانا ہمارے دعوتی کام اور ضابطوں کے خلاف ہے۔ بیت الخلا اور روانگی کے آداب سمجھاتے ہوئے اُنھوں نے بتایا

''میرے ساتھیو! رحمتِ عالمؐ نے قدم قدم پہ انسان کی رہبری ورہنمائی فرمائی ہے، یہاں تک کہ بیتُ الخلا میں جانے کے آداب اور حاجتِ بشری سے فارغ ہونے کا سُنتی طریقہ بھی آپؐ نے سکھادیا ہے۔ جب ہم بیتُ الخلا میں داخل ہوں تو دُعا پڑھیں اور بایاں پاؤں پہلے داخل کریں اور پھر دایاں۔ پانی کا انتظام پہلے ہی دیکھ لیں۔ بیٹھنے کا مخصوص انداز ہے، اُسی کے مطابق بیٹھیں۔ پان، بیڑی، سگریٹ غرضیکہ کوئی بھی چیز نہ پئیں، نہ کھائیں نہ چبائیں۔ باہر سے کوئی آواز دے یا اپنی طرف متوجہ کرے تو بالکل کوئی جواب نہ دیں، البتہ تھوڑی سی کھانسنے کی آواز پیدا کریں۔ سخت جگہ پہ پیشاب نہ کریں۔ اپنے کپڑوں کو ناپاکی سے بچائیں۔ پیشاب کی چھینٹوں سے بچیں۔ اگر باہر جانا پڑے یعنی کھلے میدان میں تو کسی کی آڑ لے کر بیٹھیں۔ اپنے ستر کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ کسی بھی سُوراخ میں پیشاب نہ کریں، ہوسکتا ہے اُس میں کوئی سانپ، بچھو یا اور کوئی کیڑا آرام فرما رہا ہو۔ مٹی کے ڈھیلے کا استعمال ضرور کریں اور جب آپ بیتُ الخلا سے فارغ ہوں تو دُعا پڑھیں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ کسی سایہ دار پیڑ کے نیچے اور ہری ہری گھاس پہ پیشاب نہ کریں۔ میرے ساتھیو! روانگی کے بھی آداب ہیں۔ ہمارا یہ چالیس دن کا سفر اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی سُنتوں کے مطابق ہونا چاہیے۔

اس لیے جب ہم ایک بستی کو چھوڑ کر دوسری بستی میں جائیں تو سب سے پہلے اپنا سامان اچھی طرح باندھ لیں۔ جس مسجد میں ہم قیام کریں اُسے پہلے سے بہتر حالت میں چھوڑ کر جائیں یعنی اچھی طرح جھاڑو ماریں، صفائی کا خاص خیال رکھیں، ہر چیز کو صحیح ترتیب اور سلیقے سے رکھیں۔ مسجد کی کوئی بھی چیز ہمارے ساتھ نہ جائے اور نہ ہی ہمارے ساتھی کی چیز مسجد میں رہے۔ جب جماعت مسجد سے باہر نکلے تو سب اپنا اپنا سامان دیکھ لیں۔ دو دو ساتھی جوڑیوں میں چلیں، جو ساتھی سب سے آگے ہوں وہ کمزور اور ضعیف لوگوں کا خیال رکھیں اور اتنا تیز نہ چلیں کہ جماعت مختلف حصوں میں بٹ جائے۔ راستہ چلتے وقت بھیڑ کی صورت میں نہ چلیں۔ مسجد سے نکلنے کے بعد تقریباً بیس قدم تک استغفار پڑھیں اور یہ احساس دل میں رکھیں کہ ہم پہ بستی والوں کا جو حق تھا اُسے ہم ادا نہیں کر پائے۔ خدمت کا سامان یعنی برتن وغیرہ جن ساتھیوں کے سپرد کیا جائے وہ اُسے ذمہ داری سے دُوسری بستی تک پہنچائیں۔ یہ نہیں کہ میں نے آپ کو دیا اور آپ نے کسی دُوسرے ساتھی کو دیا اور اس طرح نہ میں نے اُٹھایا اور نہ دُوسرے ساتھی نے اور وہ کہیں اور ہی جگہ پڑا رہ گیا، بلکہ پوری ذمہ داری اور خوشنودی سے اُسے دُوسرے مقام تک پہنچائیں۔ تمام ساتھی ایک دوسرے کو سیکھتے، سکھاتے چلیں۔ اپنی نظروں کی حفاظت کریں اور جب گاڑی میں سفر کرنا پڑے تو صرف دو ساتھی گاڑی کے اوپر چڑھ کر سامان کو بڑے اچھے طریقے سے رکھیں۔ بڑوں کا ادب کریں۔ اُنھیں پہلے سیٹوں پر بٹھائیں۔ گاڑی میں سوار ہونے کی دُعا پڑھ لیں۔ زور سے بولنے اور چیخنے کی عادت سے احتراز کریں۔

جب دوسری بستی میں پہنچیں تو بستی میں داخل ہونے کی دُعا پڑھیں۔
جب مسجد شریف نظر آئے تو درود شریف پڑھیں اور پھر مسجد میں داخل ہونے سے پہلے باہر ہی دُعا کریں۔ اس کے بعد تمام ساتھی اپنا سامان مسجد کے ایک کونے میں بڑے اچھے ڈھنگ سے رکھیں اور اگر زوال کا وقت نہ ہو تو دو رکعت نماز تحیّۃ المسجد پڑھیں اور فوراً مشورے میں جڑیں''

ایک ہفتے کے بعد ہی مجھے اعلان کرنے، ظہر اور عصر پر فضائلِ گشت وفضائل ذکر بیان کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ شروع شروع میں، میں چھ صفات کی حدود میں نہیں رہنے لگا بلکہ ادھر اُدھر کی سُنانے لگا۔ دین کی بات کرنے کے بعد امیر جماعت جناب ڈاکٹر عبدالمجید صاحب بڑی حلیمی سے میری اصلاح فرماتے۔ کون سی بات میں نے مناسب کی اور کون سی غیر مناسب پھر دلائل دیتے ہوئے سمجھاتے کہ دین کی بات کرتے وقت بڑی ہوشیاری برتنے اور محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے میں نے خصوصی ملاقاتیں کرنا، مغرب نماز کے بعد بڑے مجمع میں ایمان کی بات کرنا سیکھ لیا۔ اپنے لیے کھانا پکانا اور کپڑے دھونا میں نے دعوتِ حق کی عظیم محنت میں لگنے سے پہلے ہی سیکھ لیا تھا مگر دعوتی اُصولوں نے مجھ میں خود اعتمادی اور بلند ہمتی پیدا کی۔ اب ہر ہفتے میں جماعت کے کسی نہ کسی ساتھی کے ساتھ تقریباً پندرہ افراد کا کھانا تیار کرنے اور چائے پلانے پر مقرر کیا جانے لگا۔ گویا مجھ کو اپنے ساتھیوں کی خدمت کرنے کا موقع ملا۔ برتن مانجھنا اور اسٹوپ پر کھانا تیار کرنا میرے لیے ایک کڑی آزمائش تھی۔ بہ فضلِ اللہ تمام ساتھی سیر ہو کر کھانا کھاتے اور مجھ جیسے معمولی آدمی کو ایک اچھا اور کامیاب باورچی کہتے۔ کپڑے دھونے کا سُنّتی طریقہ کیا ہے؟ یہ مجھے دعوتِ حق کی محنت میں لگنے سے معلوم ہوا۔ تقریباً پندرہ دن تک میں امیر جماعت ڈاکٹر عبدالمجید صاحب کی جماعت کے ساتھ سانبہ اور اُس کے مضافاتی علاقوں میں

تزکیۂ نفس اور روحانی عرفان وآگہی کا متلاشی بنا چلتا رہا۔ جب ڈاکٹر عبدالمجید صاحب کی جماعت کے افراد کا چلّہ پورا ہوا تو وہ مجھ سے رُخصت ہوگئے۔ اُس کے بعد میں، جناب ماسٹر محمد اقبال قاضی، جناب محمد ایوب شیخ لیکچرار اور جناب محمد سرفراز کو تقریباً ایک ہفتے کے لیے کشمیر کی جماعت کے ساتھ مرکز کے ذمہ داروں نے جوڑ دیا۔ یہ جماعت چلّے کی تھی اور دہلی سے واپس آکر اب کشمیر جانے کی تیاری کر رہی تھی لیکن فی الحال جموں کے محلّہ جھلاکاں میں کام کر رہی تھی۔ ہم چار افراد اس جماعت کے ساتھ تقریباً ایک ہفتے تک رہے۔ اس جماعت کے امیر کشمیر کے ایک بُزرگ تھے جن کی صحبت میں رہ کر میں نے رُوحانی اسرار ورموز سیکھے۔ ایک ہفتے کے بعد ہم تقریباً گیارہ آدمیوں کو محمد امین انجینئر صاحب کی امارت میں دہلی (مرکز بنگلے والی مسجد) بھیج دیا گیا، چونکہ ابھی ہمارا چلّہ پورا ہونے میں بیس دن کم تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جموں سے دہلی کی جانب جانے والی ریل رات کو تقریباً آٹھ بجے روانہ ہوئی تھی اور ریل پر سوار ہونے سے پہلے امیر جماعت جناب محمد امین انجینئر نے ہم سب ساتھیوں کو اپنی زرّیں ہدایات سے نوازا تھا۔ اُنھوں نے ریل پہ سوار ہونے سے پہلے ہم سب ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا

> ''میرے ساتھیو! ہم سب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ایک مخصوص وقت کے لیے اپنے گھروں کو چھوڑ آئے ہیں۔ اس لیے بڑی فکرمندی اور توجہ کے ساتھ امیرِ جماعت یعنی جماعت کے ذمہ دار کا کہنا مانیں۔ اب ہمیں ریل پہ سوار ہونا ہے۔ آپ کو ریل میں طرح طرح کے لوگ ملیں گے، کسی سے کوئی فالتو بات نہ کریں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ریلوں میں چور، ڈاکو، جیب کترے، چرسی اور شرابی ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنے سامان اور ایمان کی خود حفاظت کریں۔ ایک ساتھ چڑھیں

اور ایک ساتھ اُتریں۔ ہر ساتھی دُوسرے ساتھی کا خیال رکھے“

ہم اپنے امیر جماعت کی ہدایات کے مطابق ریل میں سوار ہوئے تھے اور ساری رات ریل چلتی رہی تھی۔ سانبہ، کٹھوعہ، پٹھانکوٹ، لکھن پور، انبالہ، جالندھر اور سارا پنجاب طے کرنے کے بعد غازی آباد، میرٹھ وغیرہ سے ہوتے ہوئے ہم صبح دہلی پہنچ گئے تھے۔ دہلی جیسا وسیع اور گنجان آبادی والا شہر دیکھ کر میں محوِ حیرت رہ گیا تھا۔ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر اُترتے ہی امیر جماعت نے تمام ساتھیوں کو کھڑے کھڑے ایک گول دائرے کی صورت میں دُعا کے لیے متوجہ کیا۔ تمام جہان میں بسنے والوں کے لیے امن وسلامتی اور ایمان کے مطابق زندگی گزارنے کی دُعا کی اور اُس کے بعد دہلی کی لوکل بس میں سوار ہو کر ہم سب بستی نظام الدّین کی طرف روانہ ہو گئے۔ تھوڑے ہی وقت کے بعد ہم بنگلے والی مسجد میں پہنچ گئے۔ بنگلے والی مسجد پوری دُنیا میں تبلیغِ اسلام کا مرکز تصور کی جاتی ہے۔ مسجد کے گیٹ پر پہنچے تو وہاں کے دو آدمیوں نے ہمارے امیر جماعت سے دریافت کیا کہ یہ کہاں کی جماعت ہے؟ اُنھوں نے جموں وکشمیر کی جماعت کہا تو فوراً رہبروں نے تمام ساتھیوں کو مسجد کی دوسری منزل پر پہنچایا اور ایک جگہ سامان رکھوایا۔ پھر ہم تمام ساتھیوں کو دوپہر کا کھانا کھلانے کے لیے تہہ خانے والی منزل میں لے گئے۔ ایک بہت بڑے ہال میں تقریباً ڈیڑھ سو آدمی کھانا کھا رہے تھے اور بڑے اچھے طریقے پر بغیر شور کے سبھی کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ہم بھی کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ گوشت اور نان کھانے میں مجھے جو لذت حاصل ہوئی تھی اُسے آج تک نہیں بھول پایا ہوں۔ وہاں کا بابرکت کھانا کھا کر مجھے ایک طرح کا اطمینان سا محسوس ہوا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم اوپر آ گئے کہ جہاں اکثر بزرگ عالم وفاضل وعظ ونصیحت کرتے رہتے ہیں۔ ہائے! اُن بزرگ ہستیوں کی صحبت میں بیٹھنا اور اُن کی بصیرت افروز باتیں سُننا کسی خوش نصیب ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ مولانا انعام الحسن صاحب دامت برکاتہم اپنے حجرے میں رہتے تھے اور اُنھیں ہفتے میں ایک

دو بار حجرے سے باہر لا کر عوام کے دیدار کرائے جاتے یا پھر جب جماعتیں مختلف ملکوں اور ریاستوں میں بھیجی جاتیں تو تب اُن سے دُعا و مصافحہ کروایا جاتا۔ اُن کے چہرے کی نورانیت پر عام آدمی کی نظر نہیں ٹکتی تھی۔ اُن کے علاوہ مولانا عمر پالن پوری صاحب، مولانا سلیمان صاحب (جو 2009ء میں عمرہ کرنے کے دوران احرام باندھے سجدے کی حالت میں اللہ کو پیارے ہوگئے) قاری ظہیر احمد صاحب، مولانا یعقوب صاحب، منشی بشیر احمد صاحب اور مولانا داؤد صاحب جیسے اہم اور قابل قدر بزرگوں کی دینی خدمات نے دعوت حق کے سلسلے میں عالمی اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ تمام بزرگ اُس دور میں حیات تھے، اب یہ سبھی اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ قاری ظہیر احمد صاحب انتہائی مزاحیہ طبعیت کے تھے۔ جب دعوت کی محنت کے اُصول و آداب اور اس کی اہمیت و عظمت سمجھاتے تو پورے مجمع پر نظر رکھتے۔ سامعین کا دل چاہتا کہ وہ اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں حق کی دعوت دیتے رہیں اور وہ سُنتے رہیں۔ مولانا سلیمان صاحب سینکڑوں افراد پہ مشتمل مجمع کو بڑے دلگداز اور نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہتے

"'مولانا الیاس رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جو شخص بنگلے والی مسجد میں
آنے کے بعد یہاں کے چھ کاموں میں نہ جڑے وہ گھر سے اپنے
آپ کو یہاں آیا ہوا نہ سمجھے"

اور اکثر یہ شعر دہراتے رہتے ؎

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

تقریباً تین دن تک ہماری جماعت مرکز نظام الدّین میں ٹھہری۔ تمام جماعتیں بنگلے والی مسجد کے مین گیٹ سے داخل ہو کر اُوپر کی منزلوں میں اپنا سامان بڑے سلیقے سے رکھتیں۔ جہاں امام صاحب، امامت کرتے تھے وہ پہلی منزل تھی اور مولانا الیاس رحمتہ اللہ علیہ نے اسی جگہ سے تبلیغ دین کی شروعات کی تھی۔ مسجد کے صدر

دروازے کے ساتھ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد پانی کا ایک خوب صورت حوض ہے جہاں نمازی وضو کرتے ہیں اور صفوں میں بیٹھتے ہیں۔ وعظ و نصیحت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے اور تمام امور وقتِ مقررہ کے مطابق انجام دیے جاتے ہیں۔ میں نے مولانا عمر پالن پوری صاحب کو کئی مرتبہ بہت قریب سے دیکھا اور سُنا ہے۔ اُنھوں نے تقریباً دُنیا کے سبھی ملکوں میں دین اسلام کا پیغام پہنچانے میں اپنی تمام عمر صرف کی ہے۔ وہ جب فجر نماز کے بعد بنگلے والی مسجد میں انتہائی نرم اور شریں زبان میں ایمان والوں کو دعوتِ اسلام کی عظمت و اہمیت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں سمجھانے لگتے تو سامعین کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ دُنیا کے مختلف ملکوں کی جماعتیں ہر سال تبلیغِ اسلام اور روحانی فیوض و برکات حاصل کرنے کے لیے مرکز بنگلے والی مسجد میں آیا کرتی ہیں۔ مولانا محمد الیاس رحمتہ اللہ علیہ کے دور سے یہاں ہزاروں لوگ دو وقت کا کھانا مُفت میں کھاتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بنگلے والی مسجد کی عمارت اُس زمانے میں کُل پانچ منزلوں پر مشتمل تھی جب کہ آج اس میں بڑی تبدیلی لائی گئی ہے آج یہ نو منزلوں پہ مشتمل ہے اور جدید طرز کی عمارت ہے جس میں بہ فضلِ اللہ جماعتوں کے قیام و طعام کے علاوہ تمام سہولیات موجود ہیں۔

دوسرے دن ہماری جماعت کا رُخ طے کیا گیا۔ ہمیں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، اوکھلا انکلیو، بستی ابوالفضل اور جمنا نگر کے علاقوں میں اپنا تبلیغی سفر طے کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی جامع مسجد میں ہماری ملاقات جناب فاروق احمد انجینئر سے ہوئی۔ وہ بھی تقریباً چار ماہ کے لیے اللہ کے دین کی آبیاری کی خاطر گھر سے نکل آئے تھے۔ اُن کا تعلق اُوڑی ضلع بارہمولہ (کشمیر) سے ہے۔ وہ انتہائی ذہین اور باصلاحیت، متقی اور راتوں کو اللہ کے آگے رونے دھونے والے ہیں۔ دعوتِ اسلامی کے اصول وآداب سے بخوبی واقف ہیں۔ ناچیز کو اُن سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میرا حافظہ میرا ساتھ دے رہا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی

جامع مسجد میں اجتماع تھا جس میں ایک نومسلم انگریز اپنی کارگزاری انگریزی میں سُنا رہا تھا اور دوسرا آدمی اُس کے بیان کی اُردو میں ترجمانی کر رہا تھا۔ یہ نومسلم جو اپنے والدین، بھائی، بہنوں، خاندان اور پوری تہذیب وروایات کو ترک کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہوا تھا، سرتاپا نبی اکرمؐ کی سُنتوں کو اپنائے ہوئے تھا۔ بقول اُس نو مسلم کے ''اسلام، دُنیا کا واحد وہ مذہب ہے جس میں تمام انسانوں کی کامیابی، سلامتی اور بھلائی موجود ہے''

ہمارا چلّہ پورا ہونے میں ابھی تقریباً دس دن باقی تھے اور ہماری جماعت بستی ابوالفضل نئی دہلی میں کام کر رہی تھی کہ جناب ماسٹر محمد اقبال خان قاضی کی ٹانگ میں درد پیدا ہوا اور وہ دوسرے دن واپس اپنے گھر چلے آئے۔ اب میں، جناب محمد سرفراز خان اور جناب محمد ایوب کے علاوہ بھلیسہ اور جموں کے چند ساتھی جماعت میں رہے۔ تقریباً ہر ساتھی گشتوں، ملاقاتوں اور دوسرے دینی امور میں حصہ لیتا تھا۔ چلّہ پورا ہونے سے دو دن قبل ہم دوبارہ مرکز نظام الدّین چلے آئے تھے۔ یہاں پہنچ کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ عصرِ حاضر کے ایک جیّد عالم و فاضل اور مفکرِ اسلام جناب مولانا وحید الدّین خان اسی بستی میں رہتے ہیں۔ میں اُن کا نام اور اُن کا معروف رسالہ ''الرّسالہ'' اور اُن کی چند کتابیں طالب علمی کے زمانے میں پڑھ چکا تھا۔ چنانچہ مجھے اُن سے بالمشافہ ملاقات کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ مرکز بستی نظام الدّین کی بنگلے والی مسجد سے تقریباً نو بجے دن کو امیرِ جماعت جناب محمد امین انجینئر سے رُخصت لے کر میں باہر آ کر مولانا وحید الدّین خان صاحب کے دولت کدے کی تلاش میں نکل پڑا۔ اُن کے گھر کا پتہ معلوم کرتے ہوئے جب میں اُن کی عالیشان کوٹھی پہ پہنچا تو گیٹ پر ایک سپاہی کھڑا تھا۔ میں نے مولانا وحید الدّین خان صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اُس نے میرا نام و پتہ معلوم کیا اور پھر اندر جا کر مولانا وحید الدّین خان صاحب کی اجازت لی اور مجھے گھر میں آنے کو کہا۔ مولانا وحید الدّین خان

صاحب اپنی آرام گاہ سے اُٹھ کر میرے پاس باہر آئے۔ بالکل سیدھے سادے لباس میں ملبوس، سفید داڑھی، سر پر افغانی ٹوپی، نورانی چہرہ اور پورے وجود میں متانت، نفاست اور ایمانی حرارت موجود تھی۔ اب میرے سامنے ایک ایسی قد آور اور مایہ ناز شخصیت کھڑی تھی جس نے زندگی کو فضولیات ولغویات سے بچا کر محض دینِ محمدیؐ کی آبیاری اور اشاعتِ اسلام کے لیے وقف کر رکھا تھا، مزید یہ کہ جس نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے نہ صرف موجودہ مسلمانوں کو بلکہ غیر مسلموں کو بھی خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی ہر ممکن کوششیں کی ہیں۔ میں نے اُن سے اسلام، تقدیر، کفر اور مسلمانوں کے عروج وزوال اور دعوتِ اسلام سے متعلق متعدد سوالات کیے، تو اُنھوں نے بڑے واضح دلائل کے ساتھ جوابات دیئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ میری اُن سے گفتگو چلتی رہی، پھر میں اُن سے رُخصت ہوا اور اُن کے کتب خانہ پر تشریف لایا۔ میں نے اُن کی تحریر کردہ تصانیف دیکھیں۔ اسلامیات پر اُن کی نادر کتب نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ تقریباً دینیات کے ہر موضوع اور پہلو پر اُنھوں نے اپنی عالمانہ استطاعت کے مطابق کتابیں لکھی ہیں۔

دوسرے دن ہم مرکز بنگلے والی مسجد (بستی نظام الدّین) سے رُخصت کر دیئے گئے۔ بزرگوں نے ملک کے طول وعرض سے آئی ہوئی اُن تمام جماعتوں کو جن کے چلّے اور چار مہینے پورے ہو چکے تھے اور اب واپس اپنے اپنے علاقوں کی طرف جا رہی تھیں، سب کو ایک بڑے ہال میں جمع فرما کر دعوت کی عظیم محنت میں لگے رہنے کے اُصول وآداب سمجھائے اور زندگی کو قرآن وحدیث کے مطابق بسر کرنے کی تلقین کی۔ مرکز سے رخصت ہونے کو کسی بھی ساتھی کا دل نہیں چاہتا تھا۔ رات کو ہم جموں جانے والی ٹرین پہ سوار ہوئے اور صبح جموں ریلوے اسٹیشن پہ پہنچ گئے۔ ذمہ داروں کے مشورے کے مطابق ہم کو گوجر نگر کی جامع مسجد میں ٹھہرایا گیا۔ یہاں اور بھی جماعتیں جو جموں کے مضافاتی علاقوں میں کام کر کے اب واپس اپنے علاقوں کی جانب جا رہی

تھیں ٹھہرائی گئی تھیں۔ فجر نماز کے بعد ماسٹر اسحاق صاحب بھدرواہی نے انسان کے مقصدِ حیات اور صحابہ کرامؓ کے دینی جذبے پر بڑے پُراثر انداز میں تقریر کی تھی۔ تمام ساتھیوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ زندگی کی اصل حقیقت اور اُس کی معنویت کا پورا خلاصہ اُنھوں نے بڑے مُدلّل انداز میں ذہن نشین کرایا تھا۔ تقریباً دس بجے دن کو ہم سبھی ساتھیوں کو ذمہ دار حضرات نے اپنی آخری ہدایات کے ساتھ رُخصت کیا تھا اور تمام ساتھی ایک دوسرے سے گلے مل کے رو رہے تھے، ایک دوسرے سے معافیاں مانگ رہے تھے۔ محبت، خلوص اور دین داری کے جذبے سے سرشار یہ قافلہ اب آخری پڑاوٗ پہ تھا۔ چالیس دن کا یہ دینی تربیتی کورس جس کا تعلق براہِ راست حق شناسی، خود احتسابی اور تذکیۂ نفس سے تھا، تمام ساتھیوں کے دلوں اور چہروں کو ایمان کی حرارت سے منوّر کر چکا تھا۔ ہم تین ساتھی یعنی میں، جناب سرفراز خان قاضی اور جناب محمد ایوب شیخ چوپڑہ شاپ مسجد میں آئے اور یہاں پر باضابطہ طور پر محترم حاجی عبدالرّشید صاحب (ضلع اُدھم پور کے امیر جماعت) نے اجتماعی طور پر ہماری کارگزاری لی۔ شام کو ہم تینوں مغرب نماز پہ جامع مسجد چھنی میں پہنچے۔ دلوں میں اطمینان اور سکون تھا۔ مغرب نماز کے بعد ہم اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے پورے چلّے میں امیرِ جماعت جناب ڈاکٹر عبدالمجید، اُن کے بعد جناب محمد امین انجینئر اور پھر مرکز کے بزرگوں نے تمام ساتھیوں کو اپنے اپنے علاقوں میں چھ کام پابندی سے کرنے کی تلقین کی تھی۔ پہلا کام، کسی ایک نماز کے بعد چلّہ لگائے ساتھی مل بیٹھیں اور یہ مشورہ کریں کہ آج کس ایمان والے بھائی سے ملاقات کریں تاکہ وہ بھی اپنی جان، اپنے وقت اور مال کو اللہ تعالیٰ کے احکامات اور محمدؐ کے پاکیزہ طریقے کے مطابق صرف کرنے والا بنے۔ دوسرا کام، حدیث کی دو جگہوں پہ تعلیم ایک مسجد میں اور دوسری اپنے گھر میں۔ تیسرا کام، ہر روز ڈھائی گھنٹے کی ملاقاتیں جو محض دینی شعور پیدا کرنے اور اخلاقی نوعیت کی ہوں۔ چوتھا کام، ہفتے میں

ایمان کی نسبت پر دو گشتیں ایک اپنی بستی میں اور دوسری پڑوس کی بستی میں۔ پانچواں کام، ہر مہینے میں تین دن اللہ کے دین کی خاطر وقف کریں۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں اکثر بزرگوں کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ ایمان والے کے ستائس دن ٹبر (اپنے اہل وعیال کے لیے) کے لیے اور تین دن قبر کے لیے مخصوص ہونے چاہیں۔ چھٹا کام، ہر سال میں دُنیا اور آخرت کی کامیابی کے لیے اللہ کے دین کی خاطر چالیس دن کے لیے اپنے بیوی بچّوں، خاندان والوں، رشتے داروں، ملازمت اور تجارت یہاں تک کہ اپنے ماحول سے دُور رہ کر مساجد کی نورانی فضا میں ایک مخصوص عمل اور نظم وضبط کے تحت رہا جائے تاکہ ایک بگڑا ہوا شخص راہِ راست پر آجائے اور اُس میں خدا اور رسولؐ کی محبت پیدا ہو سکے۔ بہر حال ہم چند ساتھی دعوتِ اسلام کی محنت میں لگے رہے۔ الحمدللہ دعوتِ حق سے اور بھی لوگ جُڑتے چلے گئے۔ قصبہ چھنی کی جامع مسجد میں کہ جہاں کسی زمانے میں میری اہلیہ کے تایا کہ جو بابو کے نام سے مشہور تھے اور پیشے سے درزی تھے، پنجگانہ نمازی تھے۔ وہ اذان دینے کے بعد جب بستی کا کوئی بھی شخص نماز پڑھنے نہیں آتا تھا تو وہ اکیلے نماز پڑھ کے اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ میں نے خود اس مسجد میں دو تین آدمیوں کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ الحمدللہ جب دعوت وتبلیغ کی محنت کا یہاں آغاز ہوا تو اُس کے خوشگوار اور عمدہ اثرات پڑے۔ اب یہاں جامع مسجد سے ملحق ایک دینی مدرسہ بھی ہے۔ یہاں کے ایمان والوں کی زندگی میں ایک طرح کا انقلاب برپا ہوا ہے۔ اب اس مسجد میں ہر نماز پہ تقریباً چالیس، پچاس آدمی اللہ کے آگے سربسجود ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ باضابطہ طور پر اتوار کو دین کی نسبت پر گشت ہوتی ہے۔ فجر نماز کے بعد مشورہ ہوتا ہے اور تمام دینی امور اُصول وآداب کے مطابق انجام دیئے جاتے ہیں لیکن اس سب کے ہوتے ہوئے بھی ابھی دعوت وتبلیغِ اسلام میں لگے افراد کو نہایت صبر وتحمل، خلوص اور استقامت سے کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اسلام کی تبلیغ میں طنز ورمز اور ایک

طرح کی نشتر زنی نہایت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنے اچھے اور بُرے اعمال کے لیے ذمہ دار ہے۔ کسی پہ طنز و رمز کرنا نیکی برباد، گناہ لازم والی بات ہے۔

....

1994ء میں میرا دوسرا چلّہ جون، جولائی کے مہینے میں بھوپال میں لگا۔ اُن دنوں میری ڈیوٹی گورنمنٹ مڈل اسکول بشٹ میں تھی اور چھنی زون میں کُل چار اسکول ایسے تھے جو سردیوں میں کھلے رہتے تھے اور گرمیوں کے دو مہینوں میں بند رہتے تھے، یہ اسکول تھے مڈل اسکول بشٹ، پرائمری اسکول پیشٹی، پرائمری اسکول مانڈل اور گورنمنٹ مڈل اسکول بائیں۔ ہم چھنی سے دو ساتھی میں اور محمد سلیم شیخ چالیس دن کے لیے اللہ کے دین کی دعوت کے اُصول و آداب سیکھنے اور اپنے نفسانی خواہشات پہ قابو پانے کی خاطر گھروں سے چلے گئے تھے۔ ہماری جماعت کا رُخ جامع مسجد گوجر نگر جموں سے بھوپال کے لیے طے ہوا تھا۔ اس جماعت میں زیادہ تر طالب علم تھے جو دسویں اور بارہویں جماعت کے امتحانات دینے کے بعد اب گرمیوں کی چھٹیوں میں اللہ تعالیٰ کے دین کے مطابق زندگی گزارنے کی عملی مشق کی خاطر جماعت میں نکل چکے تھے۔ ماسٹر محمد صدیق صاحب ساندی (ضلع سانبہ) والے ہماری جماعت کے امیر مقرر کیے گئے تھے۔ وہ بہت شریف اور کم زبان تھے۔ جموں سے ہم ٹرین میں سوار ہو کر دہلی مرکز بستی نظام الدّین بھیج دیئے گئے اور تین دن وہاں قیام کرنے کے بعد بھوپال کے لیے روانہ ہو گئے۔ تقریباً چودہ افراد پہ مشتمل یہ جماعت جس میں زیادہ تر بہت زیادہ باغی اور سرکش مزاج کے نوجوان تھے کہ جنھوں نے اپنی سرکشی کے باعث نہ صرف اپنے والدین بلکہ اپنے محلے اور علاقے کے لوگوں کا جینا حرام کر دیا تھا، اس لیے والدین نے انھیں دعوتِ حق کے ذمہ داروں کے حوالے کیا ہوا تھا۔ دہلی سے ہم بھوپال جانے والی ٹرین پہ تقریباً گیارہ بجے دوپہر کو سوار ہوئے تھے۔ جھانسی، گوالیار، چمبل گھاٹی کے علاوہ کئی اور مقامات سے ہماری ٹرین گزرنے کے بعد تقریباً رات

کے بارہ بجے بھوپال پہنچ گئی تھی۔ بھوپال جیسے نوابی اور تاریخی شہر میں رہنے اور اسے دیکھنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔ بھوپال کی مہمان نوازی نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ تقریباً ہر مذہب اور فرقے کے لوگ وہاں آباد ہیں۔ وہاں کی تاریخی مسجد ''تاج المساجد'' دیکھ کر مجھے انتہائی مسرت اور حیرانی کا احساس ہوا تھا۔ دعوت وتبلیغ اسلام کا عظیم الشان اجتماع ہر سال بھوپال شہر میں ہوتا ہے۔ چالیس دن کا یہ دعوتی سفر ہم نے بھوپال میں ہی طے کیا تھا۔ بھوپال کے ایک حیاسوز منظر کو میں شاید کبھی بھی نہ بھول پاؤں گا۔ اُس حیاسوز منظر کی یاد آتے ہی یہ سوچ کے حیران رہ جاتا ہوں کہ اس دُنیا میں آدم کی اولاد کتنے ہی خرافات اور واہیات رسموں، رواجوں اور عقیدوں کو لے کر اپنی دُنیا وآخرت برباد کرتی ہے۔ بھوپال میں ہماری جماعت کا قیام تقریباً چار دن سے ایک بہت بڑی مسجد میں تھا جو چوراہے والی مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ یہ مسجد تقریباً چار منزلہ تھی اور واقعی ایک چوراہے پر واقع تھی۔ جمعہ کا دن تھا مسجد میں نمازیوں کی بہت بھیڑ تھی۔ امام صاحب سے خطبہ سننے اور اُن کے پیچھے دو فرضوں کی ادائیگی کے بعد مقتدی سُنتوں اور نوافل سے تقریباً فارغ ہو رہے تھے کہ اتنے میں ڈھول اور باجے کی سُریلی آواز کے ساتھ لوگوں کے قہقہے اور شور وغل سُنائی دیا۔ مسجد تقریباً خالی تھی صرف جماعت کے ساتھی اور اکّا دُکّا بوڑھے آدمی ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ میں، امیر جماعت جناب ماسٹر محمد صدیق اور محمد سلیم شیخ کے علاوہ جماعت کے چند ساتھیوں نے مسجد کی دوسری منزل کی کھڑکیوں سے جونہی نیچے جھانک کر دیکھا تو پہلی فرصت میں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا جس میں سب سے آگے دو آدمی الف ننگے تھے اور اُن کے ہاتھوں میں مور پنکھ تھے۔ اُن کے سیاہ لمبے بال اور سیاہ لمبی داڑھیاں تھیں۔ چند معزز قسم کے لوگ جھک جھک کے اُنھیں پرنام کر رہے تھے۔ ہجوم کے ساتھ ساتھ عورتیں اور جوان لڑکیاں بھی اُن الف ننگے آدمیوں کو دیکھ کر ہنسی کے فوارے کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ یہ ہجوم سرِ بازار

گزر رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے یہ ہجوم ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا پھر ہم نے وہاں کے ایک مقامی بزرگ سے اس عجیب وغریب معاملے کی تحقیق چاہی تو معلوم ہوا کہ ہر سال اسی مہینے میں ان لوگوں کا یہ جلوس نکلتا ہے کہ جس میں دو آدمیوں کو الف ننگے سرِ بازار پھرانے کے بعد اُنھیں ایک مندر میں چھوڑ آتے ہیں! حیران ہو جاتا ہوں کہ انسان اس علمی اور سائنسی ترقی یافتہ دور میں بھی کتنی بھونڈی اور واہیات قسم کی رسموں اور عقیدوں کو لے کے جی رہا ہے۔

پورے چالیس دن ہماری جماعت بھوپال میں رہی تھی۔ وہ نوجوان کہ جو اپنے والدین کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے تھے۔ اب ایک مخصوص رُوحانی ماحول اور دینی واخلاقی تربیت میں رہتے ہوئے اپنی تمام خرمستیوں کو بھول چکے تھے اور اُن میں بہت حد تک خوفِ آخرت، دین کا شوق اور شرافت وسنجیدگی کا عنصر پیدا ہو چکا تھا۔ چالیس دن کے بعد جب ہم سب ساتھی ایک دوسرے سے رُخصت ہوئے تو ہماری پلکوں پہ آنسولرز رہے تھے اور دلوں میں جدائی کا غم!

....

1995ء میں مجھے دعوتِ اسلام کی عظیم محنت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے مدھیہ پردیش کے ضلع خرگون اور اندور میں کام کرنے کی توفیق عنایت فرمائی، یہ میرا تیسرا چلّہ تھا۔ تقریباً بارہ افراد پہ مشتمل ہماری جماعت کا رُخ اُدھم پور سے طے کیا گیا تھا اور جناب عبدالرّشید صاحب چوپڑہ شاپ والے کے چھوٹے بھائی جناب محمد بشیر کو امیرِ جماعت مقرر کیا گیا تھا۔ اس جماعت میں زیادہ تر اُدھم پور اور جموں کے ساتھی تھے۔ جون، جولائی کے مہینے میں ہم مدھیہ پردیش جیسے گرم علاقے میں جا رہے تھے۔ انتہائی گرمی کی وجہ سے خصوصی ملاقاتیں کرنا، گشت کرنا اور حدیث کی تعلیم میں بیٹھنا کسی حد تک دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ اسی چلّے میں، میں نے آنکھوں میں سرمہ لگانے، تیل لگانے اور کپڑے پہننے کا سُنتی طریقہ سیکھا تھا۔ ہمارے امیرِ جماعت جناب محمد بشیر

نے ساتھیوں پہ بہت محنت کی تھی۔ ضلع خرگون (مدھیہ پردیش) کی جامع مسجد میں جمعہ پر مجھ جیسے معمولی آدمی کے ذمہ عوام کو دعوتِ حق کی عظمت اور اس کی اہمیت ذہن نشین کرانا طے پایا تھا۔ میں نے تقریباً ایک ہزار آدمیوں کے مجمع میں انسان کے مقصدِ پیدائش اور مظاہرِ فطرت کے حوالے سے دین کی بات کی تھی۔ میں نے صحابہ کرامؓ کے دینی جذبے اور اُن کی جاندار نماز کے حوالے سے یہ کہا کہ صحابہ کرامؓ اپنے مطالبات نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے پورے کرواتے تھے۔ جب اُن پہ کوئی بھی پریشانی آتی تھی تو فوراً وضو فرماتے اور دو رکعت نماز صلوٰۃ الحاجت پڑھتے اور پورے یقین، دھیان اور اخلاص سے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے اور اس طرح اُن کی دُعا قبول ہو جاتی۔ ایک بار صحابی کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا، گھر میں کئی سال کی پرانی چکّی پڑی ہوئی تھی۔ بیوی پریشان تھی، صحابیؓ نے وضو کیا اور مسجد میں جا کر دو رکعت نماز صلوٰۃ الحاجت پڑھی اور اُس کے بعد گھر میں آئے تو پوچھا کہ کیا کھانے کا کوئی انتظام ہوا؟ بیوی نے کہا نہیں۔ وہ پھر نماز پڑھنے گئے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید میری نماز میں کوئی کسر رہ گئی ہوگی، واپس آئے تو بیوی سے پوچھا کہ کیا اللہ نے کھانے کا کوئی بندوبست کیا؟ بیوی نے نفی میں جواب دیا۔ صحابیؓ نے تیسری مرتبہ نماز پڑھی اور اللہ سے رو رو کے دُعا مانگی، واپس گھر میں آئے تو آٹے کی چکّی بہ فضل اللہ چل رہی تھی اور آٹے کی ڈھیری اُس کے سامنے بنتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک واقعہ تو یہ بیان کیا اور دوسرا واقعہ جاندار نماز کے ضمن میں یہ بتایا کہ ایک صحابیؓ ایک مرتبہ اپنے خچر پہ سوار سامان لادے سفر پہ جا رہے تھے کہ راستے میں اُن کا خچر مر گیا۔ صحابیؓ نے فوراً وضو کیا اور صلوٰۃ الحاجت کی نیت باندھی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کی یا اللہ آپ زندہ کو مردہ اور مردے کو زندہ سے نکالنے پہ قادر ہیں۔ میرا یہ خچر مر گیا ہے۔ قیامت کے روز آپ اسے زندہ فرمائیں گے مگر تب یہ میرے کسی کام نہیں آئے گا۔ اس لیے آج میں اپنے سامان کے لیے پریشان ہوں۔ برائے مہربانی اس خچر کو اپنی قدرت سے زندہ فرما دیجیے تا کہ میں اپنا سامان منزل مقصود پہ پہنچا سکوں۔ روایت میں ہے کہ نماز سے

فارغ ہونے کے بعد صحابیؓ کیا دیکھتے ہیں کہ اُن کا خچر زندہ ہو کر گھاس چر رہا ہے! سبحان اللہ! جمعہ نماز پڑھنے کے بعد میرے انتظار میں تقریباً چار آدمی بیٹھے رہے اور باقی تمام لوگ نماز سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ جب میں سُنتوں اور نوافل سے فارغ ہوا تو منتظر آدمیوں نے مجھے گھیر لیا اور پوچھنے لگے

''محترم! یہ بتایئے کہ آپ نے یہ جو دو صحابیوں کے ساتھ پیش آمدہ واقعات کا اتنے بھاری مجمع میں ذکر کیا، کیا آپ کے پاس ان واقعات کی کوئی کتابی دلیل موجود ہے؟ آپ نے یہ واقعات کس کتاب میں پڑھے ہیں؟ ہمارے اس سوال کا جواب دیجیے''

میں پہلے تو کچھ بوکھلاہٹ سی محسوس کرنے لگا اور پھر اللہ تعالیٰ نے میرے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ سوال کرنے والا شخص دعوتِ حق کی عظیم محنت کا سرے سے مخالف ہے۔ میں نے بڑی عاجزی سے کہا

''میرے بھائی! میں نے یہ دونوں واقعات کئی بار بڑے بڑے عالم وفاضل بزرگوں کی زبانی سُنے ہیں۔ البتہ میں نے خود یہ کسی کتاب میں نہیں پڑھے ہیں''

مخالف شخصوں میں سے ایک نے میری باتیں سُن کر کہا

''اس کا مطلب ہے آپ سُنی سنائی باتوں پر عمل کرتے ہیں''

میں نے کہا

''ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے وہ کسی عام آدمی یا کسی جاہل آدمی کی زبانی نہیں سُنے ہیں بلکہ معتبر اور مستند عالموں اور بزرگوں کی زبانی سُنے ہیں''

مخالفت پسند گروپ میں سے تیسرا شخص بولا

''کچھ بھی ہو ہم آپ سے دونوں مذکورہ واقعات کی تصدیق مستند دینی

کتابوں کے حوالے سے چاہتے ہیں''

میں نے جواب دیا

''سُنیے میرے بھائی! میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ یوں بھی ہم دعوتِ حق میں نکلے ہوئے لوگ بغیر اپنے امیر جماعت کی اجازت کے کسی سے بات تک نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم چالیس دن تک ایک مخصوص نورانی اور پاکیزہ ماحول میں سانس لیتے ہیں۔ چند اُصول و آداب کے تحت اپنے امیرِ جماعت کے تابع رہتے ہیں۔ اس لیے آپ یہیں ٹھہریے، میں اپنے امیرِ جماعت کی آپ سے ملاقات کراتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے وہ آپ کو آپ کے سوال کا تسلّی بخش جواب دے سکیں''

میں فوراً مسجد کی دوسری منزل پہ گیا کہ جہاں جماعت کے تمام ساتھی قیلولہ کرنے کے لیے اپنے اپنے بستر لگا رہے تھے۔ میں نے اپنے امیر جماعت جناب محمد بشیر سے پورا معاملہ بیان کیا۔ وہ فوراً میرے ساتھ ہو لیے اور ہم دونوں تبلیغِ اسلام کی مخالفت کرنے والوں کے پاس پہنچ گئے۔ امیرِ جماعت جناب محمد بشیر نے اُن مخالفین سے دُعا و سلام کے بعد پوچھا

''کہیے حضرت آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھی نے جمعہ نماز پہ جو دو صحابیوں کے واقعات سُنائے وہ کس حد تک صحیح ہیں اور کس کتاب کے حوالے سے انھوں نے یہ باتیں کی ہیں؟''

امیر جماعت نے اُنھیں بڑے مُدلّل انداز میں سمجھایا اور فرمایا

''آپ اگر کسی مستند کتاب کا حوالہ چاہتے ہیں تو ''حیاۃُ الصّحابہ'' از مولانا محمد یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی تصنیف کردہ کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ اس کے علاوہ مولانا محمد ذکریا صاحب دامت برکاتہم کی مرتب کردہ

کتاب ''فضائل اعمال'' (حصہ اوّل) کے باب فضائلِ نماز اور حکایات الصّحابہ کے سلسلے میں کئی ایسے واقعات ملیں گے کہ جن کا تعلق جاندار نماز سے ہے کہ صحابہؓ نے اپنے ہر ایک مسئلے کو اللہ تعالیٰ سے نماز کے ذریعے حل کروایا ہے''

امیر جماعت کی مُدلّل باتیں سُن کر وہ چاروں مخالف ذہن رکھنے والے آدمی چپکے سے ہماری نظروں سے دُور چلے گئے لیکن اُنھوں نے میرے ذہن کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں، مجھے اُن کا مخالفانہ رویّہ بہت حد تک اصلاحی اور تربیتی معلوم ہوا تھا۔ دین و دُنیا کے تقریباً تمام مسائل اور معلومات کے سلسلے میں ایک عالمِ دین کے پاس کثیر مطالعہ اور حوالہ ہونا چاہیے۔

اندور، مدھیہ پردیش کا ایک بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں ہمارا قیام تقریباً پانچ دن رہا۔ ہر طبقے اور پیشے کے لوگوں سے ہماری خصوصی ملاقاتیں ہوتی تھیں، جس روز ہم نے چلّہ پورا ہونے کے بعد واپس آنا تھا، اُس دن ہم نے رات کو ٹرین میں کھانا ساتھ لے جانے کے لیے نان اور قیمہ تیار کروایا تھا۔ رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہم اندور سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ میں اس بات پہ حیران تھا کہ قدرت نے ہمارا دانہ پانی کہاں کہاں رکھا تھا!

....

1996ء (جون، جولائی) میں مجھے اللہ تعالیٰ نے راجوری اور پونچھ کے علاقوں میں دعوتِ اسلام کا کام کرنے کی توفیق نصیب فرمائی۔ میلی ٹینسی اپنے پورے عروج پر تھی۔ ہماری جماعت کا رُخ جامع مسجد جموں (تالاب کھٹیکاں) سے پونچھ کے لیے طے ہو گیا تھا۔ ہم تقریباً سولہ افراد تھے۔ اس جماعت میں بلاور، اُدھم پور اور دو تین ساتھی جموں کے تھے۔ جناب ماسٹر عبدالرّشید، کرمچی (ضلع اُدھم پور) والے ہماری جماعت کے امیر تھے۔ تمام ساتھیوں کے شناختی کارڈ چیک کیے گئے تھے اور جن

کے پاس نہیں تھے اُنھیں بنوا کر دیئے گئے تھے چونکہ ہم جہاں جا رہے تھے وہ میلی ٹینسی سے متاثرہ علاقے تھے۔ چھنی سے ہم صرف دو ساتھی ایک میں اور دوسرے جناب نور محمد وانی (میٹر ریڈر) تھے۔ شعلہ بار گرمی تھی۔ میں پہلی بار راجوری اور پونچھ جا رہا تھا۔ اپنی ضرورت کی ہر چیز تمام ساتھیوں نے اپنے ساتھ اُٹھائی تھی۔ کھانا پکانے کے لیے اسٹوپ، برتن اور مٹی کا تیل جسے بیت المال کا سامان کہا جاتا ہے۔ باری باری سب ساتھی تھوڑا تھوڑا کر کے اُٹھا لیتے تھے۔ صوبہ جموں کے امیر جماعت محترم جناب بشیر احمد زرگر ساکنہ گوجر نگر نے دُعا و مصافحے کے بعد تمام جماعتوں کو ضروری ہدایات کے ساتھ رخصت کیا اور ہماری جماعت اپنے امیرِ جماعت کے حکم کے مطابق راجوری جانے والی بس میں سوار ہوئی تھی۔ ہم سیدھے راجوری سے تقریباً چھ کیلو میٹر آگے منجا کوٹ اُتر گئے اور وہاں کی جامع مسجد میں ہمارا قیام تقریباً تین دن رہا۔ اس مسجد سے ملحق ایک مدرسہ ہے جہاں اُس وقت تقریباً اسّی بچّے زیرِ تعلیم تھے۔ اس مدرسے کے مہتمم ایک نیک اور متقی شخص تھے۔ اُنھوں نے جماعت کی بہت نُصرت کی تھی۔ چند بچّے قرآن پاک حفظ کر چکے تھے اور کچھ اُن میں نعت گو بھی تھے۔ تقریباً دس دن ہم منجا کوٹ کے پہاڑی علاقوں میں دعوتِ حق کا کام کرتے رہے۔ سنگلاخ چٹانوں، اوبڑ کھابڑ راستوں پر گزرتے ہوئے میں ڈرنے لگتا تو فوراً اللہ تعالیٰ کی یاد میرے ڈر و خوف کو زائل کر دیتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر تو ایک پتّا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا ہے۔

دس دن منجا کوٹ میں کام کرنے کے بعد ہماری جماعت پونچھ کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ شیرِ کشمیر پُل پار کرنے سے پہلے ہی پولیس کے سپاہیوں نے جماعت کے ہر فرد کی تلاشی لی تھی اور شناختی کارڈ چیک کیے تھے۔ بد قسمتی سے کوئی چار ساتھیوں کے پاس شناختی کارڈ نہیں تھے۔ امیر جماعت جناب ماسٹر عبدالرّشید اور میں نے بھی سپاہیوں کو کافی یقین دلایا کہ یہ چار افراد ہماری جماعت کے افراد ہیں لیکن اُنھوں نے

کوئی بھی بات نہیں مانی اور پوری جماعت کو پولیس تھانہ پونچھ میں پہنچا دیا۔ تھانیدار تھانے میں نہیں تھا۔ منشی اپنے آپ کو عاشقِ رسول سمجھتا تھا، داڑھی نام کی کوئی بھی چیز اُس کے چہرے پہ نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں نیلی تھیں، سر کے بال لال رنگ کے تھے۔ بدمزاج اتنا کہ آتے ہی سب ساتھیوں پہ برس پڑا۔ کہنے لگا

''تمہارا مشن کیا ہے؟ گھر سے بے گھر ہونے کے لیے لوگوں کو کیوں مجبور کرتے ہو اور سب سے بُری بات یہ کہ تُم نماز سے پہلے اور نماز کے بعد کھڑے ہو کر زور زور سے درود شریف نہیں پڑھتے ہو''

ہمارے امیرِ جماعت جناب ماسٹر عبدالرّشید کم زبان اور شریف قسم کے انسان تھے۔ اُنھوں نے منشی کو جواب دیا

''میرے محترم! ہمارا مشن دینِ اسلام کی تبلیغ کرنا ہے اور پوری دُنیا میں اسلام کے ذریعے امن قائم کرنا ہے۔ ہم کسی کو گھر سے بے گھر کرنا نہیں چاہتے بلکہ ایک مخصوص عرصے تک پاکیزہ ماحول میں رکھنے کے بعد واپس اپنے گھر میں بھیج دیتے ہیں۔ تیسری بات، آپ نے فرمایا کہ ہم نماز سے پہلے اور نماز کے بعد کھڑے ہو کر درود شریف زور زور سے نہیں پڑھتے ہیں، تو سُنیے صاحب! بات یہ ہے کہ اصل معاملہ درود شریف کے پڑھنے کا ہے۔ نہ پڑھنے والا واقعی گنہگار اور لعنتی ہے۔ آپؐ پر درود شریف پڑھنا ہر مسلمان پہ فرض ہے۔ ہم کثرت سے درود شریف پڑھتے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے تبلیغی نصاب میں درود شریف کی فضیلت اور اُس کے پڑھنے کے بارے میں پورا باب شامل ہے۔ رہا مسئلہ کھڑے ہو کر زور سے پڑھنے کا تو بھائی صاحب نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ بہرہ تھوڑی ہے کہ وہ آہستہ سُنتا ہی نہیں''

امیر جماعت کی یہ کھری باتیں تھانے کے منشی کو کچھ چبھ سی گئیں۔ وہ تلملا کے کرسی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا پھر اُس نے اپنی بات کا موضوع بدل دیا اور بولا

''دیکھو، تُم یہ جانتے ہو کہ پونچھ سرحدی علاقہ ہے اور یہاں میلی ٹینسی زوروں پر ہے، مگر اس کے باوجود تمہارے چار ساتھیوں کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہیں۔ کل کو اگر اس علاقے میں کوئی بھی جان لیوا واقعہ پیش آجائے تو پہلی فرصت میں تُم ہی پکڑے جاؤ گے۔ اس لیے تمہارے یہ چار ساتھی یہیں رہیں گے اور ہم ان کو ضمانت پر چھوڑیں گے''

ہم چند ساتھی کہ جن کے پاس شناختی کارڈ تھے مرکزِ تبلیغ ضیاالعلوم پونچھ چلے آئے جب کہ امیر جماعت اور وہ ساتھی جن کے پاس شناختی کارڈ نہیں تھے وہ تھانے میں ہی رہے۔ ہم نے آتے ہی ضیاالعلوم کے مہتمم جناب غلام قادر کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں ساری باتیں بتائیں اُنھوں نے فوراً تھانیدار کو فون کیا اور اس طرح ہمارے بقیہ ساتھی بھی چند لمحوں کے بعد ہمارے پاس پہنچ گئے۔ پونچھ شہر کی جامع مسجد سے ملحق مدرسہ ضیاالعلوم ہماری ریاست جموں وکشمیر کا ایک مثالی مدرسہ ہے جہاں دینیات کے مختلف شعبے ہیں اور دعوت وتبلیغ کی فکری اساس پہ قائم یہ مدرسہ ہزاروں تشنگانِ اسلام کو سیراب وفیضیاب کر چکا ہے۔ مہتمم مدرسہ عزت مآب غلام قادر صاحب نے اس مدرسے کی ترقی کے لیے اپنی ہر متاعِ عزیز قربان کی ہے۔ اس مدرسے میں پہنچ کر ہر شخص کو روحانی سکون اور ذہنی بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ پونچھ میں جماعت کے ساتھ یہ میری پہلی رات تھی۔ رات کو سامنے پار پاکستان کا پورا علاقہ میری نظروں میں تھا۔ میں نے بچپن میں اپنے خاندان کے بزرگوں سے سُنا تھا کہ پونچھ بارڈر ایریا ہے اور وہاں سے پاکستان کا کچھ علاقہ نظر آتا ہے، آج میں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ دماغ میں یہ خیال آیا کہ کاش! اگر سیاست کے بدترین کھیل نے 1947ء میں ہمارے ملک کو تقسیم نہ کیا ہوتا تو آج شاید ہندوستان، امریکہ کی

طرح طاقتور ملک ہوتا! پونچھ شہر خوب صورت اور کسی حد تک گنجان آبادی والا شہر ہے۔ اُردو کے مشہور و معروف ادیب جناب کرشن چندر کا بچپن اور لڑکپن بلکہ جوانی کے کچھ ماہ و سال پونچھ ہی میں گزرے ہیں۔ اس اہم ادبی شخصیت کے نام پہ وہاں ایک پارک تعمیر کروائی گئی ہے جسے کرشن چندر پارک کہتے ہیں۔ میں ایک روز اپنے امیرِ جماعت کی اجازت سے اس پارک میں گھومنے چلا گیا۔ پوری پارک میں گھوما پھرا۔ مخملی گھاس پہ ننگے پاؤں چلنے سے میرے تلوؤں میں گدگداہٹ سی پیدا ہو رہی تھی۔ سامنے ایک اونچے ستون پر کرشن چندر کا مجسمہ مجھے دُنیا کی بے ثباتی کا یقین دلا رہا تھا۔

تین دن ہمارا قیام جامع مسجد پونچھ میں رہا تھا اور اُس کے بعد وہاں کے ذمہ دار حضرات نے ہماری جماعت کا رُخ طے کیا تھا۔ دوسرے دن ہم ایک اور مدرسے کی طرف جا رہے تھے جسے خواجہ سہڑی ہاڑی بُڈھا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس مدرسے کی عمارت اُن دنوں زیرِ تعمیر تھی، ہماری جماعت کے تمام ساتھیوں نے عام مزدوروں اور دیگر افراد کے ساتھ پورا ایک دن سیمنٹ کی چھت ڈالنے کے لیے کام کیا تھا۔ تقریباً چار دن ہم خواجہ سہڑی ہاڑی بُڈھا میں ٹھہرے تھے اور اُس کے بعد ہم مور بن کی طرف بھیج دیئے گئے تھے۔ مختلف مقامات اور مساجد میں رہے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں ہم تقریباً 35 دن تک دعوتِ حق کا کام کرتے رہے تھے۔ کبھی اسٹوپ پہ کھانا تیار کرتے اور کبھی لکڑیاں جلا کر کھانا پکاتے تھے۔ گیلی لکڑیوں سے جب دُھواں اُٹھتا یا جب میرے ہاتھ جلنے لگتے تو تب مجھے یہ احساس ہوتا کہ ہم مردوں کو بیویاں کھانا پکا کر کھلاتی ہیں اور اُنھیں بھی کھانا تیار کرتے کتنی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ صبر و شکر سے ہماری جماعت کام کر رہی تھی۔ ہر قدم پر مجاہدہ اور مشاہدہ ہو رہا تھا۔ تقریباً دو دو کیلومیٹر کی سیدھی چڑھائی اوپر سے جون، جولائی کی گرمی، مگر قبر کی تاریکی اور آگ یاد آتے ہی سب کچھ بھول جاتا۔ یوں محسوس ہوتا کہ جیسے ہم بڑے آرام سے چل رہے ہیں۔ ہم کھنیتر بھی گئے تھے جو مولانا مُنیر صاحب کا علاقہ ہے۔

لوگوں نے ہماری کافی نُصرت کی تھی۔فوجی کیمپ سے گزرتے ہوئے کسی بھی ساتھی کی نہ تو تلاشی لی گئی تھی اور نہ ہی شناختی کارڈ دیکھا گیا تھا۔فوجی سپاہیوں نے ہمیں اللہ والے کہہ کے رُخصت کیا تھا۔سُرنکوٹ، پونچھ کا ایک بہت خوب صورت علاقہ ہے۔ اس میں سے گزرتے ہوئے میرے دل ودماغ میں بھدرواہ کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔ چالیس دن کا یہ دعوتی کورس پورا ہونے کے بعد ہم سب ساتھی جموں چلے آئے تھے اور جب ایک دوسرے سے رُخصت ہوئے تھے تو رو پڑے تھے۔آج بھی مجھے وہ تمام ساتھی اور پونچھ کی پہاڑیاں یاد آرہی ہیں۔یہ ایک اتفاق تھا کہ مجھے پونچھ میں دعوتِ حق کا کام کرنے کا موقع ملا تھا۔

....

دسمبر 1997ء کے آخری عشرے میں مجھے دعوت وتبلیغِ اسلام کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے بمبئی جانا نصیب فرمایا۔یہ تقریباً اٹھارہ آدمیوں کی جماعت تھی۔جموں وکشمیر کے اُس وقت کے امیرِ جماعت محترم پرویز احمد صاحب (بارہمولہ، کشمیر) نے چوپڑہ شاپ میں جماعت کا رُخ بمبئی کے لیے طے کیا تھا۔حاجی عبدالرّشید صاحب چوپڑہ شاپ والے (جو دعوتِ حق کے ایک اہم اور فعال ساتھی ہیں) کو ہماری جماعت کا امیر بنایا گیا تھا۔اُن کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جان جائے پر ایمان نہ جائے کے قائل ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اُنھیں شرافت، صداقت، خلوص ومحبت اور داعیانہ صفات ودیعت کی ہیں۔ہم جموں ریلوے اسٹیشن سے رات کے تقریباً نو بجے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔جب ہم چوپڑہ شاپ (ادھم پور) سے جموں کے لیے چلے تھے تو محترم عبدالرّشید صاحب نے تمام ساتھیوں سے پُرزور الفاظ میں روانگی کے آداب بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا

”میرے بھائیو! اور بزرگو! سب اپنی اپنی نیتوں کو ٹٹولیں، اپنی نیتوں کو دُرست کرلیں۔ہم سب کی نیت یہ ہو کہ ہمیں چالیس دن میں اللہ

کے دین کے مطابق زندگی بسر کرنا آجائے۔ ہم بمبئی سیر وتفریح کے لیے نہیں جارہے ہیں۔ نیت کا بگاڑ نیک اعمال سے محروم رکھے گا۔ اس لیے جو ساتھی جس نیت سے گھر سے نکلا ہے اُسے وہی حاصل ہوگا کیونکہ تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی دھیان میں رکھیں کہ اب ہم ریل پر سوار ہورہے ہیں اس لیے اپنے ایمان اور سامان کی حفاظت خود کریں۔ اللہ تعالیٰ اُسی کو ہدایت دیتا ہے جو ہدایت کا طالب ہوتا ہے۔ ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکامات اور رسول اکرمؐ کے پاکیزہ اور نورانی طریقے آجائیں تو سمجھ لیجیے کہ اُسے ہدایت مل گئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلنے کے بعد مشورے کی پابندی، مسجد کی چاردیواری، امیر کی تابعداری اور راتوں کی آہ وزاری لازمی ہوجاتی ہے''

عموماً ریلوے اسٹیشنوں پہ مُسافروں کی بہت بھیڑ رہتی ہے۔ کونسی ٹرین کب اسٹیشن پہ آرہی ہے اور کس پلیٹ فارم پہ آکے رُکے گی یہ سب معلوم کرنا ذہنی کوفت سے تعلق رکھتا ہے اور پھر رات کو یہ عمل اور زیادہ دُشوار ہوجاتا ہے۔ ہمارے امیر جماعت عبدالرّشید صاحب نے بڑی فکرمندی اور ہوشیاری سے تمام ساتھیوں کو رات کے تقریباً آٹھ بجے بمبئی جانے والی ٹرین پر سوار کردیا تھا۔ کس ساتھی کی سیٹ کا نمبر کیا ہے؟ کون کہاں بیٹھے گا؟ دورانِ سفر ٹرین میں نمازوں کا اہتمام اور ذکرواذکار کے علاوہ حدیث کی تعلیم کس طرح کریں یہ تمام باتیں رشید صاحب نے بہتر طور پر پہلے ہی سمجھادی تھیں۔ علاوہ ازیں رات کا کھانا ہمارے ساتھ تھا۔ تقریباً نو بجے رات کو ہماری ٹرین ریلوے اسٹیشن جموں سے آہستہ آہستہ بمبئی کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ٹرین کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ مختلف دیہاتوں اور شہروں سے گزرتی ہوئی ہماری

ٹرین صبح تقریباً آٹھ بجے دہلی پہنچ گئی تھی۔ دُوسرے دن بھی ہم دہلی سے آگے ٹرین میں سفر کرتے رہے اور پھر ساری رات ٹرین چلتی رہی تھی۔ تقریباً تین دن کے بعد رات کو سات بجے کے قریب ہم سینٹرل بمبئی کے ریلوئے اسٹیشن پہ اُترے تھے۔ فلک بوس عمارتوں کا ایک طویل سلسلہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ بے ساختہ میری زبان پہ خالقِ کائنات کی حمد وثنا سے متعلق یہ شعر آیا تھا کہ ؎

ہو شکر تیرا ہر دم دُنیا بنانے والے
دُنیا میں رنگ برنگی بستی بسانے والے

ماہِ صیام کا پہلا عشرہ تھا۔ ہم بمبئی کے مقامی رہبر کی رہبری میں اسٹیشن سے اپنا اپنا سامان پیٹھ پر اُٹھائے مہندی مسجد کی طرف بڑھے تھے، مسجد کے باہر دُور تک لوگ صفوں میں کھڑے سڑک تک تراویح پڑھ رہے تھے۔ ہماری جماعت کو وہاں کے ذمہ داروں نے مہندی مسجد کے سامنے ایک آٹھ منزلہ ہوٹل کی سب سے اُوپر والی منزل کی چھت پر بذریعہ لفٹ پہنچایا اور ہم نے وہاں پہ تراویح پڑھی تھی۔ اُس کے بعد ہمیں مہندی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت ملی تھی۔ وہاں کے ذمہ داروں نے فوراً ہمارے کھانے پینے کا انتظام کیا تھا۔ گوشت، چاول اور بریانی تناول فرمانے کے بعد تمام ساتھی بحکم امیر جماعت سو گئے تھے۔ صبح سحری کھانے کے بعد فجر کی نماز پڑھی اور اُس کے فوراً بعد وہاں کے ذمہ داروں نے ہمیں سینٹرل بمبئی کی ایک مسجد مرغا گرین بھیج دیا تھا۔ مسجد مُرغا گرین میں ہمارا قیام تین دن رہا اور چوتھے دن ہماری جماعت کو چونا بھٹی (جو مرکز تبلیغِ اسلام بمبئی ہے) بھیج دیا گیا تھا۔ ہزاروں لوگوں کا مجمع سڑکوں اور چوک، چوراہوں پر نظر آتا تھا۔ بمبئی جیسے بڑے شہر میں لوگ دن رات اپنے اپنے مشاغل میں نظر آتے ہیں۔ جیب کترے، بدمعاش اور ڈاکو قسم کے لوگ زیادہ تر رات کو اپنا کام کرتے ہیں۔ یہاں امیری اور غریبی اپنے مخصوص انداز میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ عیاشی کے اڈّوں میں عورت کی عزت وعصمت نیلام ہوتی ہے۔ فلمی دُنیا کا یہ شہر

انتہائی رنگین لیکن بے مُروّت بھی ہے۔ یہاں جو جیتا وہی سکندر مانا جاتا ہے۔ پچپن اور پینتیس منزلہ عمارتیں دیکھنے کے لیے سر پہ ٹوپی ہو تو اُس کے گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ دعوتِ حق میں لگے لوگ بہت مخلص اور ایثار و ہمدردی کا ثبوت دیتے ہیں۔ مُرغا گرین مسجد میں رہتے ہوئے ایک روز میں نے اُردو کے مشہور و مقبول رسالہ ''شاعر'' کے مُدیر افتخار امام صدیقی صاحب کا پتہ معلوم کیا تھا، مجھے چونکہ اُن سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا، امیرِ جماعت سے اجازت لے کر وہاں کے ایک شخص کی رہنمائی میں، میں بڑی مشکل سے سڑک پار کرنے کے بعد اُن سے دیناتھ بلڈنگ کی پہلی منزل کی سیڑھیوں پہ بالمشافہ ملا تھا۔ انتہائی دُبلے پتلے اور برف کی مانند اُن کا چہرہ اور ہاتھ دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ چند لمحوں تک میری اُن سے ادبی گفتگو ہوئی تھی۔

ماہِ صیام میں افطاری کے وقت طرح طرح کی لذیذ نعمتیں دستر خوان پہ سجتی تھیں۔ سینکڑوں لوگ مسجدوں میں افطار کرنے آتے تھے۔ ماہِ صیام میں چونکہ اللہ تعالیٰ تمام سرکش شیاطین کو قید کر لیتا ہے، اس لیے مسجدیں نمازیوں سے کھچا کھچ بھری رہتی ہیں اور جونہی رمضان ختم ہوتا ہے تو مسجدیں خالی ہو جاتی ہیں۔ بہت سے برائے نام مسلمان اس غلط فہمی میں مُبتلا ہیں کہ پورے گیارہ مہینے میں جتنے بھی گناہ ہوئے ہوں وہ رمضان میں معاف ہو جاتے ہیں۔ اس لیے صرف ایک مہینے میں خوب عبادت کرو اُس کے بعد چھٹی، پھر چاہے نمازیں نہ پڑھو، عُشر و ذکوٰۃ نہ دو۔ رشوت کھاؤ، شراب پیو، جھوٹ بولو، کسی کا حق مارو، غیبت کرو، چغلی کھاؤ، غرضیکہ جو جی میں آئے کرو۔ اس طرح کا خیال بالکل احمقانہ ہے۔ ماہِ صیام ہماری بہتر رُوحانی، نفسیاتی اور ذہنی و جسمانی تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔

بمبئی کی لوکل ٹرینوں میں اکثر جیب کترے، اوباش اور چور سفر کرتے ہیں۔ ایک شریف آدمی کو انتہائی چوکس اور بیدار ذہن رکھ کر سفر کرنا پڑتا ہے۔ بمبئی میں ہماری جماعت حلقہ کھار، باندرہ، گلشن کالونی، اندھیری ویسٹ اور سینٹرل بمبئی کے علاقے

میں کام کرتی رہی تھی۔ اندھیری ویسٹ میں زیادہ تر فلمی اداکار رہتے ہیں۔ رمضان میں کچھ مسلمان ہیرو تراویح پڑھنے آتے تھے، تب میں نے پہلی بار بمبئی میں موبائل فون دیکھا تھا۔ یہ سوچ کے حیران رہ گیا تھا کہ آخر بغیر تاروں کے آدمی کس طرح اس کے ذریعے بات کرتا ہے؟ بڑے بڑے سیٹھ بلکہ کروڑ پتی لوگوں سے وہاں دعوتِ حق میں لگے ساتھی کبھی میری اور کبھی امیرِ جماعت کی ملاقات دین کی نسبت پر کرواتے۔ اُن دنوں میں اُردو میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ میں اکیلا ایک دن باندرہ سے چرچ گیٹ تک ڈبل بس میں سوار ہو کر لائبریری گیا تھا اور پھر ایک بار اندھیری ویسٹ سے جماعت کے ایک ساتھی نے جو بمبئی ہی کا رہنے والا تھا اپنی چھوٹی گاڑی میں بٹھا کر مجھے سانتا کروز ودیا نگری یونیورسٹی تک لے گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے شعبۂ اُردو کا پتہ لگایا تھا۔ چھوٹے چھوٹے چند کمروں میں بڑی تنگ سی جگہ پہ شعبۂ اُردو تھا۔ آج نا معلوم اس شعبے کا کیا حال ہے لیکن اُس وقت کا شعبۂ اُردو میرے لیے قابلِ افسوس تھا۔ مجھے دراصل اس شعبے میں اُردو کی ایک قد آور شخصیت جناب عبدالستار دلوی سے ملاقات کرنے کا شوق تھا لیکن اُس دن وہ شعبے میں نہیں تھے البتہ ایک اور صاحب موٹے اور سانولے رنگ کے تھے جن کا نام معین الدّین جینا بڑے تھا۔ اُن سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اپنے موضوع ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' سے متعلق اُن سے معلومات اور کتب کی دستیابی چاہی تھی تو اُنھوں نے معذرت کی تھی۔ ہم نے عید بمبئی میں ہی منائی تھی۔ رات کے تقریباً دو بجے یہ معلوم ہوا تھا کہ ہلالِ عید نظر آ گیا ہے۔ فوراً پورے شہر میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ جمعہ کے دن کئی مسجدوں کے باہر عورتیں اپنے بیمار بچّوں کو لیے کھڑی رہتیں اور اللہ والوں سے دم کرنے کو کہتیں۔

ہمارا چلّہ پورا ہونے میں ابھی پانچ دن باقی تھے کہ بمبئی کے معزز دینداروں نے ہمارے امیرِ جماعت عبدالرّشید صاحب کو یہ رائے دی تھی کہ تمام جماعت کے

ساتھیوں کو بمبئ کے مخصوص مقامات کی سیر کروائی جائے تاکہ اِنھیں قدرت کی پیدا کردہ چیزوں پر غور وفکر کرنے کا موقع ملے اور ان کے ایمان میں مزید پختگی پیدا ہوسکے۔ چنانچہ ہماری جماعت کے افراد چار چھوٹی گاڑیوں میں سوار ہوکر جُو ہو چوپاٹی، گیٹ وے آف انڈیا اور ہوٹل تاج محل کے علاوہ ایک روز سمندر دیکھنے بھی گئے تھے۔سمندر کی لہروں کا نظارہ کرنے میں مجھے کافی لُطف آیا تھا۔ہم پانی میں بھی اُترے تھے لیکن جونہی سمندر کی لہریں بپھرائی ہوئی شیرنی کی طرح ہمارے قریب آجاتیں تو ہم فوراً پانی سے باہر آجاتے۔ ہماری نظریں جہاں تک پہنچتی تھیں بس پانی ہی پانی نظر آتا تھا اور پھر آگے دُھندسی چھائی دکھائی دیتی۔

بمبئ میں رہتے ہوئے مجھے قدرت کے کئی حیرت انگیز نظارے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ جب چلّہ پورا ہوا تو ہماری جماعت مہندی مسجد میں آکر ٹھہری تھی۔ دُوسرے دن رات کو ہم بمبئ سے دہلی کے لیے ٹرین پہ سوار ہوئے تھے، جونہی ہماری ٹرین کے ڈرائیور نے زوردار سیٹی بجائی اور آہستہ آہستہ اسٹیشن چھوڑنا شروع کیا تھا تو میرے ذہن میں فلم 'اپنا پن' کا گیت کے یہ بول آئے تھے کہ ۔

آدمی مسافر ہے آتا ہے جاتا ہے
آتے جاتے رستے میں یادیں چھوڑ جاتا ہے

دہلی پہنچنے کے بعد ہم مرکز بستی نظام الدّین چلے گئے تھے وہاں دودن بزرگوں کی بصیرت افروز باتیں اور دعوتِ حق کے اُصول وآداب سُنتے رہے اور دوسرے دن رات کو ہم جموں جانے والی ٹرین پہ سوار ہوئے تھے۔جموں پہنچنے کے بعد ہم تمام ساتھی ایک دوسرے سے معذرت کے ساتھ نم آنکھوں رُخصت ہوئے تھے۔آج بھی جب ماضی کے جھروکوں سے جھانک کر اپنی گذشتہ زندگی پہ نظر کرتا ہوں تو بمبئ جیسے بڑے شہر میں گزارے چالیس دن اور اُس شہر کا پورا ماحول میرے ذہن میں گھوم جاتا ہے۔

....

1999ء میں جنوری، فروری کے مہینے میں مجھے دعوتِ اسلام کی محنت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ملیر کوٹلہ اور چندی گڑھ (پنجاب) جانا نصیب فرمایا۔ اس جماعت میں تقریباً چودہ افراد تھے۔ ہماری اس جماعت کا رُخ چوپڑہ شاپ کی جامع مسجد (اُدھم پور) سے بزرگوں نے پنجاب کی طرف طے کیا تھا۔ جناب عبدالحمید بٹ المعروف مصروف گلاب گڑھی ہماری جماعت کے امیر تھے۔ وہ انتہائی حسّاس، بیدار مغز اور بہت حد تک جلالی قسم کے انسان ہیں۔ پہلی بار جب اُن کی دینی تربیت میں رہنے کا موقع ملا تو اُن کی باغ و بہار شخصیت نے مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اپنے گھر سے باہر ہوں۔ وہ گوجری، کشمیری، ڈوگری، پنجابی، ہندی، اُردو، سراجی اور انگریزی جانتے ہیں۔ جب وہ ایمانیات پر بولتے ہیں تو سینکڑوں افراد پہ مشتمل مجمع پوری ذہنی یکسوئی اور دلچسپی کے ساتھ اُن کی ایمان افروز باتیں سُننے میں مگن ہو جاتا ہے۔ جب دعوتِ حق کے ذمہ داروں نے ہمیں اُن کے حوالے کیا تو اُنھوں نے تمام ساتھیوں کے نام مع پتہ اپنی ڈائری میں نوٹ کیے تھے اور اُس کے بعد تمام ساتھیوں کو ایمان و یقین کے ساتھ کہا تھا

> ''دوستو! اور ساتھیو! اللہ کے دین پر چلنے کے لیے ہم سب اپنے گھروں، خاندانوں، ملازمت و تجارت غرضیکہ ہر پیاری چیز کو چھوڑ کر اس نورانی مجلس میں چلے آئے ہیں۔ ہم سب کی زندگی دین سے ہٹی ہوئی ہے۔ بُرے ماحول و معاشرے میں رہتے ہوئے ہم انتہائی پستی و ذلالت اور غیر اسلامی طرزِ زندگی اپنائے ہوئے ہیں۔ دوستو! جب کوئی گاڑی خراب ہو جاتی ہے تو وہ کسی سڑک پہ ٹھیک نہیں ہوتی بلکہ اُسے ورک شاپ میں لایا جاتا ہے اور پھر وہ ٹھیک ہو کر سڑک پہ چلتی ہے۔ اسی طرح ہم بُرے ماحول میں رہتے ہوئے اس قدر بُرے ہو چکے ہیں کہ نہ صرف غیر مسلموں کے لیے بلکہ اپنے آپ

کے لیے بھی وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔اس لیے اب ہمارے بننے
کی جگہ اگر کوئی ہے تو وہ یہی دعوت وتبلیغ کی عظیم محنت ہے کہ جس میں
لگ کر لاکھوں لوگوں کی زندگیاں بنی ہیں۔میری یہ بات یاد رکھیے کہ
دُنیا کا بگڑا ہوا آدمی دعوتِ حق کی اس عظیم محنت میں لگ جائے تو وہ
تہجد گزار، متقی و پرہیز گار بن سکتا ہے اور بنے ہیں لیکن اس عظیم محنت
میں لگا ہوا شخص اگر بگڑ گیا تو پھر اُسے کوئی بھی راہِ راست پر نہیں لے
آسکتا۔اس لیے چالیس دن کا ہمارا یہ دینی تربیتی کورس کافی اہمیت
وافادیت کا حامل ہے۔ ہمارے ذہن ودل کے اندر سے خباثت اُسی
صورت میں دُور ہوسکتی ہے جب ہم مشورے کی پابندی اور مسجد کی
چاردیواری کے ماحول میں رہیں گے۔جس طرح مُرغی کے نیچے
21 دن تک انڈے رکھنے کے بعد چوزے تیار ہوتے ہیں اور جو انڈا
مرغی کے نیچے نہیں رہتا وہ خراب ہوجاتا ہے، اُس کی بدبُو بیماری کا
باعث بنتی ہے۔ پھر اُس خراب انڈے کو کہیں دُور پھینکا جاتا ہے۔
چنانچہ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک عظیم
محنت کے لیے قبول فرمایا ہے۔لہٰذا ہمیں نہایت محنت، فکر واحساس
اور مخصوص نظم وضبط کے مطابق اپنے شب وروز بسر کرنے چاہئیں‘‘

بڑے مُدلّل انداز میں ہمارے امیر جماعت جناب عبدالحمید بٹ نے تمام ساتھیوں کو دعوت وتبلیغ اسلام کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے عالمی سطح پر پھیلے انتشار اور برائے نام مسلمانوں کے باعث غیر اقوام کا اسلام کے تئیں مختلف شکوک وشبہات سے آگاہ کیا تھا۔سخت سردی کا موسم تھا، ہم چوپڑہ شاپ (اُدھم پور) سے جموں اور پھر وہاں سے دوسرے دن ملیر کوٹلہ پنجاب کی بس میں سوار ہوکر تقریباً چار بجے شام کو ملیر کوٹلہ پہنچ گئے تھے۔ میں بچپن سے سردی کم ہی برداشت کرپاتا ہوں۔

البتہ گرمی سے نہیں گھبراتا۔ پورے پنجاب میں اُن دنوں کہرا چھایا ہوا تھا۔ ہمارے ہاتھ، پاؤں سردی سے ٹھٹھر جاتے تھے۔ مختلف علاقوں اور خاندانوں سے آئے ہوئے لوگ ایک مخصوص نظم وضبط کے تحت اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر اپنے مال، وقت اور جان کی قربانی دے رہے تھے۔ پنجاب کی سرزمین انتہائی زرخیز اور دلکش ہے۔ وہاں کے لوگ بہت محنتی ہیں۔ علم وادب کے میدان میں اور خاص کر شاعری، آرٹ اور کلچر کے لحاظ سے پنجاب نے بہت ترقی کی ہے۔ ساحرؔ لدھیانوی، حفیظؔ جالندھری، عرشؔ ملسیانی، راجندر سنگھ بیدی، محمد رفیع (عظیم گلوکار) اور بھی بہت سی بڑی بڑی ہستیاں پنجاب میں پیدا ہوئی ہیں۔ ملیر کوٹلہ میں ہم تقریباً بیس دن ٹھہرے تھے اور عیدالاضحیٰ ہم نے یہیں منائی تھی۔ عید کی نماز ہم نے ملیر کوٹلہ کے تاریخی عید گاہ میں ہزاروں لوگوں کے ساتھ ادا کی تھی۔ اُس دور میں جناب پرکاش سنگھ بادل پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ اُنھوں نے عیدگاہ کے احاطے میں بنے ایک اُونچے مینار کے اُوپر چڑھ کر تمام مُسلم برادری کو عید کی مبارک باد دی تھی اور لوگوں کو آپسی بھائی چارے اور رواداری کو بڑھاوا دینے کی پُرزور اپیل کی تھی۔ ہم پیدل عید گاہ تک گئے تھے اور پیدل ہی واپس مسجد میں آئے تھے۔ انتہائی سردی کے موسم میں ہم گشت، خصوصی ملاقاتیں اور دیگر دینی امور انجام دیتے تھے۔

بیس دن کے بعد ہماری جماعت چندی گڑھ چلی گئی تھی۔ چندی گڑھ بہت زیادہ صاف سُتھرا اور دلکش شہر ہے۔ پورا شہر سیکٹروں میں بٹا ہوا ہے۔ چندی گڑھ کا تبلیغی مرکز آج بھی میرے سمندِ تخیل پر تازیانہ لگا رہا ہے۔ ہم مختلف مساجد میں دعوتِ حق کا کام کرتے رہے۔ مختلف بستیوں میں لوگوں کو اللہ اور اللہ کے رسول کا تعارف کرواتے تھے۔ عبدالحمید بٹ صاحب پورے جوش وجذبے کے ساتھ عوام سے خطاب فرماتے اور جب دین کی بات ختم کرتے تو پھر ایسی دردبھری آواز میں دُعا مانگتے کہ سارا مجمع رونے لگتا۔ میں یہ بات وثوق سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے بٹ

صاحب کوتقریر کرنے کی بہترین صلاحیت دی ہے۔ وہ اگر کسی مجمع میں چودہ گھنٹے دین کی بات کریں گے تو سُننے والے ہرگز نہیں اُکتائیں گے۔ چندی گڑھ میں رہتے ہوئے میں اکیلا ایک دن چندی گڑھ یونیورسٹی دیکھنے چلا گیا۔ جموں یونیورسٹی میں جب اُردو کا کوئی سیمینار ہوتا تو چندی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے پروفیسر جناب ڈاکٹر ہارون ایوب ضرور جموں آتے۔ میرے جی نے چاہا کہ میں چندی گڑھ میں آکر پروفیسر ہارون ایوب صاحب سے ملوں۔ اس لیے میں یونیورسٹی چلا گیا۔ جب شعبۂ اُردو میں پہنچا تو وہاں مجھے یہ معلوم ہوا کہ پروفیسر ہارون ایوب صاحب کو دُنیا سے گزرے تقریباً ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ مجھے انتہائی صدمہ ہوا۔ چندی گڑھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو ہارون ایوب صاحب نے ہی قائم کیا تھا۔ میں تعزیت کے لیے اُن کے کوارٹر پہ چلا گیا۔ بڑی مشکلوں کا سامنا کرنے کے بعد جب یونیورسٹی کے احاطے میں ہی اُن کے کوارٹر میں پہنچا تو اُن کی اہلیہ محترمہ اور اُن کا بیٹا جو اُس زمانے میں غالباً دسویں جماعت کا طالب علم تھا ملا۔ اُن کے ساتھ ہارون ایوب صاحب کی بے وقت رحلت پر اظہار تاسف کیا۔ ہارون ایوب صاحب بنیادی طور پر بھوپال کے رہنے والے تھے۔ اُردو میں اُن کا تحقیقی مقالہ ''اُردو ناول پریم چند کے بعد'' تحقیقی مقالوں کے ہجوم میں ایک اہم مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر ہارون ایوب صاحب کی اہلیہ نے بھی اُردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور چندی گڑھ کے کسی کالج میں اُردو کی لیکچرار ہیں۔ اُنھوں نے ہارون ایوب صاحب کی لکھی ایک کتاب (جو تبصروں کا مجموعہ تھی) عنایت کی تھی، اس کے علاوہ اپنا پی ایچ ڈی کا شائع شدہ مقالہ بھی دیا تھا۔

چندی گڑھ میں مجھے جناب ڈاکٹر نریش، جناب سلطان انجم اور شعبۂ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسروں اور ایک پروفیسر سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ میں ایک دن ہریانہ اُردو اکادمی میں جناب کشمیری لال ذاکر سے ملاقات کرنے بھی گیا تھا لیکن اُس دن وہ

اکادمی میں نہیں آئے تھے۔ وہاں چند ادب نواز دوستوں سے ملا تھا۔ اُنھوں نے مجھے پنجاب کے افسانہ نگاروں سے متعلق ایک افسانہ نمبر کتابی صورت میں دیا تھا۔ چندی گڑھ ہی سے میں اپنے امیر جماعت جناب عبدالحمید بٹ سے اجازت لے کر بھاشا وبھاگ پنجاب، پٹیالہ بھی گیا تھا۔ ہم دو ساتھی بس پر سوار ہو کر تقریباً دن کے گیارہ بجے پٹیالہ پہنچ گئے تھے۔ پٹیالہ بھی پنجاب کا ایک بہت بڑا تاریخی شہر ہے۔ بھاشا وبھاگ پنجاب پٹیالہ میں مجھے اُردو کے سرکاری رسالہ (جو محکمہ اُلسنہ پنجاب، پٹیالہ سے شائع ہوتا ہے) ''پروازِ ادب'' کے مدیر جناب اشرف محمود نندن اور دیگر اراکینِ ادارہ سے ملاقات کرنے کا موقع نصیب ہوا تھا۔

چندی گڑھ سے ہماری جماعت ایک رات تقریباً دس بجے ریلوے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہو کر صبح دہلی پہنچی تھی۔ پھر ہم مرکزِ تبلیغ الاسلام بنگلے والی مسجد (بستی نظام الدّین) میں دو دن ٹھہرے تھے۔ ایک روز میرے دل نے چاہا کہ میں اللہ کے ولی جناب حضرت نظام الدّین اولیاؒ کی زیارت گاہ پہ جا کر دیکھوں کہ آیا اللہ کا یہ ولی کہاں مدفون ہے۔ اسی شوقِ زیارت اور تجسّس نے مجھے حضرت نظام الدّین اولیاؒ کی زیارت گاہ پر پہنچایا۔ آگے کیا دیکھتا ہوں کہ اس زیارت گاہ کے سامنے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور اُنھوں نے پچاس، سو اور پانچ سو تک کی رسید بُکیں اپنے سامنے رکھی ہیں اور زیارت پہ آنے والوں کو تب تک اندر آنے نہیں دیتے جب تک اُن سے روپے وصول نہ کریں۔ میں نے بھی کڑھتے اور دل پہ پتھر رکھتے ہوئے پچاس روپے کا نوٹ جیب سے نکالا اور ایک شخص کو دے دیا۔ حیران ہوتا ہوں کہ آخر ان برائے نام مسلمانوں نے اپنے نفس کی آگ بجھانے کی خاطر کیا کیا حربے استعمال کیے ہیں۔ جب اندر ولی اللہ کی قبر پہ پہنچا تو برائے نام مسلمان مردوں اور عورتوں کو اہلِ ہنود کی طرح اللہ کے اس ولی کی قبر پہ سربسجود ہوتے دیکھا۔ یہ سب دیکھ میرا وجود لرز گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولؐ کی حمد وثنا کے بعد فاتحہ خوانی کی اور واپس مرکز میں چلا

آیا۔ دوسرے روز ہم رات کو نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے جموں جانے والی ٹرین پہ سوار ہوئے تھے اور صبح جموں پہنچ گئے تھے۔ کھٹیکاں تالاب جموں کی جامع مسجد سے ہم تمام جماعت کے ساتھی بڑی غمگین صورتوں میں ایک دوسرے سے معافیاں مانگتے ہوئے رُخصت ہوئے تھے اور اپنے اپنے علاقوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

....

جنوری 2001ء میں کسی وجہ سے میرا وقت دعوتِ اسلام کے سلسلے میں نہیں لگ سکا۔ البتہ جنوری 2002ء کے پہلے ہفتے ہیں مجھے ایک بار پھر جناب عبدالحمید بٹ کی امارت میں دینی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ میں دس دن تاخیر سے جماعت میں جُڑا تھا۔ یہ جماعت جامع مسجد سیلاں تالاب (ادھم پور) سے نکلی تھی۔ اس کا رُخ مقامی علاقوں میں کام کرنا طے پایا تھا۔ جب میں اس جماعت میں شامل ہوا تھا تو اُس وقت یہ جماعت جکھینی میں تھی۔ تین دن جکھینی میں قیام کرنے کے بعد ہم ہاؤسنگ کالونی سے اوپر گنگیڑا کی مسجد میں گئے تھے۔ گنگیڑا ہی سے میں تقریباً ایک ہفتے کے بعد امیر جماعت کی اجازت سے اپنی کتاب ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' کی اشاعت کے سلسلے میں دہلی چلا گیا تھا۔ میں تقریباً پانچ دن دہلی میں عثمان ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور اپنی کتاب کی پروف ریڈنگ کرنے کے بعد چھٹے دن واپس جموں آ گیا تھا اور دوسرے دن اپنے جماعت کے ساتھیوں میں شامل ہو گیا تھا۔ گنگیڑا سے بہت دُور پچھلی طرف پہاڑی علاقہ ساردا میں ہماری جماعت ایک کچی زیرِ تعمیر مسجد میں ٹھہری ہوئی تھی۔ دُور دُور کسی پہاڑی پہ چند گوجروں اور بکروالوں کے گھر تھے۔ اذان دیتے تو سارا جنگل گونج اُٹھتا تھا۔ تیز اور خنک ہوائیں جسم میں سرسراہٹ سی پیدا کر دیتی تھیں۔ بھُنا ہوا مکی کا آٹا اور کڑوی نمکین چائے پی کر ہم نے چند روز اس علاقے میں گزارے تھے اور تب ہمیں یہ احساس ہوا تھا کہ صحابہ کرامؓ نے دین اسلام کی بقا اور اس کے پیغام کو عام کرنے کے لیے جن تکالیف اور مصائب کو برداشت کیا

تاہم اُس کے متحمل نہیں ہیں۔ جناب ماسٹر محمد رفیق چندیل نے ہماری کافی نُصرت کی تھی۔ وہ اُن دنوں اسی علاقے میں تعینات تھے۔ اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے بعد وہ جماعت کا حال دریافت کرنے ہمارے پاس آتے تھے۔ ساردا سے کام کرتی ہوئی ہماری جماعت تھرڑ اور بلی نالا کے پہاڑی علاقے میں چلی گئی تھی اور بالآخر ہم واپس پھر ادھم پور کی جامع مسجد سیلاں تالاب میں آگئے تھے۔ میرے بیس دن اللہ کے راستے میں لگ چکے تھے اور چلّہ پورا ہونے کے لیے مجھے بیس دن اور لگانے تھے۔ جنوری کی غالباً 20 تاریخ کو ادھم پور کی جامع مسجد میں ایک اجتماع رکھا گیا تھا، وہاں سے پھر دین کی محنت کے سلسلے میں چلّہ، چار مہینے اور تین دن کے لیے جماعتیں اللہ کے راستے میں نکلیں تو مجھے اور میرے ساتھ لاٹی دھونہ کے دو ساتھیوں کو ذمہ دار حضرات نے گُول سنگلدان کی ایک اور جماعت کے ساتھ جن کے ابھی چلّہ پورا ہونے میں بیس دن باقی تھے بھیج دیا تھا۔ جناب ماسٹر نذیر احمد جوٹھارکہ (سنگلدان) کے رہنے والے تھے ہماری جماعت کے امیر بنا دیئے گئے۔ ہم اُدھم پور سے گُول سنگلدان کی بس میں سوار ہو کر رات کو دھرم گُنڈ کی جامع مسجد میں ٹھہرے تھے، پھر تین دن وہاں رہنے اور دعوتِ حق کا کام کرنے کے بعد مختلف مساجد میں رہتے ہوئے بالآخر سنگلدان کی جامع مسجد میں پہنچ گئے تھے۔ دھرم گُنڈ ایک ایسا گاؤں ہے جہاں اُس زمانے میں آرمی کیمپ تھا اور ممکن ہے آج بھی ہو۔ یہ گاؤں دریائے چناب کے کنارے واقع ہے۔ ایک دن میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریائے چناب پہ جا کر کپڑے دھوئے تھے۔ جس دن ہم سنگلدان کی جامع مسجد میں پہنچے تھے تو اُسی دن بارش اور کچھ وقت کے بعد برفباری شروع ہوگئی تھی۔ ہم اُس مسجد میں تقریباً چار دن ٹھہرے تھے۔ برفیلی ہواؤں نے ہمیں پریشان کیا تھا۔ مسجد کے اندر ہی ایک طرف ہم اسٹوپ پہ کھانا تیار کرتے تھے مگر تیز ہواؤں کے جھکڑ بار بار ہمارے اسٹوپ میں خلل پیدا کرتے۔ بہ فضل اللہ دینی جذبے کے آگے تمام تکالیف کو ہم ہیچ سمجھتے۔

جب پانچویں دن موسم خوشگوار ہوگیا تو ہماری جماعت جناب عبدالحمید بٹ کے علاقے مہا گنڈ اور بڑے گنڈ کی جانب چلی گئی تھی۔عبدالحمید بٹ صاحب کے دولت کدے پر جانے کا بھی ہمیں موقع ملا تھا۔اُنھوں نے ہماری ہر قدم پہ رہبری ورہنمائی اور مدد و نصرت کی تھی۔سنگلدان کے تمام پہاڑوں سے ہوتے ہوئے بالآخر ہمارا چلّہ پورا ہوا تھا اور ہم سب ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے تھے۔ دُنیا فانی ہے!اس میں بسنے والے لوگ بڑے ہی عجیب وغریب ہیں،فکرِ آخرت کے بجائے ہم سب فکرِ دُنیا میں لگے ہوئے ہیں!اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت بنائی ہے جس میں نیک لوگ جائیں گے۔ جنت کو اللہ نے انسانی خواہشات کے پورا ہونے کے لیے آراستہ کیا ہوا ہے مگر ہم اپنے بارے میں یہ تو سوچیں کہ کیا ہمارے اعمال اس لائق ہیں کہ ہم جنت میں جاسکتے ہیں!

....

2003ء میں چند اہم مجبوریوں کے باعث میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اصلاح نفس کی خاطر اپنے وقت،اپنی جان اور مال کی قربانی کے ساتھ راہِ خدا میں نہیں نکل سکا،البتہ جنوری 2004ء میں مجھے اللہ تعالیٰ نے پھر یہ توفیق دی کہ میں محض اللہ اور اللہ کے رسولﷺ کی رضا حاصل کرنے کے لیے پورے چالیس دن کے لیے گھر سے نکل گیا۔اس بار مجھے اللہ تعالیٰ نے ڈسٹرک اُدھم پور کی تحصیل رام نگر کے پہاڑوں میں انتہائی دُشوار گزار راستوں کو طے کرتے ہوئے کام کرنا نصیب فرمایا۔ میں جناب عبدالحمید بٹ المعروف مصروف گلاب گڑھی کی شخصیت،تقویٰ وپرہیز گاری اور دینی ودُنیاوی شعور سے انتہائی طور پر متاثر ہوا تھا اس لیے میں نے دعوتِ حق کے منتظمین سے گزارش کی تھی کہ مجھے عبدالحمید بٹ صاحب کی جماعت میں بھیج دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی اور میں بٹ صاحب کے ساتھ چلا گیا۔ اس جماعت میں زیادہ تر رام بن،سنگلدان اور چند ہی لوگ جن میں،میں بھی تھا اُدھم پور

کے تھے۔ ہماری اس جماعت کا رُخ اُدھم پور کی جامع مسجد سے بزرگوں نے رام نگر کی جانب طے کیا تھا۔اس جماعت میں تقریباً تیرہ آدمی تھے۔ہم اُدھم پور سے رام نگر کی بس میں سوار ہوئے تھے اور جامع مسجد رام نگر میں تین دن تک ٹھہرے تھے۔ وہاں ہمیں ماسٹر عباس صاحب کھنیڈ والے ملے تھے جنھوں نے ہماری رہبری اور ہر طرح سے مدد کی تھی۔ وہ پورے پچیس دن ہمارے ساتھ رہے تھے۔رام نگر سے ہم سیدھے بیریاں بلہوتہ چلے گئے تھے۔ کچھ سفر ہم نے بس کے ذریعے طے کیا تھا اور اُس کے بعد تقریباً آٹھ کیلومیٹر پیدل چلے تھے۔شام کو ایک جگہ گوجروں کے گھر میں پہنچے تھے۔ بیریاں بلہوتہ میں ہمارا قیام تقریباً ایک ہفتہ رہا تھا اُس کے بعد ماسٹر عباس صاحب اور امیر جماعت عبدالحمید بٹ صاحب نے تمام ساتھیوں سے مشورہ کیا تھا کہ ہماری جماعت کھنیڈ سے کام کرتی ہوئی بسنت گڑھ جائے گی اور پھر وہاں سے رام نگر کے دیہاتوں میں کام کرے گی۔ دُوسرے دن تقریباً ایک ڈیڑھ بجے ظہر نماز کے بعد ہم تمام جماعت کے ساتھی ماسٹر عباس صاحب (جن کا آبائی گاؤں کھنیڈ تھا اور فی الحال رام نگر میں سکونت پذیر تھے) کی رہبری میں کھنیڈ کی طرف چل پڑے۔تقریباً تین کیلومیٹر چڑھائی چڑھتے ہوئے ہمیں پسینہ آگیا تھا۔ کائل، دیودار اور بنج کے پیڑوں میں سے گزرتے ہوئے اس بات کا خدشہ ہو رہا تھا کہ کہیں سے چیتا یا بھالو ہم پہ حملہ نہ کرلے۔ بہ فضلِ اللہ شام نماز کے وقت ہم تین کیلومیٹر چڑھائی چڑھنے کے بعد کینچا نام کی ایک جگہ پہ پہنچے تھے، وہاں مسلمانوں کے دو گھر تھے اور دُور دُور ہندوؤں کے چند گھر آباد تھے۔ہم رات کو کینچا جس گھر میں رہے تھے اُس میں ایک بڑھیا تھی جس کا جوان بیٹا میلی ٹینٹوں نے ایک سال پہلے ذبح کرکے مار دیا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے جوان بیٹے کی لرزہ خیز موت کے غم میں روتے روتے اپنی آنکھوں کی بینائی کھوگئی تھی۔ میں نے خود اُس بُڑھیا کی رُودادِ غم سُنی تھی اور بہت دُکھی ہوگیا تھا۔ میں نے تمام ساتھیوں کو رات کو نعت سُنائی تھی۔ دوسرے دن صبح تقریباً ساڑھے سات بجے ہم

کھنیڈ کے لیے پہاڑی سلسلے کو عبور کرنے چل پڑے تھے۔ ہر ساتھی نے اپنی پیٹھ پہ تقریباً بیس کیلو بوجھ اُٹھایا ہوا تھا۔ جب ہم بستی سے نکل کر بیابان جنگل میں پہنچے تو کچھ خوف سا محسوس کرنے لگے اور جب اوپر کُھلے میدان میں پہنچے تو وہاں سے ہم نے آس پاس نیچے نظر دوڑائی تو بیک نظر کئی میدانی بستیاں نظر آئیں۔ تھوڑی اور چڑھائی چڑھنے کے بعد ہم سیری گلا پہنچے تھے۔ وہاں سے ہم تقریباً تین فُٹ برف میں چلنے لگے۔ برف پوش پہاڑوں سے گزرتے ہوئے ہم چوچرو گلا پہنچے تھے۔ گھنے جنگلوں میں برف پہ چلتے ہوئے ہمارے امیر جماعت عبدالحمید بٹ صاحب نے بڑی سُریلی آواز میں ایک نعت

عرش پہ لکھا دیکھا لآالہ اللہ

آسرا میرے دل کا لآالہ اللہ

گانا شروع کی تھی۔ اُن کے ساتھ ساتھ ہم بھی گانے لگے تھے۔ دیوداروں میں سے گزرتے ہوئے قدرتی ماحول میں ہم سب کی پُر جوش آواز جنگل میں بازگشت پیدا کر رہی تھی۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی عظمت کا نعرہ اُن برفیلے پہاڑوں میں دُور دُور تک گونج رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم سنگ نام کی ایک جگہ پر پہنچے تھے۔ وہاں سے کھنیڈ کا پوار علاقہ ہمیں دکھائی دیا تھا یعنی کدواہ، پنارا، لودرا اور چاروں طرف برف سے لدے پہاڑ ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کھنیڈ میرے اُستادِ محترم پروفیسر ظہورالدّین کا آبائی وطن تھا۔ میری تمنا تھی کہ میں اپنے اُستاد کا وطن دیکھوں۔ اللہ تعالیٰ نے آج میری یہ تمنا پوری کردی تھی۔ پروفیسر ظہورالدّین صاحب کے والد صاحب کا نام خضر دین تھا جو پولیس میں سروس کر چکے تھے۔ پروفیسر ظہورالدّین صاحب نے پرائمری اسکول کھنیڈ سے پانچویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اُن کا بچپن اور لڑکپن کھنیڈ ہی میں گزرا تھا۔ جامع مسجد کھنیڈ کا گنبد دُور سے نظر آیا تو سب ساتھی خوش ہوگئے۔ مسلمانوں کی اس علاقے میں تعداد بہ

نسبت ہندوؤں کے زیادہ ہے۔لوگ محنتی، سیدھے سادے اور مخلص ہیں۔ سیاسی بازی گروں نے آج تک اس خوب صورت اور فطری مناظر سے آراستہ علاقے کو بُری طرح نظر انداز کیا ہے۔ البتہ سابق وزیرِ تعلیم جناب ہرش دیو سنگھ نے پہلے تو ہائی اسکول اور اب ہائر اسکنڈری اسکول منظور کروایا ہے جو اس وقت روبعمل ہے۔ تب سڑک کا نام ونشان نہیں تھا لیکن اب سڑک پہنچ گئی ہے۔ طبی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں، وہاں سے پڑھ لکھ کے جو کہیں پہنچا ہے اُس نے پھر واپس اپنے علاقے کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھا ہے۔ یہ بھی اس علاقے کی پسماندگی کی ایک بنیادی وجہ رہی ہے۔ جب کسی علاقے میں سرکردہ اور سیاسی اثر ورسوخ رکھنے والوں کا فقدان ہو تو وہ علاقہ ترقی کے زینے طے نہیں کر پاتا ہے۔

جس شام ہماری جماعت کھنیڈ کی جامع مسجد میں پہنچی تھی اُس کے دو دن بعد برفباری شروع ہوگئی اور ہمارے امیر جماعت جناب عبدالحمید بٹ صاحب کی کمر میں بھی شدید درد کی ترنگ اُٹھنا شروع ہوگئی تھی۔ اُن کی تکلیف دیکھ ہم سب ساتھی پریشان ہوگئے تھے۔ کانگڑی اور ربڑ کی بوتل میں گرم پانی ڈال کر جب اُنھیں دی گئی تو تب اُنھیں تھوڑی راحت نصیب ہوئی تھی۔ برفباری کی وجہ سے ہم کھنیڈ میں تقریباً دس دن رہے تھے۔ اسی دوران میں نے پروفیسر ظہورالدّین صاحب کا وہ مکان دیکھا تھا کہ جہاں وہ کسی زمانے میں رہتے تھے۔ اُن کی چاچی جو کافی ضعیف العمر تھی اُن سے ملاقات کے دوران خاندانی جانکاری حاصل کی تھی۔ وقت کے بھنور میں انسان کہاں سے کہاں پہنچتا ہے۔ انتہائی سردی کی وجہ سے گشت اور خصوصی ملاقاتیں کرنا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ ایک دن جب دُھوپ نکل آئی تو ہم کدواہ چلے گئے تھے، وہاں پہ میری ملاقات جناب محمد ایوب شیخ لیکچرار کے والدین سے ہوئی تھی۔ کدواہ میں امیر جماعت جناب عبدالحمید بٹ نے وہاں کے لوگوں میں ''مقصد حیات اور خالقِ کائنات'' کے موضوع پر ایک ایمان افروز تقریر کی تھی۔ سبھی اُن کی تقریر سے بے حد

متاثر ہوئے تھے۔ کدواہ میں ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ تقریباً تین سال قبل میلی ٹینٹوں نے یہاں کی دو عورتوں کو ذبح کر دیا تھا۔ یہ خبر انتہائی لرزہ خیز تھی۔ یہاں یہ واضح کر دینا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں جہاد کے نام پہ فساد نے لاکھوں انسانی جانیں تلف کی ہیں۔ کدواہ سے ہم اُسی دن واپس جامع مسجد کھنیڈ چلے آئے تھے۔ کھنیڈ کے ضعیف العمر لوگوں سے جب میں نے کھنیڈ کی وجہ تسمیہ معلوم کی تو اُنھوں نے بتایا کہ انگریزوں کے عہدِ حکومت سے پہلے راجوں، مہاراجوں کے دور میں یہاں سے خام لوہا نکالا جاتا تھا اور اُسے آگے لے جا کر خالص لوہے میں ڈھالا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں راجوں کے درمیان جب تصادم ہوتا تھا تو وہ بندوقوں میں جو گولیاں ڈالتے تھے وہ بھی یہاں کے لوہے کی ہوتی تھیں۔ میں نے کھنیڈ کے علاقے میں زیادہ تر کالے رنگ کی مٹی دیکھی اور کئی جگہوں پہ زنگ آلود مٹی بھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ واقعی اس علاقے سے کسی زمانے میں لوہا برآمد کیا جاتا رہا ہوگا۔

تقریباً دس دن کے بعد ہم کھنیڈ سے بسنت گڑھ کے لیے چل پڑے تھے۔ بسنت گڑھ سے کھنیڈ تقریباً بارہ کیلومیٹر کی دُوری پر واقع ہے۔ دریائے اُجھ کھنیڈ سے کافی دُور اُوپر غالباً کیلاش پربت سے نکلتا ہے اور بالآخر کئی علاقوں سے بہتا ہوا دریائے توی سے جاملتا ہے۔ زیادہ تر ساون اور بھادوں کے مہینے میں یہ دریا طغیانی پر ہوتا ہے۔ مختلف اوبڑ کھابڑ راستوں، سدا بہار جنگلوں سے گزرتے ہوئے ہم تقریباً عصر نماز پہ بسنت گڑھ کی جامع مسجد میں پہنچ گئے تھے۔

بسنت گڑھ جغرافیائی اعتبار سے بہت دلکش اور صحت افزا مقام ہے۔ اب یہ مقام ایک قصبے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ایک طرح سے ٹاپوُ نما لمبائی میں پھیلا ہوا یہ قصبہ آس پاس میں ڈھلوان ہے اور مہاجنوں کی دُکانیں کافی دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس علاقے میں مُسلمان کم اور ہندو زیادہ رہتے ہیں لیکن انسانیت اور بھائی چارے کے ساتھ جی رہے ہیں۔ اُن دنوں وہاں پہ فوج کا ایک بہت بڑا کیمپ تھا۔

سڑک ابھی خاص بسنت گڑھ نہیں پہنچی تھی۔ البتہ ہائر اسکنڈری اسکول بن چکا تھا۔
بسنت گڑھ میں جنوری، فروری کے مہینے میں کڑاکے کی ٹھنڈ پڑتی ہے۔ ہوااتنی زیادہ
تیز چلتی ہے کہ آدمی ٹھٹھرنے لگتا ہے۔ ہم تقریباً ایک ہفتہ یہاں رہے تھے اور ایک ہفتے
کے بعد ہماری جماعت ایک دوسری مسجد چکّہ چلی گئی تھی۔ یہ مسجد گھنے دیوداروں کے
وسط میں تھی۔ اس مسجد میں ہمارا قیام تقریباً پانچ دن رہا اور پھر ہم یہاں سے رام نگر کی
طرف روانہ ہوگئے تھے۔ ہم چکّہ کی مسجد سے پیدل کافی دُور پہلے اُترائی اور پھر
چڑھائی چڑھنے کے بعد سڑک پر پہنچے تھے۔ سڑک پہ رام نگر جانے والی بس کھڑی تھی۔
ہم نے اپنا سامان بس پہ لوڈ کروایا اور خود سب دُعا پڑھتے ہوئے سیٹوں پہ بیٹھ گئے
تھے۔ گندٹاپ، مجوڑی، کلونتا سے ہوتے ہوئے ہم تقریباً تین بجے رام نگر کی جامع مسجد
میں پہنچ گئے تھے۔ دُوسرے ہی دن زور کی بارش شروع ہوگئی تھی۔ تمام ساتھی سردی
سے ٹھٹھرنے لگے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ہم سب پہ بڑے احسانات تھے۔ وہاں کے
مقامی ایمان والوں نے بالخصوص ماسٹر عباس صاحب اور پٹواری ٹاک صاحب نے
ہمارے لیے تمام انتظامات کیے تھے۔ دعوتِ حق کی عظیم محنت اور اس کی عظمت کے
پیش نظر ہمیں بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔ کوئی چار دن کے بعد ہم رام
نگر کے ایک پہاڑی علاقے میں بھیج دیئے گئے تھے۔ اُس علاقے کا نام بیرنو ہے۔ ہم
تقریباً دس دن اُس علاقے میں کام کرتے ہوئے پیدل چل کر پھر رام نگر کی جامع مسجد
میں پہنچ گئے تھے اور اسی مسجد میں رہتے ہوئے ہم نے عیدالبقر منائی تھی۔ عیدگاہ میں
نماز پڑھی تھی۔ تقریباً تین سو آدمیوں نے نمازِ عید پڑھی تھی۔ نماز سے قبل جناب
عبدالحمید بٹ نے ''مقصدِ زندگی اور موجودہ دور کے مسلمانوں کا کردار'' کے حوالے
سے ایک پُراثر اور ولولہ انگیز تقریر کی تھی۔ ہمارے چلّے کے آخری پانچ دن رام نگر قصبے
ہی کی ایک دوسری مسجد میں گزرے تھے۔ اُس کے بعد ہم اُدھم پور سیلاں تالاب جامع
مسجد چلے آئے تھے۔ یہاں پہ تمام جماعتیں جو چالیس دن کے لیے اللہ کے راستے

میں گئی تھیں اب وقت پورا ہونے کے بعد اپنے گھروں کو جا رہی تھیں، اجتماعی صورت میں بزرگوں کی آخری نصیحت آمیز باتوں کو سُننے آئی تھیں۔ رات کو مغرب نماز کے بعد ایمان اور دعوتِ الی اللہ کے موضوع پر نا معلوم کس بزرگ نے تقریر کی تھی اور پھر صبح کارگزاری کے بعد ناشتہ، اُس کے بعد دُعا و مصافحہ ہوا تھا اور تمام ساتھی ایک دوسرے سے رُخصت لے کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔

....

2006ء جنوری، فروری کے مہینوں میں، میں نے جموں سنجواں (فردوس آباد) میں اپنے مکان کی تعمیر شروع کروائی جس کی وجہ سے میرے چالیس دن اللہ کی راہ میں نہیں لگ سکے۔ البتہ دسمبر 2006ء کے آخری ہفتے میں اُدھم پور کی جامع مسجد سیلاں تالاب سے اللہ تعالیٰ کے دین پہ زندگی گزارنے کی عملی مشق کی خاطر چالیس دن کے لیے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ ہماری جماعت کا رُخ بلاور کی طرف طے کیا گیا تھا۔ اس جماعت میں تقریباً 13 افراد تھے، محمد سعید صاحب ہماری جماعت کے امیر تھے جو محکمۂ زراعت میں اسسٹنٹ کے عہدہ پر فائز تھے۔ بہت شریف النفس اور نیک انسان کہ جنھوں نے نہایت پیار و محبت اور فکر و احساس کے ساتھ تمام ساتھیوں کی تربیت کی تھی۔ بلاور سے تقریباً دس کیلومیٹر پیچھے ایک گاؤں کی مسجد میں ہماری جماعت ٹھہری ہوئی تھی کہ کسی بے ایمان کی مہربانی سے فوج کا کیپٹن تقریباً دس سپاہیوں کے ہمراہ مسجد میں داخل ہوا تھا اور پوری جماعت کے ہر فرد کے سامان کو چیک کیا گیا اور مکمل جانکاری حاصل کرنے کے بعد سب کے فوٹو کھینچے گئے تھے۔ ہماری جماعت بلاور کے پہاڑی اور میدانی علاقوں میں کام کرتی ہوئی مانڈلی، ڈُرنگ، ہلنی اور لڈیرا پُل جیسے علاقوں کی مساجد میں قیام کر چکی تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی اور کچھ دن تک بارش نے بھی کافی پریشان کیا تھا لیکن تمام ساتھیوں نے بلند ہمتی اور جوانمردی کا ثبوت دیتے ہوئے محض اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے

کے اشتیاق میں سب کچھ برداشت کیا تھا۔ جماعت نہایت فعال تھی۔ بلاور، ضلع کٹھوعہ کی تحصیل ہے جو گرم علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس علاقے میں آم، سنگترہ، کیلا اور امرود زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ بلاور کافی میدانی علاقہ ہے۔ یہاں چار فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس علاقے میں مسلمان کم اور ہندو زیادہ رہتے ہیں۔ راجوں اور مہاراجوں کے دور میں بنی باولیاں اور گہرے پانی کے کنوئیں تقریباً ہر گاؤں میں ہیں۔ ہم بلاور کی ایک مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ حدیث کی تعلیم چل رہی تھی کہ اتنے میں فوج کے چند نوجوان مسجد کے احاطے میں داخل ہوئے۔ اُن کا آفیسر اُن کے ساتھ تھا۔ میلی ٹینسی کے باعث اس علاقے میں پولیس اور فوج کے دستے زیادہ تر گشت پر رہتے تھے۔ اس لیے کسی بے ایمان نے ہمارے خلاف شکایت کی تھی جس کی وجہ سے فوج کے یہ چند نوجوان اپنے آفیسر کے ساتھ مسجد میں ہماری شناخت اور مشن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔ فوجی آفیسر نے تمام ساتھیوں کے نام مع پتہ ایک کاغذ پر نوٹ کیے تھے اور بار بار امیر جماعت سعید صاحب سے پوچھ رہا تھا کہ آپ کا کیا مشن ہے؟ لوگوں کو کیا سمجھاتے ہو؟ اُنھوں نے جواب دیا تھا کہ ہمارا مشن اسلام کا پیغام پُر امن طریقے سے پوری دُنیا کے انسانوں تک پہنچانا ہے۔ لوگ جو بُرائی میں مبتلا ہیں اُنھیں نیک کام کرنے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ دُنیا میں امن وسلامتی کا ماحول قائم ہو سکے۔ فوج کا آفیسر مطمئن ہو کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس چلا گیا تھا۔

لڈیرا کی مسجد میں ہم تقریباً چار دن ٹھہرے تھے۔ وہاں ایک زیارت بھی ہے جو پُل کے پاس ہی ہے۔ دریائے اُجھ کے کنارے یہ زیارت ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک مشترکہ ورثہ ہے لیکن میں نے یہاں برائے نام مسلمان مشرکانہ حرکتیں کرتے دیکھے۔ آج بلاور میں ڈگری کالج ہے۔ اُس دور میں نہیں تھا۔ سڑک کافی کشادہ بنائی گئی ہے جس میں دوطرفہ گاڑیوں کی آمد ورفت رہتی ہے۔ بلاور سے تقریباً پندرہ کیلو

میٹر پیچھے گُڑاکلال نام کا ایک گاؤں ہے۔ یہاں میری خالہ زاد بہن رہتی ہے جس کا شوہر عین جوانی میں فوت ہو گیا تھا اور پیچھے چار بچّے رہ گئے تھے۔ایک روز میں اپنے جماعت کے ساتھی کے ساتھ اُس بہن کے پاس بھی گیا تھا۔اُس کے کئی زخم تازہ ہو گئے تھے۔ وقت اور حالات نے اُسے جیسے کسی گہری خندک میں ڈال دیا ہو مگر اس کے باوجود وہ اپنے بچّوں کی بہتر تعلیم و تربیت اور اُن کے روشن مستقبل کی فکر میں جُٹی ہوئی ہے۔

نلنی سے ہم رام کوٹ چلے آئے تھے۔ یہاں بھی فوج کا ایک بڑا کیمپ تھا لیکن ہم بڑے آرام اور اطمینان سے یہاں سے گزر گئے تھے کسی نے بھی ہمارے شناختی کارڈ نہیں دیکھے تھے۔ مختلف راستوں اور مقامات سے گزرنے کے بعد ہماری جماعت اُدھم پور چلی آئی تھی۔ میں اور میرے ساتھ محمد ایوب شیخ اُدھم پوری کے چلّہ پورا ہونے میں ابھی دس دن باقی تھے چنانچہ اُدھم پور سیلاں تالاب سے ہم ایک اور جماعت کے ساتھ بھیج دئے گئے اور محمد ایوب شیخ کو ہمارا امیرِ جماعت مقرر کیا گیا۔ کرمچی اور چک وغیرہ کے علاقے کی طرف ہمارا رُخ طے کیا گیا تھا۔ ہم تقریباً گیارہ افراد تھے۔ کرمچی میں، میں نے پہلی بار پانڈوؤں کے مندر دیکھے تھے۔ میری عقل حیران رہ گئی تھی۔ قدیم زمانے کے یہ مندر جو خالص پتھروں سے تعمیر کیے گئے ہیں انتہائی خوب صورت چتر کاری کا نمونہ ہیں۔انھیں دیکھ کے اُس دور کے انسانوں کی فنِ تعمیر و تمدن کی ایک واضح جھلک سامنے آتی ہے۔ آج یہ مندر محکمہ آثارِ قدیمہ کی زیرِ نگرانی ہزاروں سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ جنوری اور فروری کے مہینے میں بہت زیادہ سردی ہوتی ہے۔ ہم سب ساتھیوں نے صبر و تحمل اور مجاہدے و مشاہدے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نظاروں اور راستوں کو دیکھا تھا اور بالآخر ہمارا وقت پورا ہوا تھا۔ ہم سب جامع مسجد سیلاں تالاب میں آئے تھے۔ یہاں بزرگوں نے ہماری کارگزاری لی تھی۔ اُنھوں نے ہمیں چند اہم ہدایات دی تھیں۔اُس کے بعد ہم

ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے دین اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے۔

....

جنوری 2007ء میں، میں جموں میں اپنے مکان کو پلستر کروانے کی وجہ سے دعوتِ حق کے لیے گھر سے نہیں جا سکا۔ البتہ دسمبر 2008ء کی تقریباً 27 تاریخ کو میں اکیلا گھر سے چوپڑا شاپ (اُدھم پور) آیا تھا۔ یہاں مغرب کی نماز کے بعد بزرگوں نے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ میں گل محمد صاحب جن کی ڈیوٹی فوجی گاڑی چلانے کی تھی وہ گاڑی لے کر راجوری جا رہے تھے اُن کے ساتھ جموں بھیج دیا گیا۔ اُنھوں نے مجھے ملک مارکیٹ جموں جامع مسجد میں پہنچایا اور خود فجر نماز پڑھنے کے بعد راجوری چلے گئے۔ مجھے بزرگوں نے امیر جماعت جناب محمد طفیل جکھیڈ والے کی جماعت میں بھیج دیا۔ اُن کی جماعت چھنی اور ملک مارکیٹ میں کام کر رہی تھی۔ اس جماعت میں تقریباً سبھی ساتھی لاٹی ڈھونہ اور جکھیڈ کے تھے۔ پندرہ افراد پہ مشتمل یہ جماعت ملک مارکیٹ، حاجی کالونی، چوادی اور ڈیرہ سے کام کرتی ہوئی سانبہ چلی گئی تھی۔ اُن دنوں چاروں طرف دُھند چھائی رہتی تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ دعوتِ حق کی عظیم محنت کا جذبہ تمام ساتھیوں میں موجود تھا۔ حاجی کالونی میں جناب چودھری راج محمد کے چھوٹے بھائی نے ہمیں اپنے نئے خالی مکان میں تقریباً چار دن تک بڑے آرام کے ساتھ رکھا تھا۔ کچھ دن کے بعد ہماری جماعت سانبہ چلی گئی تھی۔ سانبہ اب ضلع ہے کچھ برس پہلے یہ تحصیل تھی۔ یہ میدانی علاقہ ہے۔ گندم کی فصل کے علاوہ یہاں دھان بھی کافی پیدا ہوتا ہے۔ زیادہ تر ہم نے پیدل ہی سفر طے کیا تھا۔ سانبہ کے ایک گاؤں کی مسجد میں ہماری جماعت ٹھہری ہوئی تھی اور مسجد کے بالکل آگے باہر زمینداروں کے کھیتوں کے قریب جنگل تھا وہاں صبح صبح جنگلی مرغے باری باری گندم کا بیج چگنے چلے آتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اُن پرندوں کا جھنڈ بن جاتا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ قدرت کا یہ عجیب نظارہ دیکھا تھا۔ ہمارے ساتھی جونہی اُن جنگلی مرغوں کو پکڑنے کی کوشش

کرتے تو وہ پھُر سے اُڑ جاتے۔ ہمیں اُنھیں پکڑنے کی حسرت رہ جاتی۔ سانبہ کے ایک دوسرے گاؤں ساندی میں بھی ہماری جماعت نے کام کیا تھا۔ وہاں ہم نے سب سے زیادہ مور دیکھے تھے۔ ہمارے ملک کا یہ قومی پرندہ دیکھ کر میرا دل خوش ہو جاتا۔ آٹھ دس مور ہمیں اکٹھے آہستہ آہستہ جنگلوں، بیابانوں میں ٹہلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ میرا جی اُنھیں دیکھ کر مچل مچل جاتا تھا۔ میرا جی مور کو پکڑنے کو چاہتا مگر یہ پرندوں کا راجا بآسانی کس کے ہاتھ آتا ہے!

12، 13 جنوری 2009ء کو جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے زیر اہتمام ایک سیمینار ہوا تھا جس کا موضوع تھا ''جموں و کشمیر میں اردو: ماضی، حال اور مستقبل'' میں نے بھی اس سیمینار میں اپنا مقالہ بعنوان ''جموں و کشمیر میں اُردو مہاراجاؤں کے دور سے مستقبل کے خدشات تک (چند حقائق)'' پڑھا تھا۔ اُس وقت کے جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ورُن ساہنی، جناب پروفیسر حامدی کاشمیری، جناب پروفیسر ریاض پنجابی (اُس وقت کے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر) اور کئی معزز مردوں، خواتین اور طلبہ و طالبات کی ایک بھاری تعداد اس سیمینار میں موجود تھی۔ ناچیز کے مقالے پر تمام سامعین نے داد دی تھی۔ یہ مقالہ میں نے اپنے امیر جماعت جناب محمد طفیل کی اجازت سے تقریباً دس دن میں لکھا تھا۔ اسی چلّے میں اللہ رب العزت نے مجھ سے ''باغی'' نام کی کہانی لکھوائی تھی جو بعد میں پروفیسر وہاب اشرفی کے معیاری رسالہ ''مباحثہ'' (پٹنہ) اور سہ ماہی ''تحریکِ ادب'' (وارنسی) میں شائع ہوئی تھی۔

سانبہ میں مسلمان کم اور ہندو زیادہ ہیں لیکن آپس میں میل ملاپ، رواداری اور بھائی چارے کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ ساندی میں ماسٹر محمد صدیق صاحب سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی اُن کے ساتھ مجھے ایک بار بھوپال میں چلّہ لگانے کا موقع ملا تھا۔ اُنھوں نے بھی ہماری جماعت کی کافی نصرت کی تھی۔ ساندی میں اُنھوں نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا ہے جس میں اُن کا بڑا بیٹا مہتمم کے طور پر

کام کرتا ہے وہ عالمِ دین ہے۔ساندی میں ہم تقریباً ایک ہفتہ رہے تھےاور پھر وہاں سے پیدل چل کر سڑک کے کنارے والی مسجد میں آئے تھے۔ وہاں ایک اجتماع ہوا تھا جس میں مولانا مُنیر صاحب پونچھی سے ہم سب ساتھیوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ساندی سے ہم بس میں سوار ہوکر جموں جامع مسجد اُستاد محلّہ چلے آئے تھے۔اب ہمارا چلّہ پورا ہونے میں کچھ ہی دن باقی رہے تھے۔استاد محلّہ میں ہماری جماعت چار دن تک ٹھہری تھی۔ یہاں ہم نے خصوصی ملاقاتیں، گشتیں اور مغرب کے بعد دین حق کی محنت کے سلسلے میں لوگوں کو دعوت دی تھی۔ چند لوگ بیٹھتے تھے اور بھاری مجمع اُٹھ کر چلا جاتا تھا۔میرے ساتھی چار دن کے بعد مجھ سے بچھڑ گئے تھے اور میں چونکہ تین دن بعد جماعت میں شامل ہوا تھا اس لیے میں نے بقیہ تین دن اُدھم پور کی جامع مسجد میں لگائے تھے اس طرح اپنا چلّہ پورا کیا تھا۔سانبہ اور جموں کے گردونواح میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میرا یہ چالیس دن کا رُوحانی سفر نہایت موثر اور متاثر کن ثابت ہوا تھا۔

....

2010ء جنوری، فروری میں میرے چالیس دن اللہ تعالیٰ کے راستے میں نہیں لگ سکے کیونکہ میں فردوس آباد نجواں جموں میں اپنے مکان کو رنگ وروغن کرواتا رہا جس کی وجہ سے دعوتِ حق کے سفر سے محروم رہ گیا۔

جون 2013ء میں مجھے گوجر نگر جموں سے چالیس دن کے لیے جماعت میں جانا نصیب ہوا۔اس جماعت کا امیر عادل نام کے ایک شریف نوجوان کو بنایا گیا تھا۔ یہ جماعت زیادہ تر نوجوانوں پہ مشتمل تھی۔ ماسٹر فرید صاحب اور میں اس جماعت میں عمر کے لحاظ سے بڑے تھے۔ جماعت کا رُخ وادئ کشمیر کی طرف طے کیا گیا اور ہم تقریباً دس آدمیوں کی جماعت ضلع اننت ناگ (جسے اسلام آباد بھی کہتے ہیں) کے دیہی علاقوں میں کام کرتے رہے۔ہم نے زیادہ تر پیدل سفر کیا تھا اور ایک عشرہ ماہ صیام میں لگایا تھا۔اب مجھے اُن مساجد اور جگہوں کے نام بھول گئے ہیں جہاں جہاں

ہم چلے اور رہے تھے۔ بس سب اللہ کا کرم اور احسان رہا ہے کہ سردی گرمی، بارش اور دُھوپ میں اللہ کی راہ میں چلنا نصیب ہوا۔

....

بہرحال اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے ہی کی بنیاد پہ نہیں بلکہ صاحب بصیرت اور مشائخ وصوفیائے کرام کا بھی اس بات پہ اتفاق ہے کہ ایک فاسق وفاجر شخص اگر دعوتِ اسلام کی محنت میں لگ جائے اور اپنے مال، جان اور وقت کی قربانی دے کر اللہ تعالیٰ کے راستے میں پہلی فرصت میں چالیس دن کے لیے نکل جائے اور پھر دعوتِ حق کے اُصولوں اور ضابطوں کے مطابق عمل کرے تو وہی فاسق وفاجر شخص مُتقی، پرہیز گار اور تہجد گزار بن سکتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بہت سے لوگ محض سیر وتفریح کی نیت سے چالیس دن کے لیے اپنے گھربار، بیوی بچّوں اور علاقے سے دُور چلے جاتے ہیں، اس غرض سے جب وہ واپس آتے ہیں تو مقام پہ آ کے نہ گشتوں میں جُڑتے ہیں نہ مشورے میں، نہ حدیث کی تعلیم کرتے ہیں نہ تین دن لگاتے ہیں۔ غرضیکہ یہی لوگ اس دعوت کی عظیم محنت کے راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ دعوتِ اسلام یا دعوتِ الی اللہ چونکہ ہر نبی کی ایک مُستقل سُنت رہی ہے۔ اس لیے اس کارِ نبوت میں لگنے والوں کی دُعائیں قبول ہوتی ہیں اور اللہ کی مدد ونُصرت اُن کے شامل حال رہتی ہے۔ اس کام کو چھوڑنے والوں پر اللہ کی فوراً پکڑ آتی ہے۔ اس کام میں لگے لوگوں پر ہنسی مذاق کرنا یا اُن سے نفرت کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے کیونکہ یہی لوگ راہِ راست پر ہیں۔ بزرگوں سے سُنا ہے کہ آخری زمانے میں 'اسلام' کے نام پر 72 فرقے ہو جائیں گے۔ اُن میں صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا باقی سب فرقے جہنم میں جائیں گے۔ وہ فرقہ ہوگا اہلِ سُنت والجماعت یا بالفاظِ دیگر جس نے قرآن وحدیث کے مطابق زندگی بسر کی ہوگی۔ میں خود دعوت حق بالفاظ دیگر تبلیغی جماعت سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ نہ صرف متاثر ہوں بلکہ میرا دینی

شعور دعوت وتبلیغ کے زیر سایہ پروان چڑھا ہے۔ دین اسلام کے نام پہ بہت سے ادارے تو قائم ہیں جو اپنی استعداد کے مطابق کام کررہے ہیں لیکن جہاں تک دعوت وتبلیغ یا تبلیغی جماعت یا تبلیغی تحریک کہیے کا تعلق ہے، اس سلسلے میں میرا عملی مشاہدہ وتجربہ یہ کہتا ہے کہ یہی واحد دُنیا کی ایک ایسی جماعت ہے جو قرآن وحدیث کے عین مطابق اپنی جان، مال اور وقت کی قربانی کے ساتھ دُنیا کے کونے کونے میں ہم سب کو نظر آتی ہے۔ تقریری دین کے نام پر بہت سی تحریکیں موجود ہیں لیکن عملی طور پر کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ہاں اِن اللہ والوں کی مخالفت، اِن کی نکتہ چینی، اِن کو جاہل، لاعلم، بے کار اور نہ جانے کیا کیا الزامات دینے والوں کی ایک بھاری تعداد ہم کو نظر آتی ہے۔ کیونکہ چار ماہ اور چالیس دن کے لئے دین اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کی تربیت حاصل کرنے کے لئے مخالفین اپنی بیوی، بچّوں، گھر اور خاندان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ پیغمبروں، صحابہ کرام، تابعین، تبا تابعین، بزرگان دین، اولیائے کرام، صوفیائے کرام اور بزرگاں دین نے کی ہے۔ اس لئے میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر بڑے وثوق اور یقین کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ بڑا خوش نصیب ہے وہ شخص جسے دعوتِ حق وتبلیغِ اسلام کی خوشبو نصیب ہوجائے۔ میں نے ذاتی طور پر جو سکون وراحت دعوت کی محنت میں لگنے کے بعد محسوس کیا ہے وہ کہیں دوسری جگہ محسوس نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرنے سے پہلے دُنیا کے ہر انسان کو دعوت وتبلیغ کی محنت میں لگادے۔ آمین!

....

دورِ حاضر میں بُرائیاں ہی بُرائیاں نظر آرہی ہیں۔ آزادی کے نام پر جرائم کا گراف بڑھ گیا ہے۔ پوری دُنیا میں بدامنی، دہشت گردی، استحصال، غنڈہ گردی، عریانیت، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا آزادانہ جنسی اختلاط، ٹیلی ویژن، لیپ ٹاپ، انٹرنیٹ اور موبائل فون کے غلط استعمال کی وجہ سے کم عمر لڑکے اور لڑکیاں اپنی دُنیا اور آخرت

کی زندگی تباہ کر رہے ہیں۔ بے ایمانی، دھوکہ وفریب اور ہر چیز میں ملاوٹ، رشوت، چوری، لُوٹ مار، ظلم وتشدّد اور حیا سوز حرکتیں یہ تمام مایوس کُن صورت حال محض ایمان کے فقدان کی دین ہے۔ موت، خدا اور آخرت کو آج کا انسان بھول چکا ہے۔ ہم نے جیسا بویا ہے ویسا ہی کاٹ رہے ہیں۔ آج کے انسان کو کپڑے دھونے کی مشین میسر ہے، سونے کے لیے آٹھ انچ کا موٹا خوب صورت گدّا اور قیمتی لحاف پڑی ہے لیکن نیند نہیں آتی کیونکہ دل میں سکون نہیں اور ذہن پراگندہ ہے۔ کھانے پینے کی تقریباً ہر چیز موجود ہے لیکن بھوک نہیں لگتی کیونکہ طرح طرح کی بیماریوں نے اُس کے جسم کے آنگن میں ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کا انسان روٹی کم اور دوائی زیادہ کھاتا ہے کیونکہ اُس نے اپنی تمام صلاحیتیں مشینوں کے حوالے کر دی ہیں۔ ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔ جب موجودہ دور کے انسان کے پاس ایمان جیسی عظیم نعمت نہیں رہی تو وہ اس قدر بے ایمان ہو گیا کہ دیسی گھی میں بُھنے ہوئے آلو، لال مرچ میں پسی ہوئی اینٹیں اور مصالحے میں گھوڑوں کی لید، دُودھ میں پانی، ہلدی میں خشک رنگ اور تیل میں مٹّی کا تیل ملا کر بیچنے لگا! دھن دولت کی حرص اور ناجائز خواہشات کی ہوس میں آج کے انسان نے تمام اخلاقی ورُوحانی قدروں کا جنازہ نکال دیا ہے۔ اس بدترین سماجی صورت حال کو بدلنے کے لیے ایمان جیسی عظیم نعمت کی اشد ضرورت ہے۔ ایمان ہی کی بنیاد پر ہم سب ایک پُر امن، باوقار اور پُر سکون زندگی جی سکتے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ایمان کسی دُکان سے خریدا نہیں جاتا اور نہ ہی یہ کوئی ٹھوس چیز ہے کہ جسے بند کسی صندوق میں رکھا جائے بلکہ ایمان تو دل کی کوٹھری میں رہتا ہے کہ جو ایک مخصوص کیفیت اور رویّے کا نام ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ ایمان کا براہِ راست تعلق ہمارے نیک اعمال سے ہے۔ اس لیے اگر آج کا انسان امن وسکون، ترقی وخوشحالی اور ایک باعزت زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اُسے دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر دعوتِ اسلام کی محنت میں لگ جانا چاہیے۔

....

موجودہ دور کے بہت سے برائے نام مسلمانوں میں فخرِ دوعالم حضرت محمدؐ کی کوئی بھی پاکیزہ اور نُورانی سُنت اپنانے کا مزاج نہیں ہے۔ ہم نے ایک ہی سُنت کو یاد رکھا ہے اور وہ ہے بچّے کا ختنہ۔ پانچ وقت کی نماز وقت کی پابندی کے ساتھ ہم نہیں پڑھتے جب کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے'' اب ہم خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے کتنے بھائی، بہنیں ایسے ہیں جو بالکل نماز پڑھتے ہی نہیں۔ ذرا سوچیں کیا وہ اللہ کے پیارے نبیؐ کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں؟ داڑھی جسے مرد کا زیور کہا گیا ہے کیونکہ عورتوں کو داڑھی نہیں ہوتی ہے۔ داڑھی تو ہمارے نبیِ اکرمؐ کی ایک مستقل سُنت رہی ہے اور یہ مُسلمان کی پہلی پہچان ہے لیکن آج سب سے زیادہ برائے نام مسلمان داڑھیاں منڈواتے ہیں اور کچھ لوگ اس مستقل سُنت کو بڑھاپے میں اپنانے لگتے ہیں۔ نوجوان محض اس لیے داڑھیاں منڈواتے ہیں کہ اُن کے خیال میں داڑھی رکھنا بوڑھوں کا کام ہے۔ اسی طرح بہت سی سُنتوں اور فرائض کو بڑھاپے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن بقول مومن خان مومنؔ:

عمر گزری عشقِ بُتاں میں مومنؔ
آخر وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

یہ بات انتہائی قابلِ افسوس ہے کہ اسلام کو سب سے زیادہ نقصان برائے نام مسلمانوں نے پہنچایا ہے۔ قُرآن وحدیث کی تعلیمات کو عام کرنا یا اس کی عمومی دعوت دینے کا کام اور ذمہ داری تو مسلمانوں کی تھی لیکن اُنھوں نے اسے طاقِ نسیاں پہ رکھ دیا اور خود دُنیا کی رنگ رلیوں میں کھو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج برائے نام مسلمان گمراہی، ذلّت ورُسوائی اور غلامانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس پستی اور گمراہی سے نکل کر ایک باوقار زندگی جینے کے لیے ہمیں پھر ایمان کی راہ کو اپنانا ہوگا۔ ورنہ بصورتِ دیگر ہم اور ہماری نسلیں بُری طرح تباہ وبرباد ہو کے رہ جائیں گی۔ ایمان داری اور صاحب ایمان ایک بہتر سماج ومعاشرے کی بنیادی ضرورت ہیں۔ ہر کوئی یہ چاہتا

ہے کہ میرا واسطہ ایماندار آدمی سے پڑے تاکہ میری تجارت اور کاروبار میں ترقی ہو اور نہ صرف تجارت اور کاروبار میں بلکہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں ہر کوئی ایماندار آدمی کو پسند کرتا ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان دار آدمی آئے گا کہاں سے؟ ظاہر ہے کوئی بھی چیز خو بخو د تیار نہیں ہوتی، اُس پہ جان لگتی ہے، مال لگتا ہے اور وقت بھی لگتا ہے۔ جب ہر چیز محنت سے تیار ہوتی ہے تو کیا ایمان دار آدمی بننے کے لیے کوئی محنت نہیں ؟ ایمان بنے گا ایمان کی مجلسوں میں، ایمان کے بول سُننے اور بولنے سے اور پھر جب ایمان پہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے تو پھر وہ حرام نہیں کھاتا، حلال کھاتا ہے۔ جھوٹ نہیں بولتا، ہر حال میں سچ بولتا ہے، پھر وہ دھوکہ وفریب، لڑائی جھگڑے، دنگے فساد نہیں کرتا بلکہ اُسے دیکھ کے ہر کسی کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔

....

محترم قارئین! یہاں تک میں نے اسلامی دعوت وتبلیغ کی محنت کے سلسلے میں اُن اہم حالات وواقعات اور اسفار کا ذکر کیا جن کا براہِ راست تعلق میرے دینی شعور اور میرے مُشاہدات وتجربات سے رہا ہے لیکن جب میں اپنی گذشتہ زندگی کے سفر پہ نظر کرتا ہوں تو اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی کئی تلخ یادیں میرے ذہن ودل کے دامن کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ میری آنکھوں نے آج تک جو کچھ دیکھا ہے، ذہن نے اُسے محفوظ رکھا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ آدمی جہاں پیدا ہوتا ہے، پلتا بڑھتا ہے، وہ مقام، وہ ماحول اُس کا مادرِ وطن کہلاتا ہے کہ جس سے اُسے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ وہ دُنیا کی سیر کیوں نہ کر لے لیکن اپنی جائے پیدائش کی بُو باس اور اُس مٹّی کی خوشبو کو وہ ہرگز نہیں بھول پاتا ہے۔

علاقہ 'مرمت' کہ جہاں میں پیدا ہوا ہوں جغرافیائی اعتبار سے بہت زیادہ ڈراونا علاقہ ہے۔ اس لیے کہ چاروں طرف کالے پہاڑ کھڑے یوں دکھائی دیتے ہیں کہ جیسے آسمان سے باتیں کر رہے ہوں اور رگی نالا یا کھلینی سے پیچھے دیکھیں تو یقین

نہیں آتا کہ یہاں سے پیچھے بھی انسانوں کی بستی آباد ہو گی لیکن اس سب کے باوجود مجھے اپنے مادرِ وطن سے بہت محبت ہے جو تادمِ حیات باقی رہے گی۔ میرے خاندان کے بزرگ، بھائی، بہنیں، رشتے دار، گاؤں کے وہ لوگ جن کے ساتھ میرا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا زمانہ گزرا ہے یا وہ جنگل، راستے، پہاڑ، ندی نالے، آبشار، جھرنے اور وہ مقامات کہ جہاں جہاں میں گیا ہوں یا جن لوگوں سے میرا واسطہ رہا ہے سب آج بھی بہت یاد آتے ہیں اور اس موقعے پہ کسی شاعر کے شعر کا یہ مصرع میرے سسکتے ہوئے جذبات پہ صادق آتا ہے کہ ؎

میں رو پڑتا ہوں جب گزرا زمانہ یاد آتا ہے

....

محلّہ سروال، گاؤں بہوتہ، علاقہ مرمت، تحصیل وضلع ڈوڈہ (جموں وکشمیر) کہ جہاں میں پیدا ہوا تھا، آج بھی میرے ذہن میں اُس کی یادیں تازہ ہیں۔ میرا آبائی گاؤں بہوتہ، مرمت کا واحد وہ گاؤں ہے جو باقی تمام گاؤں سے زیادہ خوب صورت اور ہموار ہے۔ اس گاؤں کو مرمت کا سب سے پسماندہ گاؤں ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ محلّہ سروال اس گاؤں کے ایک کنارے پہ واقع ہے کہ جہاں سے ایک گنجان جنگل شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ جنگل ہے جس میں مختلف طرح کے پیڑ پودے موجود ہیں۔ اسی جنگل میں، میں نے لڑکپن میں مال مویشی اور بھیڑ بکریاں چرائی ہیں۔ سکُول گٹ، تھتھری، پیڑالی، گوگل نالا، پُرانا کدل، مکڑناڑ، کینٹھی پھاٹ، ریڑی، ایشرن گٹ، کھلاڑ و اور گوہلائیاں اس جنگل کے مختلف حصوں کے نام ہیں کہ جہاں میں نے بھیڑ بکریاں چرانے کے ساتھ میر تقی میرؔ، غالبؔ، علامہ اقبالؔ، فیض احمد فیضؔ، حفیظؔ جالندھری، اسماعیلؔ میرٹھی اور سیمابؔ اکبر آبادی کی نظمیں پڑھی ہیں۔ زور زور سے سیٹی بجائی ہے، محمد رفیع کے گائے نغمے گائے ہیں، مختلف طرح کے پرندوں کی چہچہاہٹ سُنی ہے، آگ جلائی ہے اُس کے سامنے بیٹھ کر گھر سے ساتھ لی مکئی کی روٹی

کھائی ہے، ٹھنڈے میٹھے چشموں کا پانی پیا ہے، صاف وشفاف فضا میں سانس لی ہے، جلانے کے لیے لکڑی ڈھوئی ہے اور اُس بکری کی ٹانگ میں لکڑی کا کڑا باندھا ہے جو چپکے سے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ سے نکل کر لوگوں کے کھیتوں میں فصل اور سبزیاں کھانے چلی جاتی تھی۔

میں نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے خاندان کے بزرگوں میں ابا، امّی، سگے دادا، دادی اور سگے بھائیوں، بہنوں کے علاوہ دادا ثنا اُللہ، دادا عمر دین، چچا محمد سلطان، چچا محمد رمضان، چچا غلام احمد، چچا محمد انور، چچا عزیز الدّین، چچا غلام رسول، چچا محمد خوشحال، چچا حبیب اُللہ، چچا عبدالغنی، چچا محمد اکرم، چچا محمد اقبال، چچا غلام نبی، چچا عبدالکریم کو اپنے آس پاس پایا۔ ان خاندان کے بزرگوں میں آج صرف چچا محمد انور، چچا محمد رمضان، چچا حبیب اُللہ، چچا غلام رسول اور چچا محمد اقبال حال حیات ہیں۔ باقی تمام اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے آمین!

دادا عمر دین پیشے سے گوال تھے (بھیڑ بکریاں چراتے تھے) تقریباً دوسو سے زیادہ بھیڑ بکریاں ہر سال وہ اپریل میں اپر بہوتہ سے کافی دُور پیچھے ٹُرنگل گھٹ، لما کھرت، دروڑ، کھادری، زڑّوٹھ، رام رچن اور ریالی پہاڑ پر چرانے کے لیے لے جاتے تھے۔ میں نے جون، جولائی کے مہینے میں ٹُرنگل گھٹ اور لما کھرت میں جا کر بھیڑوں کی اُون کتری ہے۔ جون، جولائی کے مہینے میں جب اپر بہوتہ سے پیچھے آدمی گزرتا ہے تو قدرتی نظاروں سے لُطف اندوز ہوتا ہے۔ گھنے دیوداروں، کائل، توس اور فر کے دیو قامت درختوں کا ایک لا متناہی سلسلہ ہے۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو اور طرح طرح کی جڑی بوٹیوں کی سوگندھ دماغ کو معطر اور روح کو تازگی عطا کرتی ہے۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی ہوتی ہے۔ قدرت کے اس خوب صورت ماحول میں ایک مخصوص اُڑنے والا کیڑا گھنے جنگلی پیڑوں میں بڑی سُریلی آواز میں شاید اللہ کی حمد وثنا کرتا ہے۔ وہ کٹ زیّس کٹ زیّس کرتا ہوا درختوں پر اُڑتا رہتا ہے یا پھر کبھی ریں

ریں کی آواز میں گاتا ہے۔ دروڑ، زڑّوٹھ اور اپر بہوتہ نہایت دلکش اور صحت افزا مقامات ہیں۔ کاش! محکمۂ سیاحت اُن خوب صورت مقامات کی طرف توجہ دیتا تو لوگ گلمرگ اور پہلگام کو بھول جاتے! ہر سال اپریل مہینے کے بعد میرے گھر والے مال مویشی لے کر اُن خوب صورت پہاڑوں پر چلے جاتے تھے۔ ہماری دھار (ڈھوک) کا نام بچر اڑو تھا۔ تقریباً پانچ مہینے کے بعد واپس اپنے گھر میں مال مویشی لے آتے تھے۔ آج اُن دھاروں پہ گوجر طبقے کے چند لوگوں کے سوا کوئی اور مال مویشی چرانے نہیں لے جاتا ہے کیونکہ جب میلی ٹینسی کا قہر نازل ہوا تو عام لوگوں نے پہاڑوں پہ اپنے ڈھور ڈنگر چرانا بند کر دیا۔ چراگاہوں پہ اکثر لوگوں کی لڑائیاں ہو جاتی تھیں اور بعض اوقات پولیس اور عدالت تک نوبت پہنچتی تھی۔

میرا گاؤں بہوتہ جن موہڑوں پہ مشتمل ہے۔ اُن میں سروال، پیتروال، اوپر سروال، منڈھیانہ، ہڈال شالی، ہڈال، چاہوت، لنگدھار، شالی، چاہوت، لنگدھار، شالی، بھٹولی، گنڈ، گدھوری، گلی، کدھال، ہیڈلا، گھمیر، بنجر، کنڈا، کھتراڑ، زروٹھ، ماگوڑ اور اپر بہوتہ شامل ہیں۔ جب میں اپنے اس گاؤں میں رہتا تھا اُس زمانے میں وہاں بجلی اور پانی کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ پانی کے چشموں سے لوگ اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ہم پیدل رگی نالے تک آتے تھے لیکن آج مرمت میں بجلی، واٹر سپلائی اسکیم کے تحت پانی، دو ہائر اسکینڈری اسکول اور چھوٹی بڑی گاڑیوں کی آمد و رفت ہے۔

جنوری، فروری میں جب برف پڑتی تھی تو کمروں میں بُخاریوں میں آگ جلائی جاتی تھی۔ ہم محلے کے لڑکے برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے پہ پھینکتے، ہنستے کھیلتے اور خوش ہوتے تھے۔ برف پہ چلنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ ابا لوگوں کے کوٹ اور کپڑے سیتے تھے۔ اُن کا حقہ دھونا، اُس میں پانی ڈالنا اور بُخاری میں آگ جلانا میرے ذمے ہوتا تھا۔ چچا عزیز الدّین جنگلات خریدنے والی فرم میں منیجر ہوا کرتے

تھے۔ وہ جب گھر میں آتے تھے تو مجھے جنگل میں پرندوں کا شکار کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ایک بار جب اُنھوں نے مجھے جنگل میں اپنے ساتھ لیا تو خوش نصیبی سے دو رنگیلے پرندے اُنھوں نے شکار کیے تھے۔

مکان کی چھت پر سے برف ہٹانے میں کافی دُشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اُوپر سے خنک ہوا منہ ٹیڑھا کر دیتی تھی۔ ہاتھ اور پاؤں بالکل ٹھنڈے ہو جاتے تھے اور جب موسم خوشگوار ہو جاتا، برف پگھلنے لگتی تو پورے محلے کے لوگ اپنے اپنے مکانوں کی چھتوں پہ دُھوپ تاپنے نکل آتے۔ مائیں بہنیں زیادہ تر چرخے پر اُون کاتتی تھیں۔ تمام علاقہ مرمت سفید پوش دکھائی دیتا تھا۔ مارچ کے مہینے میں جب فصل بونے کا وقت آتا تو ایک بے ہودہ رسم کے تحت یہ معلوم کیا جاتا کہ زمین میں بیج کب ڈالا جائے؟ اس بات کا پتا لگانے کے لیے مکئی کے آٹے کی ایک بہت بڑی روٹی پکائی جاتی اور اُس کے علاوہ آٹے کی تین چھوٹی ٹکیاں الگ سے پکائی جاتیں۔ اُن سب کو گڑ اور دیسی گھی میں پکایا جاتا تھا پھر ایک کھیت میں ہل جوا لے کر بیلوں سے مٹی اُکھڑواتے اور تین مٹی کی ڈھیریاں بنا کر اُن پہ وہ آٹے کی تین ٹکیاں رکھتے۔ ایک کا نام چیت رکھتے، دُوسری کا بیساکھ اور تیسری کا نام جیٹھ، پھر کوّے کو بلایا جاتا اور جب کوّا کہیں سے آ کر کسی ایک ٹکیا کو سب سے پہلے اُٹھا کر لے جاتا تو وہی مناسب بیج بونے کا سماں سمجھا جاتا! مجھے پوری اُمید ہے آج مرمت میں یہ رسم رائج نہیں ہوگی۔

مجھے وہ زمانہ بھی اچھی طرح یاد ہے جب مجھے اور میرے چھوٹے بھائی اشفاق احمد وانی کو والدِ محترم نے گورنمنٹ سینٹرل اسکول بھوتہ میں پہلی جماعت میں داخل کروایا تھا۔ یہ غالباً 1968ء کی بات ہے۔ ماسٹر مدھولال نے ہمیں داخل کیا تھا۔ ابّا چونکہ خود ایک بہترین ترکھان تھے، اُنھوں نے ہمیں دیودار کی لکڑی کی تختیاں بنا کر دی تھیں۔ قاعدے سے لے کر چھٹی جماعت تک جن اساتذہ نے میرے ذہن کی تاریکی کو علم کے نُور سے منوّر کرنے کی کوشش کی تھی اُن میں جناب مدھولال، الحاج نذیر احمد

رازدان، جناب رتن لعل، جناب بنسی لال، جناب بال کرشن اور جناب بُدھی سنگھ شامل ہیں۔ یہ اساتذہ نااہل بچّوں کو سخت مارتے پیٹتے تھے۔ اُن کی یہ مار پیٹ طالب علم کے لیے مفید ثابت ہوتی تھی۔ موجودہ دور میں چونکہ بچّوں کو مارنا پیٹنا اُستاد کے لیے ایک طرح کا جرم سمجھا جاتا ہے، اسی لیے تعلیم کا معیار روز افزوں پست ہوتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا پوسٹ گریجویٹ ایک معمولی سا رُقعہ بھی صحیح نہیں لکھ پاتا ہے۔

چھٹی جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب میں گورنمنٹ ہائی اسکول گوہا (علاقہ مرمت، ضلع ڈوڈہ) میں داخل ہوا تو وہاں جن اساتذہ نے میری تربیت کی تھی اُن میں ماسٹر نُور محمد صاحب، ماسٹر فیض اُللہ صاحب (جو 2009ء میں اللہ کو پیارے ہوگئے) ماسٹر حفیظ اللہ صاحب، ماسٹر رحمت اللہ راتھر صاحب (جو ایک اچھے فارسی داں مدرس تھے) ماسٹر منشی رام جی، ماسٹر ایشور چند بھگت، ماسٹر رتن چند کے علاوہ ماسٹر سوامی راج میگوان صاحب اور مجھے انگریزی پڑھانے والے ہیڈ ماسٹر شری پورن چند بھگت صاحب کہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول گوہا میں تقریباً ساڑھے چار سال تک ہیڈ ماسٹر رہے۔ آج وہ بھی دُنیا میں نہیں ہیں۔ فاروق احمد وانی ساکنہ بہوتہ دسویں تک میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔ گوہا میں امر چند اور برج لعل شاہ کی دُکانیں اُس زمانے میں پورے علاقہ مرمت میں مشہور تھیں۔ اُن دونوں کی آپس میں حصہ داری تھی۔ لالہ امر چند جی ذات کے ٹھکّر تھے جبکہ برج لعل شاہ جی برہمن تھے لیکن یہ دونوں سگے بھائیوں سے زیادہ ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ ایک طویل مدت تک علاقہ مرمت کے لوگ اُنھیں دو سگے بھائی ہی سمجھتے رہے۔ اُن کے باہمی اتفاق ومحبت کی وجہ سے ہی اُن کی تجارت بامِ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یہ دونوں ابا کے گہرے دوست تھے۔ اُن کے علاوہ جناب ظہور الدّین لون ساکنہ بہوتہ، شری چرن داس اور مان چند ساکنہ گُن۔ جناب رحمت اللہ سلاریہ ساکنہ گوہا، جناب غلام حُسین راتھر، جناب مستری عبدلرّحیم ساکنہ موٹھی، جناب غلام محمد بٹ ساکنہ بہوتہ، جناب گلاب دین کمہار، جناب احمد دین

راتھر، جناب سراج الدّین وانی ساکنہ بھوتہ کے علاوہ جناب فقیر چند گپتا (شاہ) مشہور دُکان دار ساکنہ گدھوری ابا کے گہرے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔

بھوتہ گاؤں کے سامنے پار جو گاؤں پڑتا ہے اُس کا نام روٹ ہے۔ جہاں میری دو سگی پھوپھیاں اور تین سگی بہنوں کے علاوہ کچھ اور بھی خونی رشتے ہیں۔ بھوتہ اور روٹ کے درمیان نیچے ایک نالا بہتا ہے۔فنتیانہ، بھاماڑ، ٹھل، پاہار، کھریری، نال، بھنان، جیبڑ، پدّر گاؤں روٹ کے موہڑے ہیں۔ روٹ، بھوتہ کی طرح خوب صورت اور ہموار نہیں ہے بلکہ انتہائی ڈھلوان اور پتھریلا گاؤں ہے۔

گاؤں بھوتہ کے جنوب کی جانب سامنے پار گاؤں منگوتہ پڑتا ہے۔ یہ بھی کافی ڈھلوان، اُوبڑ کھابڑ راستوں اور چٹانوں سے بھرا پڑا گاؤں ہے۔ بھدرواہی اس گاؤں کے لوگوں کی بولی ہے۔ نیچے ایک نالا بہتا ہے۔ منڈول، اگندر، منز مالی، کینٹھی، بٹنگل اس گاؤں کے اہم موہڑے ہیں۔منگوتہ کے ساتھ ہی کافی اُونچائی پر ایک اور گاؤں ہے جس کا نام لبّڑ ہے۔ یہ گاؤں تو انتہائی ڈراونا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی بولی کشمیری ہے۔لبّڑ کے سیدھے اُوپر بالکل ننگا ایک پہاڑ ہے جس کا نام خول ہے۔ اس پہاڑ سے متعلق بچپن میں ہم اپنے خاندان کے بزرگوں سے یہ سُنتے تھے کہ اس میں پریاں بسیرا کرتی ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ میرے گاؤں کے بالکل نچلی طرف ایک نالا بہتا ہے اور دُوسرا نالا منگوتہ کی جانب بہتا ہے۔ یہ دونوں نالے درنگا میں آکر ملتے ہیں۔ اس لیے درنگا کو سنگم کا درجہ حاصل ہے۔ درنگا میں اکثر ہم اسکولی بچّے جون، جولائی کے مہینے میں نہایا کرتے تھے۔ میں، محمد سعید وانی، محمد اسحاق بیگ، غلام محی الدّین وانی، فاروق احمد وانی، دیارام، عبدالرّزاق لون اور جماعت علی وانی پورا گروپ یہاں نہایا کرتا تھا۔ وقت کے دریا میں بہتے بہتے آج ہم سب زندگی کے ایک ایسے موڑ پہ کھڑے ہیں جہاں سے زندگی کی اُترائی شروع ہوتی ہے!

گاؤں لبّڑ کے سامنے دُور پار ایک اور گاؤں پڑتا ہے جس کا نام پربل ہے۔ یہ

گاؤں بھی کسی حد تک ڈھلوان ہی ہے۔ پربّل کے ساتھ ہی ایک اور گاؤں پڑتا ہے جس کا نام مُوٹھی ہے۔ مُوٹھی بھی غیر ہموار اور چٹانوں سے بھرا گاؤں ہے لیکن پربّل اور مُوٹھی مرمت کے دو ایسے گاؤں ہیں کہ جہاں سب سے زیادہ آخروٹ پیدا ہوتا ہے۔ پربّل سے نیچے گوہا ہے جو کسی حد تک ہموار ہے۔ گوہا کو علاقہ مرمت کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس دور میں پورے علاقہ مرمت میں صرف گوہا میں ہائی اسکول، پوسٹ آفس اور راشن ڈپو کے علاوہ طبی مرکز تھا۔ سب سے زیادہ دُکانیں یہیں تھیں۔ اب تو یوں بھی مرمت کو تحصیل کا درجہ حاصل ہے۔ آج علاقہ مرمت کی صورت حال یہ ہے کہ گردونواح کے گاؤں سے سرمایہ دار لوگوں نے گوہا میں چار چار منزلہ پختہ عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ نہ صرف گوہا میں بلکہ دوسرے گاؤں میں بھی بڑی اُونچی عمارتوں میں لوگ رہ رہے ہیں لیکن میرے دور میں یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اُس دور کے علاقہ مرمت اور آج کے علاقہ مرمت میں زمین و آسمان کا فرق آ گیا ہے۔ میرے ایک بہنوئی جناب نذیر احمد وانی اُن دنوں گوہا میں ایک نامور اور اعلیٰ پایہ کے درزی مانے جاتے تھے۔ بڑے اچھے کپڑے سیتے تھے۔ اُس دور میں اُن کا وہاں کافی اثر ورسوخ تھا۔ اب اگرچہ وہ گھر پر بھی کپڑے نہیں سیتے لیکن اپنے ہنر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ادب سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ خودداری اور صاف گوئی اُن میں پائی جاتی ہے۔ سماجی کارکن ہونے کے ساتھ سیاسی شعور بھی رکھتے ہیں۔

گوہا کے سامنے پار جو گاؤں ہے اُس کا نام رچھو ہے۔ یہ گاؤں تھوڑا سا ہموار ہے۔ اُس سے ملحقہ گاؤں کا نام باڑی ہے، باڑی گاؤں کا ایک خاص موہڑہ گڑ ہنگل ہے جہاں میرا ننیہال ہے۔ میرے نانا جی کسی زمانے میں بھدرواہ سے یہاں آ بسے تھے اور پھر یہیں دو شادیاں کی تھیں۔ میری نانی چھوٹی تھی جن کے بطن سے میری امّاں، تین خالائیں اور تین ماموں پیدا ہوئے تھے۔ بڑی نانی کے بطن سے بھی تین ماموں اور دو خالائیں پیدا ہوئی تھیں۔ میرے تمام ماموں گزر چکے ہیں اور صرف دو

خالائیں حال حیات ہیں۔

گرہنگل سے کافی دُور اُوپر بالکل جنگل کے نزدیک ایک گاؤں کا نام سیوٹ ہے۔ یہاں میرا ایک دوست اور ہم جماعت رہتا تھا جس کا نام دیال سنگھ تھا۔ اُس کے دو چھوٹے چھوٹے بچّے تھے۔ شادی ہوئے تقریباً دس سال ہوئے تھے کہ اچانک بیمار پڑ گیا اور دُنیائے فانی سے کوچ کر گیا! گرہنگل سے کافی دُور شمال کی جانب انتہائی خوب صورت فطری مناظر سے آراستہ بالکل ہموار ایک اور گاؤں پڑتا ہے، اُس کا نام بلند پور ہے۔ یہاں میں نے تقریباً ڈھائی سال بحیثیتِ مدرس کام کیا ہے۔ خالص دیوداروں کے پیڑوں کے وسط میں اسکول کی عمارت ہے اور کافی وسیع میدان ہے کہ یہاں سے تقریباً پورا علاقہ مرمت نظر آتا ہے۔ یہاں پہنچ کے انسان کی روح خوش ہوجاتی ہے۔ بلند پور سے اُوپر دُور جنگلی راستے کو طے کرنے کے بعد کھرونٹھی نام کی ایک جگہ آتی ہے وہاں زیادہ تر گدھیوں کے گھر ہیں۔ میں بلند پور سے پیدل کئی بار کھرونٹھی سے ہوتے ہوئے سُہانی گنڈ کے راستے ماتلائی اپنے گھر آیا ہوں۔ بلند پور سے نیچے ایک طرف جٹھار اور دوسری طرف نلہوت اور کڈگراں نام کے گاؤں پڑتے ہیں۔ ماسٹر سوامی راج میگوان صاحب کا گھر نلہوت میں ہے۔ بلند پور اور اس سے ملحقہ گاؤں کی خاص پیداوار مٹر، ٹماٹر، آلو، کریلا کے علاوہ انار دانہ سب سے زیادہ پیدا ہوتا ہے۔

گوہا سے آگے جو گاؤں پڑتے ہیں اُن کے نام ہیں بھرگراں، سلہوتہ، جمبل اور کلہوتہ۔ جمبل میں زیادہ تر راجپوت رہتے ہیں اور تقریباً سبھی مالدار ہیں۔ بھرگراں سے تھوڑا آگے جا کر اُوپر دیدنی گاؤں سے ایک جھرنا بہتا ہے جو دیکھنے والوں کو شاد کرتا ہے۔ کلہوتہ سے آگے کھلینی کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ روٹ، گوہا، باڑی، سلہوتہ، بھرگراں، جمبل اور کلہوتہ کے درمیان رگی نالا بہتا ہے۔ تمام گاؤں انتہائی ڈھلوان اور ریتلی مٹّی والے ہیں لیکن لوگ پھر بھی بڑے سُکھی معلوم ہوتے ہیں۔

....

میرے والدِ محترم نے جب 1972ء میں ضلع اُدھم پور، تحصیل چنھنی کے تاریخی مقام مانتلائی میں زمین خریدی تو ہم سب بھائی، بہنیں تقریباً دس سال تک اپنے پرانے گھر سروال (گاؤں بہوتہ، تحصیل وضلع ڈوڈہ) سے پیدل بھنان اور کبھی گُن کے راستے سیدھی چڑھائی چڑھ کر پہاڑ پر پہنچ جاتے تھے اور وہاں سے نیچے اُتر کر ضلع اُدھم پور میں داخل ہو جاتے تھے۔ اُوپر دھار پر گھنے دیوداروں کے بیچ میں راستے کے بالکل سامنے چند قبریں تھیں، وہاں پہنچ کے ابّا اکثر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ تھوڑا آگے چل کر توس کے درختوں کے سائے میں سُستانے بیٹھ جاتے اور وہاں سے مانتلائی کا پورا علاقہ بالکل صاف دکھائی دیتا تھا۔ جون، جولائی کے مہینے میں یہ پہاڑ اور وادیاں انتہائی حسین اور دلکشی کا منظر پیش کرتی ہیں۔ ہمارے گوجر بھائیوں کی بھینسیں، اُن کے گھوڑے ہرے بھرے میدانوں میں چرتے دکھائی دیتے۔ ڈُمبلُو نام کے دو مقام ایک اوپر ڈمبلُو اور دوسرا نچلا ڈمبلُو دونوں جگہوں پہ کھنڈیری اور بایں کے گوجروں نے اپنے مال مویشی چرانے کے لیے مٹی کے کچے گھر بنائے ہوئے تھے۔ ہم جب مرمت سے یا مانتلائی سے واپس مرمت جاتے ہوئے تھک ہار جاتے تو یہ لوگ ہمیں ازراہِ ہمدردی لسّی پلاتے یا لپٹن چائے پلاتے تھے۔ مرمت سے مانتلائی پہنچنے میں ہمیں تقریباً پانچ گھنٹے لگتے تھے۔ دُتیراں، سِلدنی اور بھینتھی جیسے مختلف پڑاؤ طے کرنے کے بعد بڑی مشکل سے جھورتی پہنچتے اور سامنے سڑک پہ جب کوئی ٹرک یا چھوٹی بڑی گاڑی چلتی ہوئی نظر آتی تو بہت خوش ہو جاتے۔ پھر کچھ ہی وقت کے بعد ہم اپنے نئے مکان میں پہنچ جاتے۔

خاص مانتلائی میں کہ جو ضلع اُدھم پور کا سب سے خوب صورت، صحت افزا، تاریخی اور دلکش مقام ہے۔ یہاں سوامی دھریندر برہمچاری (جو بنیادی طور پر بہار کے رہنے والے تھے) نے 1972ء میں تقریباً دس کنال زمین خریدی تھی اور اپنا آشرم بنایا تھا۔ دراصل بابا دھریندر برہمچاری عام سادھو یا کوئی فقیر قسم کے آدمی نہیں تھے بلکہ

سادھو کے رُوپ میں اُس وقت کی مرکزی سرکار کے ایک خاص کارکن تھے۔ جب اُنھوں نے ماننلائی کے سیدھے سادے، توہم پرست اور بہت حد تک ان پڑھ لوگوں کی نبض پہچان لی تو اُنھوں نے دو سال کے اندر اندر ماننلائی کے زمینداروں سے اُس دور میں پانچ پانچ ہزار روپے میں تقریباً سات سات کنال زمین خریدنا شروع کر دی اور جس کسی نے زمین بیچنے سے انکار کر دیا تو بابا دھریندر برہمچاری نے مشینیں لگا کر اُن پہ غاصبانہ قبضہ کر دیا یا پھر اگر یہ نہ سہی تو اپنی زمین کو ہموار کرنے کے بہانے مشینوں سے ملبہ اُٹھا کر کسی کی زمین میں ڈال دیا جاتا اور پھر اگلے کو مجبوراً بابا کو زمین بیچنی پڑتی۔ ماننلائی کے بہت سے کم زبان اور مظلوم قسم کے زمیندار بابا دھریندر برہمچاری کو راون کا دوسرا روپ سمجھنے لگے تھے مگر ڈر و خوف کے مارے اُن کے سامنے کچھ بھی نہیں کہہ پاتے تھے۔ چند برسوں میں سوامی دھریندر برہمچاری نے تقریباً چار سو کنال زمین اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اُنھوں نے سیب، اٹلی کی خوبانی اور عمدہ قسم کے سنگترے کے پیڑ لگوا دیے۔ طرح طرح کی مشینوں سے ماننلائی کو سوئزر لینڈ بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ تقریباً دو ڈھائی سو آدمی ہر روز سوامی دھریندر برہمچاری کے یہاں مزدوری کماتے۔ ٹھاکر پریم سنگھ جی کو اُنھوں نے منیجر مقرر کیا تھا سب سے پہلے تو بابا نے اپنی گپھا تقریباً پانچ منزل بڑی عجیب صورت میں تعمیر کروائی جس میں سیمنٹ اور لوہا لگایا گیا اور پھر اُنھوں نے ایک تالاب بنوایا جو بارہ فُٹ گہرا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اُنھوں نے ہوائی جہاز کا اڈّہ تعمیر کروایا۔ اب باضابطہ طور پر وہ دہلی سے اپنے ہیلی کپٹر میں ماننلائی آتے اور یہاں سے بھی خود ہیلی کپٹر دہلی لے جاتے۔ بابا دھریندر برہمچاری کے مشغلے بھی بڑے عجیب و غریب تھے۔ اُنھوں نے ایک بہت بڑی گئوشالہ تعمیر کروائی تھی جس میں مختلف نسل کی گائیں رکھی تھیں۔ اُن کے علاوہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے بھی رکھے تھے جنھیں دیکھ کے ہر کسی کا دل خوش ہو جاتا تھا۔ تقریباً ایک سو آدمی نوکر چاکر تھے جو بابا کے حکم کو بجالاتے۔ گئوشالہ کے علاوہ ایک چڑیا گھر بھی قائم کیا گیا

تھا جس میں بارہ سنگھا، نیل گائے، مور، بھالُو، ہرن اور کئی طرح کے پرندے رکھے تھے۔ بابا دھریندر برہمچاری یوگا کے بڑے شوقین تھے۔ اُنھوں نے مانتلائی ہی میں یوگا کا ایک آشرم بھی کھولا تھا جس میں جون، جولائی کے مہینے میں باقاعدہ یوگا سکھایا جاتا۔ ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں یہاں یوگا سیکھنے آتے تھے۔ اُن کے قیام وطعام کے لیے بابا نے ''اپنا آشرم'' نام کا ایک ہوسٹل تعمیر کروایا تھا۔ باضابطہ سیکورٹی گارڈ اور رات کی پہرہ داری کے لیے دو خونخوار اعلیٰ نسل کے کُتّے رکھے گئے تھے۔ بابا دھریندرھر برہمچاری بظاہر کوئی نشہ نہیں کرتے تھے تقریباً آٹھ فُٹ اُن کا قد تھا۔ سفید رنگ کی دھوتی پہنا کرتے تھے، داڑھی اور سر کے بال لمبے اور سیاہ تھے۔ پیروں میں کھڑاؤں پہنتے، عام جٹادھاری باباؤں کی طرح نہیں تھے۔ نہ چرس پیتے نہ شراب میں دُھت رہتے بلکہ نہایت صاف ستھرے اور نفاست پسند تھے۔ نہایت خوب صورت تھے۔ تقریباً دو کیلو دُودھ روزانہ پیتے اور خوراک بھی اچھی کھاتے تھے۔ بابا کی اپنی سلطنت تھی۔ نوکر چاکر ہر وقت اُن کے آگے پیچھے دست بستہ کھڑے جی حضوری کرتے رہتے تھے۔ اُن کی عمارتوں، ہوائی اڈّے اور بالخصوص اُن کے آشرم، چڑیا گھر اور گئو شالہ کو دیکھنے دُور دُور سے لوگ یہاں آتے تھے۔ کچھ ہی برسوں میں بابا نے مانتلائی کو نہ صرف ہندوستان بھر میں مشہور کروا دیا تھا بلکہ بیرون ہند بھی مانتلائی کو سیاحت کا ایک اہم مقام کے طور پر مُتعارف کروایا گیا۔ چنانچہ ہر سال یہاں جرمنی، تھائی لینڈ، سوئزر لینڈ، امریکہ، جاپان، کنیڈا، انگلینڈ اور کوریا سے لوگ سیر وتفریح کے لیے آنے لگے۔ طرح طرح کے خوشبودار پھولوں سے سیاح لُطف اندوز ہوتے۔ مانتلائی کی تزئین کاری کے لیے سڑک کو کافی کشادہ کیا گیا تھا اور دیواروں کے چھوٹے چھوٹے پیڑ نصب کروائے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب بجلی کے تقریباً بیس فُٹ اونچے کھمبے زمین میں نصب کروائے گئے تھے جن کے اوپر بڑی ٹیوب لائٹیں لگائی گئی تھیں۔ شام ہوتے ہی جب بجلی کے مین بورڈ سے بٹن آن کر دیا جاتا تو

پوری مانتلائی دُودھیا روشنی میں جگمگا اُٹھتی تھی۔ بابا دھریندر برہمچاری نے مانتلائی سے اُوپر پیچھے بندڑ جنگل کے لیے نینا دیوی روڈ کا کام بھی شروع کروا دیا تھا اور کچی سڑک تقریباً وہاں پہنچا دی تھی۔ اب مانتلائی میں وہ چندی گڑھ جیسا اسپتال تعمیر کروانا چاہتے تھے اور اُس کے لیے اُنھوں نے زمین بھی مخصوص رکھی تھی لیکن اُن کے یہ تمام سپنے ادھورے ہی رہ گئے تھے۔ جون 1994ء میں دھریندر برہمچاری اپنے پائلٹ کے ساتھ ہیلی کپٹر میں دہلی سے واپس مانتلائی آ رہے تھے اور مانتلائی اپنے ہوائی اڈّے کے قریب پہنچ بھی چکے تھے کہ اچانک اُن کے ہوائی جہاز کی مشینری میں خرابی پیدا ہوگئی۔ اُن کے پائلٹ نے بہت کوشش کی کہ جہاز کسی طرح محفوظ حالت میں اڈّے پر اُتر سکے مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا اور دیکھتے دیکھتے چند ہی لمحوں میں جہاز بُری طرح درختوں کے ساتھ ٹکراتا ہوا زمین پہ آ گرا اور بابا دھریندر برہمچاری اپنے پائلٹ کے سمیت موت کی آغوش میں چلے گئے! پوری تحصیل چھنی میں بابا کی موت سے ایک سنّاٹا سا چھا گیا۔ بالآخر اُن کے جسدِ خاکی کو مانتلائی میں ہی اُن کے اپنے آشرم کے قریب نذرِ آتش کر دیا گیا اور ''اپرنا آشرم'' ہوٹل کے بالکل نزدیک سڑک کے کنارے ایک دیودار کے درخت کے نیچے اُن کے نام کی ایک یادگار بنائی گئی۔ یادگار میں فُل سائز کی اُن کی تصویر ایک بہت بڑے لکڑی کے فریم میں رکھی گئی ہے، ساتھ میں نیچے اُن کی کھڑاؤں ہیں اور ایک پلیٹ میں پھول ہیں۔ اس سب کو دیکھ کر ہر کسی کو دُنیا کی ناپائیداری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ میر انیس نے کیا خوب کہا ہے کہ ؂

کیا کیا دُنیا سے صاحبِ مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

بابا دھریندر برہمچاری کے دعوت نامے پر غالباً 1978ء میں اُس وقت کی

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی جی، مانتلائی آئی تھیں اور بابا نے اُنھیں پوری مانتلائی کی سیر کرائی تھی۔ عام خیال یہ بھی ہے کہ بابا دھریندر برہمچاری شریمتی اندرا گاندھی جی کے گُرو تھے۔ اس بات میں کتنی صداقت ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اگر بابا کو اندرا گاندھی جی کی حمایت اور تعاون حاصل نہ ہوتا تو وہ مانتلائی کو سوئزرلینڈ بنانے کا سپنا ہرگز نہ دیکھتے۔ میرا گھر سوامی دھریندر برہمچاری کے آشرم سے تقریباً ایک کیلومیٹر نیچے ایک نالے کے ساتھ ہے۔ بابا کے آشرم سے نیچے کی جانب میرے گھر کے آس پاس تک کانٹوں کا ایک وسیع جنگل ہے۔ خاردار جھاڑیوں میں لومڑیاں اور جنگلی پرندے رہتے ہیں۔ اُس خاردار جنگل میں مجھے بھیڑ بکریاں اور ڈھور ڈنگر چرانے کے دوران بہت کانٹے چبھے ہیں۔

بابا دھریندر برہمچاری کی موت نہ صرف مانتلائی اور سدھ مہادیو کی عوام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی بلکہ پوری ریاست بالخصوص سیاحوں کے لیے بھی انتہائی افسوس اور مایوسی کا باعث بنی۔ دُوسری بات یہ کہ بابا کی جو پلاننگ تھی اگر اُنھیں زندگی کے کچھ اور سال جینے نصیب ہوئے ہوتے تو آج مانتلائی یقیناً سونے کی چڑیا ہوتی۔ سینکڑوں مزدور جو اپنے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر مزدوری کمانے جاتے تھے اور شام کو واپس اپنے بیوی بچّوں میں آ کر گھل مل جاتے تھے اُن کی معشیت پر بُرا اثر پڑا۔ وہ مزدوری کے لیے گھر سے بے گھر ہو گئے۔ بابا دھریندر برہمچاری کی موت کے بعد مانتلائی جیسی خوب صورت اور روح پرور جگہ ایک طویل زمانے تک حکومتِ جموں و کشمیر کی بے توجہی کی شکار رہی۔ کروڑوں روپے کی عمارتیں اور اربوں روپے کی تقریباً ساڑھے چار سو کنال زمین کہ جس میں سونا اُگلنے کی تاثیر موجود ہے کئی برسوں تک یہ سب کچھ ویران پڑا رہا، یہاں 2018ء تک اُلّو بولتے رہے! اب کہیں جا کر مرکزی سرکار نے اس دلکش مقام کی طرف خصوصی توجہ دینا شروع کر دی ہے کہ یہاں ایک یوگا سینٹر قائم ہو رہا ہے۔ سُدھ مہادیو اور مانتلائی کو تیرتھ استھان کا درجہ حاصل ہے۔ ہندو

فلاسفی کے مطابق شیو جی اور پاروتی کا بیاہ مانتلائی میں ہوا ہے۔ ہر سال مانتلائی اور سدھ مہادیو میں جون، جولائی کے مہینے میں میلہ لگتا ہے جو تین دن تک رہتا ہے۔ ہزاروں عقیدت مند مرد وعورتیں یہاں شیو جی کے مندر میں جبہ سائی کرتے ہیں اور پاپ ناشنی باولی پہ اشنان کرتے ہیں۔ سُدھ مہادیو، مانتلائی، گوری کُنڈ اور بینی سنگ یہ تمام ہندوؤں کے تیرتھ استھان ہیں۔ یہ سب تیرتھ استھان تحصیل چنینی (ضلع ادھم پور) میں آتے ہیں اور بہت حد تک پُرکشش مقامات ہیں۔ مانتلائی سے پہلے جو گاؤں پڑتا ہے اُس کا نام کوہسار ہے اور مانتلائی سے آگے، بپ، سراڑ، جیگ، مروٹھی، کوئی، سرا، دُھونہ، لاٹی، جکھیڈ اور ڈُڈّو جیسے علاقے پڑتے ہیں۔ سُدھ مہادیو سے پہلے جو گاؤں پڑتے ہیں اُن کے نام ہیں، گوری کُنڈ، بچھل، کٹوالت، گلی، کرلاہ، رینگی، بایں، چلیہاڑ، بشٹ، ٹھیرا، گنال، بیشٹی، سنگوت، کدھ اور کدھ سے نیچے ڈوگرہ اور اس کے بعد چنینی کا قصبہ آتا ہے۔ چنینی سے پار یعنی دریائے توی پار کرنے کے بعد ٹنڈہار، ماستی، نوتی، ننگلتہ، سروری، گھاڑیاں کلاں، گھاڑیاں خُورد، گر سُنڈ، ہرس، راجی، باگڑ، بوس، دھناس، چچ، سنگاس، رجھار، گلیتر، ششکری، متلوعہ اور پٹن گڑھ نام کے گاؤں پڑتے ہیں۔ یہ تمام گاؤں ابھی تک پسماندہ ہیں اور لوگ بھونڈی رسموں اور رواجوں کو لے کے جی رہے ہیں۔ البتہ تعلیم یافتہ لوگ ان گاؤں کی حالت سُدھارنے کی فکر کررہے ہیں۔ راجی سے پار برگنڈا، ڈِگ، چھپریں، کھرواہ، کمہارلی اور بینی سنگ نام کے گاوں پڑتے ہیں۔ چنینی دو میل سے آگے اُوپر مادا، گنڈ وال، چمپڑی، کیتھر، درمتھل، چلڈی، نرسُوح، سمرولی اور سمرولی سے پار سیونہ، چڑت، سمرولی سے آگے موڑ، بلی نالا، تھرڈ اور پھر آگے اُدھم پور شہر پڑتا ہے۔ یہ تمام گاؤں قومی شاہراہ کے ساتھ ساتھ پڑتے ہیں۔

چنینی، ایک تاریخی قصبہ ہے کہ جہاں 1947ء تک باون پیڑھیوں نے راج کیا ہے۔ 'چنینی' کو چنینی کیوں کہتے ہیں؟ اس کے بارے میں مورخین کی مختلف آراء

ہیں۔ایک خیال یہ ہے کہ مدھیہ پردیش میں چندیری نام کا ایک علاقہ ہے، وہاں سے چندیل خاندان کے راجپوت چھنی میں آبسے کہ جنھوں نے باقاعدہ یہاں پہ آ کے اپنی حکومت قائم کی اور وہاں سے پُشت در پُشت راجے راج کرتے چلے گئے۔ کچھ لوگ چھنی کا تعلق چین سے جوڑتے ہیں۔ اُن کا یہ کہنا ہے کہ پرانے زمانے میں چھنی ریاست تھی اور چین کا براہِ راست اس پہ قبضہ تھا۔ بہر حال مستند اور معتبر تحریری شواہد آج تک دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ چھنی اس وقت ضلع اُدھم پور کی تحصیل ہونے کے ساتھ سب ڈویژنل مجسٹریٹ آفس کا درجہ رکھتی ہے۔ اس قصبے میں لوگوں کی خاصی چہل پہل رہتی ہے۔ سُدھ مہادیو اور ماتلائی جانے والے سیاح اور عقیدت مند لوگ چھنی ہی سے گزرتے ہیں۔ اس کے علاوہ لاٹی، ڈھونہ اور ڈڈُو بسنت گڑھ جانے والے لوگ بھی چھنی ہی سے پیچھے جاتے ہیں۔ چھنی کے مضافاتی علاقوں کے لوگ تجارت اور خرید وفروخت کے لیے ہر حال میں چھنی آتے ہیں جس کی وجہ سے چھنی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ چھنی میں ہندو مُسلم بھائی چارہ مضبوط بُنیادوں پر قائم ہے۔ تقریب چاہے شادی بیاہ کی ہو یا کوئی ماتمی مجلس، یہاں کے ہندو اور مُسلمان برابر کے شریک رہتے ہیں۔ 2008ء میں جب امرناتھ زمینی تنازعے کو سیاسی بازی گروں نے طُول دے کر اپنی سیاسی روٹیاں سینکنا شروع کیں اور لوگوں کو مذہبی جنون کا انجکشن دے کر انسانیت اور ہندو مسلم بھائی چارے کو ختم کرنا چاہا تو ریاست میں کئی جگہوں پہ ہندو مسلم تصادم کی بھیانک اور سنگین وارداتیں بھی ہوئیں لیکن چھنی کے ہندوؤں اور مُسلمانوں میں باہمی پیار و محبت، ہمدردی اور انسان دوستی کا جذبہ مفقود نہیں ہوا، اُنھوں نے امن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ چھنی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً بیس فی صدی ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ دونوں فرقے ہندو اور مُسلمان کا لیبل لگانے سے پہلے انسانیت کے لیبل کی تلاش میں رہتے ہیں۔ چھنی کے بیوپار منڈل نے 2008ء میں امن وسلامتی کا ماحول برقرار رکھنے میں اہم رول ادا

کیا ہے۔ اُس وقت بیوپار منڈل کے صدر میرے عزیز دوست راجیش گپتا المعروف رِنکو تھا۔ اس شخص نے نہ صرف اپنے قصبہ چھنی میں بلکہ مختلف علاقوں میں جاکر ہندو مسلم بھائی چارے کو قائم رکھنے پر زور دیا۔ آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے چھنی میں لوگوں کے کچّے مکان تھے لیکن آج تقریباً نوے فی صدی مکان پکّے بنے ہوئے ہیں۔ چھنی میں راجے کا محل کسی زمانے میں بڑی شان وشوکت کے ساتھ عہدِ گذشتہ کی داستان بیان کرتا تھا مگر بعد میں یہ محل نذرِ آتش ہوگیا۔ آج سے کم وبیش 45 سال پہلے چھنی میں ایک فلم بنی تھی ''جانی دُشمن'' اُس کی شوٹنگ اُسی محل کے اندر اور گردونواح میں ہوئی تھی۔ چھنی میں بندر بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اُن کی دہشت گردی سے یہاں کے باشندے کافی تنگ آچکے ہیں۔ اب ایک خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ مرکزی سرکار نے چھنی سے آگے سدھ مہادیو تک قومی شاہراہ کی تعمیر کا کام شروع کروادیا ہے۔ سدھ مہادیو سے مرمت کھلینی کے لئے ایک ٹنل تعمیر ہوگا جو ڈوڈہ، کشتواڑ، بھلیسہ اور دوسرے علاقوں کے باشندوں کی آمدورفت کے لئے سہولت کا باعث بنے گا۔

....

6، اکتوبر 1991ء کو جب میری شادی قصبہ چھنی میں ایک شریف مُغل خاندان کی لڑکی راشدہ اختر سے ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو سعادت مند پایا۔ دراصل یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میری اہلیہ نے آج تک ہرقدم پہ میرا ساتھ نبھایا ہے۔ شادی سے پہلے ہی وہ ہائر اسکنڈری پارٹ سکینڈ کا امتحان پاس کرچکی تھی۔ میری یہ تمنّا تھی کہ وہ شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھے اور بی اے، ایم اے کے امتحانات پاس کرے لیکن 1992ء میں جب ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایک خوب صورت بیٹے سے نوازا تو تقریباً چار سال کے بعد اُس نے ہمت وحوصلے سے کام لیتے ہوئے پرائیویٹ طور پر بی اے حصہ اوّل کا فارم بھرا اور میں نے اُسے کتابیں اور نوٹس فراہم کرنے کے بعد ذاتی طور پر پڑھایا بھی۔ جب

اُس نے امتحان دیا تو وہ بہ فضل اللہ پاس ہوگئی۔ دوسرے سال بی اے حصہ دوم کے امتحان کا فارم بھرا تو وہ اُس میں بھی پاس ہوگئی اور پھر اللہ کی مدد سے آخر کار وہ جہاں ایک طرف بچّے کی پرورش اور گھریلو کام کاج کرتی رہی تو وہیں دوسری طرف بی اے فائنل کا امتحان بھی پاس کر دیا۔ بی اے کے بعد اُس میں اُردو میں ایم اے کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے کتابیں اور نوٹس تیار کر کے اُسے دیئے۔ وہ پڑھتی رہی، اُس نے ہمت نہیں ہاری اور بہ فضل اللہ اُس نے 2000ء میں اُردو میں ایم اے کا امتحان پاس کر دیا۔ 2003ء میں وہ سروشکھشا ابھیان کے تحت چنہنی زُون کی سطح پہ رہبرِ تعلیم ٹیچر تعینات کی گئی۔ اُدھم پور میں اُس وقت کے وزیرِ اعلیٰ جناب مفتی محمد سعید کے ہاتھوں آرڈر ملا اور چنہنی سے کافی دُور آگے دھیرہ ٹاپ سے تھوڑا نیچے پرائمری اسکول سیری سراڑ میں تعینات کیا گیا۔ یہاں بھی اللہ پاک نے ہماری مدد و نصرت فرمائی کہ بپ کے ایک رہبرِ تعلیم ٹیچر مختیار احمد جو کسی زمانے میں بپ ہائی اسکول میں میرا شاگرد رہ چکا تھا اُسے گورنمنٹ پرائمری اسکول کوہسار میں رہبرِ تعلیم ٹیچر تعینات کیا گیا تھا اُسے سیری سراڑ کافی نزدیک پڑتا تھا اور میری اہلیہ کو چنہنی سے کسی حد تک کوہسار آنا دشوار نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے باہمی تبدیلی کی درخواست اُس وقت کے وزیرِ تعلیم جناب ہرش دیو سنگھ کو پیش کی اور اُن سے آرڈر کروایا۔ اس طرح دونوں رہبرِ تعلیم ٹیچر اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگے۔ میری اہلیہ کا یہ آرڈر کروانے میں چنہنی کے میری اہلیہ کے مُنہ بولے بھائی اور میرے عزیز دوست راجیش گپتا المعروف رنکو اور جناب ہرش دیو سنگھ کے چھوٹے بھائی کلدیپ سنگھ نے کافی مدد کی تھی۔ ہم اُن کا یہ احسان تادم حیات نہیں بھول پائیں گے۔۔ 2005ء میں میری اہلیہ نے جموں یونیورسٹی کے تحت بی ایڈ کا فارم بھرا اور دو سال کے بعد بی ایڈ کا امتحان بھی پاس کر دیا۔ 2007ء میں جموں وکشمیر پبلک سروس کمیشن نے دوسرے مضامین کے ساتھ اُردو کی آسامیوں کے لیے بھی (اُردو لیکچرار برائے ہائر اسکینڈری اسکول) فارم بھروائے۔ 2008ء میں

اُمیدواروں کا ایک مجموعی امتحان میں بیٹھنا لازمی قرار دیا گیا (Screening Test) جس میں میری اہلیہ نے بھی امتحان پاس کر دیا اور جب اُس نے انٹرویو دیا تو اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم سے اُس کا انٹرویو اتنا اچھا ہوا کہ وہ سلیکٹ کر دی گئی، میں نے اور میری اہلیہ نے جو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے کر دکھایا۔ بس یہ سب اللہ کا کرم ہے کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے۔

....

جولائی 1995ء کے ایک واقعے کی یاد آج تک میرے ذہن میں تازہ ہے۔ میری ڈیوٹی اُن دنوں گورنمنٹ مڈل اسکول بشٹ (زون چھنی، ضلع ادھم پور) میں تھی۔ میلی ٹینسی اپنے عروج پر تھی اور اُس کی روک تھام کے لیے پوری ریاست جموں وکشمیر میں فوج کو تعینات کرنے کے ساتھ اُسے چوکس رہنے کی ہدایات دی گئی تھیں۔ میلی ٹینٹوں اور فوج کے درمیان تصادم اور پھر ہلاکتوں کی خبریں آئے دن اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پہ اُن کی جھلکیاں بھی عوام کو دکھائی جاتی تھیں۔ زندگی میں موت کا رقص چل رہا تھا ''جیو اور جینے دو'' کا صدیوں پُرانا نعرہ ہوا میں معلق ہو کے رہ گیا تھا۔ میلی ٹینٹوں کو قابو کرنے کے لیے فوج کے کچھ نوجوانوں کو اُنہی کی جیسی شکل وصورت اختیار کرنے کی ہدایت دے کر جنگلوں، بیابانوں اور دیہاتوں میں گھوم پھر کے لوگوں سے جانکاری حاصل کرنے کی خاطر ایک طرح کے بہروپیاپن کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ صوبہ جموں کے جن اضلاع کو دہشت گردی سے متاثرہ ضلعے قرار دیا گیا تھا اُن میں پونچھ، راجوری، اُدھم پور اور ڈوڈہ شامل تھے۔ ریاست میں گورنر راج نافذ تھا۔ اتوار تھا میں اور میری چھوٹی ماں مانتلائی میں گھر سے تھوڑی دُور پانی لانے اور پانی کے چشمے کی جگہ کو کشادہ کرنے کے لیے اپنے ساتھ بیلچہ اور کدال بھی گھر سے ساتھ لے گئے تھے۔ ہم پانی کے چشمے کو کشادہ کرنے کے لیے پتھر اور مٹی لگا رہے تھے کہ اتنے میں فوج کے چار سپاہی اسلحے

سے لیس ہمارے پاس پہنچ گئے اور مجھے اپنے پاس بلانے لگے۔ میں نے اُنھیں دیکھا اور بغیر کسی گھبراہٹ کے اُن کے پاس چلا گیا۔اُن میں سے ایک بولا

''آپ کو ہمارے صاحب آپ کے گھر پر بلاتے ہیں''

میں نے کہا

''چلیے''اُن میں سے دو میرے پیچھے رہے اور دو میرے آگے پھر کہنے لگے

''آپ برابر ناک کی سیدھ میں چلیں گے۔ادھر اُدھر نہیں دیکھیں گے''

میں اُن کی ہدایات اور حکم کی تعمیل کرتے ہوئے چلتا رہا۔ جونہی میں اپنے گھر کے نزدیک پہنچ گیا تو اُن میں سے ایک نے حکم دیا

''رُک جائیے''میں رُک گیا۔ چند لمحوں تک اُنھوں نے مجھے کھڑا رکھوایا اور پھر کہنے لگے''چلیے''

میں جونہی گھر کے آنگن میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ فوجی سپاہیوں کا کمانڈر ابا (مرحوم) سے خُفیہ طور پر ایک کاغذ پہ اُن کے بیانات نوٹ کر رہا تھا۔ یہ سب سپاہی اور اُن کا کمانڈر سکھ مت سے تعلق رکھتے تھے۔کمانڈر نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا

''آپ کو ہم اپنے کیمپ میں لے جانا چاہتے ہیں تا کہ آپ سے کچھ جانکاری حاصل کر سکیں ۔اس لیے آپ تیار ہو جائیے''

میری امّاں مال مویشی چرانے گئی تھی۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھی البتہ چھوٹی ماں اور ابا کمانڈر کی باتیں سُن کر سہم سے گئے۔ابا نے اُس فوجی کمانڈر سے کہا

''آپ میرے بیٹے سے جو مرضی پوچھ لیجیے لیکن اسے واپس گھر بھیج دیجیے''

اُس نے ابا کو تسلّی دیتے ہوئے کہا

''ہاں چچا، آپ فکر نہ کریں ہم ماسٹر کو بہت جلد واپس بھیج دیں گے''

ابا نے کہا

’’مجھے یقین ہے سکھ مت کے لوگ جھوٹ نہیں بولتے ہیں‘‘
نمازِ عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے اُس فوجی کمانڈر کو کہا
’’میں پہلے نماز پڑھنا چاہتا ہوں اور اُس کے بعد آپ کے ساتھ چلوں گا‘‘
میں نے اطمینان سے وضو کیا اور عصر نماز کی نیت کر کے بارگاہِ الٰہی میں کھڑا ہو گیا۔ سلام پھیرنے کے بعد دل سے دُعا نکلی اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری دُعا مستجاب ہو گئی۔ عصر نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اُس فوجی کمانڈر کو کہا

’’چلیے‘‘
میں نے پیلے رنگ کا خان سُوٹ پہنا تھا، سر پہ سفید رنگ کی جھالر والی ٹوپی پہنی تھی اور پاؤں میں چمڑے کی چپل۔ فوجی کمانڈر نے مجھے سب سے آگے رکھا اور خود میرے پیچھے رہا اور اپنے سپاہیوں کو اُس نے قدم سے قدم ملا کر چلنے کو کہا۔ گھر سے ہم جونہی چل پڑے تو فوجی کمانڈر نے مجھ سے پوچھا
’’آپ کا کیا نام ہے؟‘‘
’’جی، میرا نام مشتاق احمد وانی ہے‘‘
’’آپ کیا کرتے ہیں؟‘‘
’’جی، میں گورنمنٹ ملازم ہوں۔ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ماسٹر ہوں (حالانکہ اُس زمانے میں مجھے ابھی ماسٹر گریڈ نہیں ملا تھا۔ عام طور پر ٹیچر کو لوگ ماسٹر ہی کہتے ہیں)
’’آپ کی ڈیوٹی کہاں ہے؟‘‘
جی سر، میں گورنمنٹ مڈل اسکول بشٹ میں پڑھاتا ہوں‘‘
’’آپ کے باپ کا کیا نام ہے؟‘‘
’’جی، محمد اسد اللہ وانی‘‘

''آپ کتنے بھائی ہیں؟''

''سر، ہم پانچ بھائی ہیں''

''سب سے بڑے بھائی کا کیا نام ہے؟ اور وہ کیا کرتا ہے؟''

''میرے سب سے بڑے بھائی کا نام نذیر احمد وانی ہے۔ وہ چیف ہارٹیکلچر آفیسر ہیں، اس وقت اُن کی ڈیوٹی جموں میں ہے''

''بڑے بھائی سے چھوٹے بھائی کا کیا نام ہے؟''

''جی، اُن کا نام محمد ایوب وانی ہے۔ وہ اسٹیٹ فارسٹ کارپوریشن میں فارسٹر ہیں''

''تیسرے بھائی کا کیا نام ہے؟ وہ کیا کرتا ہے؟''

''سر...... اُن کا نام شوکت علی وانی ہے، وہ پٹواری ہیں۔ اُن کی ڈیوٹی چنہنی سے پار ایک گاؤں ٹنڈہار میں ہے''

''اُس سے چھوٹے بھائی کا کیا نام ہے''

''جی...... سر، اُن سے چھوٹا میں ہوں''

''آپ اپنا اصلی نام بتائیے، آپ اپنا نام ہم سے کیوں چھپا رہے ہیں؟''

''سر، میرا نام مشتاق احمد وانی ہے، میں اسکول ٹیچر ہوں۔ بچّوں کو پڑھاتا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں''

''اچھا، آپ سے جو چھوٹا بھائی ہے، اُس کا کیا نام ہے؟ وہ کہاں رہتا ہے؟''

''جی، سر اُس کا نام اشفاق احمد وانی ہے۔ وہ جونیئر انجینئر ہے۔ اُس کی ڈیوٹی اس وقت لاٹی دھونہ میں ہے''

''اچھا یہ بتائیے کہ یہ ماسٹر ایوب بکروال کون ہے؟''

''جی وہ پار ماتلائی سے تھوڑا پیچھے رہتا ہے''

''کیا وہ ماسٹر ہے؟ بچّوں کو پڑھاتا ہے؟''

''نہیں سر، دراصل اُس کے نام کے ساتھ یوں ہی ماسٹر لگ گیا ہے۔
ایک زمانے میں جب یہ لوگ خانہ بدوش تھے تو وہ بکروالوں کے چند
بچّوں کو اپنے ڈیرے پر پڑھاتا تھا۔ وہیں سے اُس کے نام کے
ساتھ ماسٹر لگ گیا''

فوجی کمانڈر مجھ سے بار بار میرا نام، ولدیت، پیشہ، سکونت کے علاوہ ایک ہی طرح کے سوالات پوچھ رہا تھا۔ اب ہم مانتلائی اور سُدھ مہادیو کے درمیان بہتے نالے پر پہنچ چکے تھے۔ مجھے گرمی کی شدت کے باعث پیاس لگی تھی۔ میں نے کمانڈر کو کہا

''مجھے پیاس لگی ہے۔ میں پانی پینا چاہتا ہوں''

اُس نے کہا

''ہاں آپ پانی پی لیجیے''

میں نے نالے پہ پانی پیا اور اُس کے بعد ہم کو ہسار نام کے ایک گاؤں میں داخل ہو کر چڑھائی چڑھنے لگے۔ تقریباً پچاس منٹ کے بعد فوجی کمانڈر نے مجھے اپنے کیمپ میں پہنچا دیا۔ اُن دنوں فوج کا کیمپ کوہسار اور سُدھ مہادیو کے درمیان ٹرن کھڈ میں ایک سرکاری عمارت میں تھا۔ آگے تقریباً 70 نوجوان سکھ سپاہی بندوقیں لیے بیٹھے تھے اور کچھ اُن میں سے ایک بڑے وائر لیس سیٹ کو لیے بیٹھے تھے۔ یہ تمام پنجاب کے سرینڈرڈ میلی ٹنیٹ تھے۔ اُنھوں نے مجھے دیکھا تو خوش ہوئے اور اُن کے صاحب نے اُنھیں مجھے پانی پلانے کو کہا۔ مجھے ایک ٹول پہ بٹھا دیا گیا اور پھر اُس فوجی کمانڈر نے مجھے اندر کمرے میں چلنے کو کہا۔ اُس وقت میں ڈر وخوف محسوس کرنے لگا۔ بہرحال میں اندر چلا گیا۔ کمرے میں مجھے ایک کُرسی پہ بٹھا دیا گیا اور دروازہ بند کر دیا گیا پھر اُس فوجی کمانڈر نے بڑے اچھے طریقے سے مجھ سے پھر وہی سوالات پوچھے جو وہ مجھ سے راستے میں پوچھتا رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پوچھنے لگا

''آپ نے کبھی فاروق یا شکیل کو دیکھا ہے؟ اُن سے کبھی آپ کی

ملاقات ہوئی؟''

''جی، کبھی نہیں دیکھا، سچ کہتا ہوں۔ میں بذاتِ خود امن پسند آدمی
ہوں۔ سرکاری ملازم ہوں، اپنے کام سے کام رکھتا ہوں''

فوجی کمانڈر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا

''دیکھیے اگر ہم سب میلی ٹینسی کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو
ہم سب کا جینا محال ہو جائے گا۔ ہمارے گھر اُجڑ جائیں گے اور
یقین کیجیے یہ میلی ٹینسی ہمارے سماج پہ ایک طرح کا کوڑھ ہے۔اس
لیے ہمیں اپنا پورا خیال رکھنا ہے۔اگر آپ لوگ فوج کا ساتھ دو گے تو
میلی ٹینسی ختم ہو سکتی ہے، ورنہ نہیں''

''جی، سر میرا بھی یہی خیال ہے کہ بندوق کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے''

فوجی کمانڈر نے جب بار بار مجھ سے ایک ہی طرح کے سوالات پوچھ کے میرے اندرون کو جانچا، پرکھا اور کُریدا تو میں نے بھی اپنا کوئی بھی بیان نہیں بدلا۔ ابھی وہ مجھ سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ تب تک باہر سے دونو جوان جو وائرلیس سیٹ پہ بیٹھے تھے، اندر آئے اور فوجی کمانڈر کو اپنے ساتھ باہر لے گئے۔ میں اندر اکیلا بیٹھا رہا۔ اب میرے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو رہی تھی۔ مجھ پہ یہ ڈر و خوف سوار ہو رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر شاید سینٹرل جیل یا کسی ایذیت خانے (Introgation Central Jail) میں پہنچانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ دل میں یہ بھی خیال آیا کہ یہ دُنیا جس میں انسان کو ہمیشہ نہیں رہنا ہے، یہاں کے بنائے ہوئے انسانوں کے قوانین توڑنے والوں کے لیے جیل خانے اور اذیت خانے ہیں اور نافرمانی یا حکم عدولی کرنے والوں کو دیش دروہی یا باغی سمجھ کر سخت سزائیں دی جاتی ہیں تو کیا اُس خالق کائنات کی جو ہم سب کو طرح طرح کی نعمتیں کھلاتا ہے اور جس نے ہمیں اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا ہے، اُس کی نافرمانی نہیں کرتے؟ ہم

جو نماز نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے، ذکوٰۃ نہیں دیتے، حج نہیں کرتے۔ ہر قدم اور ہر سانس میں اُس کی نافرمانی کرتے ہیں، تو کیا اُس کے اذیت خانوں اور جیلوں سے ہم بچ پائیں گے! میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ فوجی کمانڈر ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ کمرے میں آیا، مجھ سے ہاتھ ملایا۔ مجھے کھڑا کر کے گلے لگایا اور پھر بڑی شرمساری کے ساتھ کہنے لگا

''ماسٹر جی!......ہم سے بڑی بے ادبی ہوگئی معاف کیجیے۔ہم نے غلط آپ کو یہاں پہ لایا۔آپ وہ نہیں ہیں جس کو ہم ڈھونڈ رہے ہیں'' میں نے اُسے پوچھا

''آپ کسے ڈھونڈ رہے ہیں؟ مجھے پورا معاملہ بتا دیں ہوسکتا ہے میں آپ کی رہبری کرسکوں''

اُس نے کہا

''ماسٹر جی، ہم نے جب اپنے ڈسٹرک کمانڈر کو آپ کی جانکاری دی تو وہ سخت ناراض ہوگئے۔اُنھوں نے ہمیں ڈانٹا اور کہا کہ تُم نے ایک بے قصور آدمی کو پکڑا ہے اُسے فوراً چھوڑ دیجیے۔اُنھوں نے کہا کہ وہ ماسٹر ایوب بکروال ہے جس کے بارے میں یہ شکایت ہے کہ وہ اپنے گھر میں میلی ٹینٹوں کو پناہ دیتا ہے اور اُس کا گھر چوک نالا کے بالکل سامنے پار ہے''

اُس فوجی کمانڈر نے مجھے باہر اپنے ساتھ لایا اور سب سپاہیوں کے سامنے ایک بار پھر گلے لگایا۔تمام سپاہی یہ منظر دیکھ کے ششدر رہ گئے۔اُس نے جونہی مجھے رُخصت کیا تو سامنے میری اماں اولاد کا درد لیے میرے سامنے کھڑی انتہائی پریشان دِکھ رہی تھی۔ جب اُنھوں نے مجھے خوش وخرم دیکھا تو اُنھیں اطمینان قلب نصیب ہوا۔ جب ہم گھر میں پہنچے تو ابا اور چھوٹی ماں بھی بہت خوش ہوئے لیکن اماں بار بار میری پیٹھ پر سے قمیض اُوپر اُٹھا کر یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اُن فوجیوں نے میرے لعل کو زدوکوب

تو نہیں کیا ہے! دراصل ماسٹر ایوب بکروال اپنے بکروال محلے میں زمین پہ اپنی بکروال برادری سے لڑائی کر چکا تھا جس کی وجہ سے اُس پہ اپنی ہی برادری کے لوگوں نے ضلع کے فوجی کمانڈر سے یہ شکایت کی تھی کہ وہ میلی ٹینٹوں کو اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے۔فوجی جب اُس کی تلاش میں نکلے تو کسی اناڑی آدمی نے اُنھیں میرے گھر پہ یہ کہہ کے بھیج دیا کہ فلاں گھر میں ماسٹر بھی رہتا ہے اور ایوب بھی۔ اس طرح مجھے تقریباً چار گھنٹے بلاوجہ پریشان کیا گیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ میلی ٹینسی کے دوران خاص کر 1993ء سے 2003ء تک بہت سے بے گناہ لوگ فوج اور میلی ٹینٹوں کے ہاتھوں زدوکوب ہوئے یا پھر ہلاک کردیئے گئے لیکن یہ سب چند بدترین، عیّار اور منافق قسم کے لوگوں کی وجہ سے ہوا!

....

1990ء سے 2000ء تک یعنی پورے دس سال ریاست جموں و کشمیر میں میلی ٹینسی کی وجہ سے یہاں کے حالات انتہائی بدترین اور تشویشناک رہے۔ آٹھ سال تو مسلسل گورنری راج رہا اور اُس کے بعد لڑکھراتی ہوئی گورنمنٹ بنادی گئی۔ دس سال تک پبلک سروس کمیشن نے ہائر اسکنڈری یا کالج کی کسی بھی پوسٹ کی تشہیر نہیں کی۔ 2000ء کے آخر میں جموں و کشمیر پبلک سروس کمیشن نے مختلف مضامین میں ہائر اسکینڈری اسکولوں میں خالی پڑی اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے اُمیدواروں سے فارم طلب کیے تو میں نے بھی فارم بھر دیا اور جب چھ ماہ کے بعد انٹرویو میں بیٹھنے سے پہلے اُن اُمیدواروں کو کہ جو ایم فل اور پی ایچ ڈی نہیں تھے ایک میرٹ لسٹ تیار کرنے کے لیے ایک ٹسٹ میں (Screening Test) پاس ہونا ضروری قرار دیا گیا اور اُس کی مقررہ تاریخ بھی اخبار میں شائع کی گئی تو تب مجھے پبلک سروس کمیشن آفس (جو اُس دور میں مُبارک منڈی میں ہوا کرتا تھا) میں جا کر یہ معلوم ہوا کہ میرا فارم تین ماہ زیادہ عمر ہو جانے کی وجہ سے مسترد کر دیا گیا ہے اور جو پہلے ہی محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے

اُن کے فارم بھرنے کی عمر کی حد 40 سال رکھی گئی تھی، تب مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے میں ایک ایسے چوراہے پہ کھڑا ہوں کہ جہاں چاروں طرف سے میلی ٹینٹوں نے مجھ پر فائرنگ شروع کردی ہو! ہم کُل تین اُمیدوار تھے کہ جن کے فارم محض عمر زیادہ ہوجانے کی وجہ سے مُسترد کردیئے گئے تھے۔ ایک میں تھا، دوسرا محمد رمضان چودھری نگروٹہ والا (جس کے بارے میں کسی زمانے میں یہ مشہور تھا کہ اُسے شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ مل جائے گی) اور تیسرا فارم نسیمہ بانو ساکنہ کشتواڑ کا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں 2002ء میں گورنمنٹ بی ایڈ کالج جموں میں بی ایڈ کررہا تھا۔ ہم تینوں اُمیدوار پی ایچ ڈی تھے۔ بہرکیف محمد رمضان چودھری اور میں نے پبلک سروس کمیشن کے خلاف جموں ہائی کورٹ میں مُقدّمہ دائر کردیا اور سُریندر کور نام کی ایک خاتون کو وکیل بنایا۔ میں نے اُسے فیس کے طور پر ایک ہزار روپیہ دیا تھا، کیس جیتنے کے بعد ایک ہزار اور دینا طے پایا تھا لیکن محمد رمضان چودھری سے اُس نے دو ہزار روپے بیک وقت فیس کے طور پر لیے تھے۔ اپنی استطاعت کے مطابق وہ کافی بحث ومباحثے کے بعد ہمارے حق میں فیصلہ نہیں کرواسکی اور ہمیں پبلک سروس کمیشن کے تحت لیکچرر بننے کا موقع نہیں مل سکا! یہاں اس بات کا ذکر کرنا مفید ثابت ہوگا کہ قانون، اُصول اور ضابطے یہ تمام چیزیں قابلِ احترام ہیں لیکن وکالت کا پیشہ خاص کر اس دور میں جھوٹ بولنے کا ایک خوب صورت آرٹ بن گیا ہے۔ کچھ وکلا اپنے موکّل کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں کہ برسوں گزر جانے کے بعد بھی مُنصف کے ٹیبل پہ اُس کی فائل نہیں پہنچتی ہے اور وہ موکّل وکیل کی آمدنی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کاش! اگر لوگوں میں صرف 'صبر' جیسی عظیم خوبی پیدا ہوجاتی تو ان عدالتوں اور پولیس تھانوں میں لوگوں کا جو بے شمار رُوپیہ برباد ہوتا ہے وہ بچ سکتا ہے۔

2000ء کے بعد جب جموں وکشمیر میں مُفتی محمد سعید صاحب کی سرکار بنی تو اُس کے بعد اب تک پبلک سروس کمیشن نے خالی پڑی اسامیوں کی تشہیر کا ایک سیلاب

سا بر پا کر دیا ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں بے روزگار نوجوانوں کو اعلیٰ پائے کے عہدوں پر تعینات کیا گیا لیکن میری زندگی کے دس برس بُری طرح میلی ٹینسی کی نذر ہو گئے ! مجھے موقع نہیں مل سکا۔ اپنی بھرپور محنت، کوشش، فکر و لگن کے باوجود میں ہائر اسکینڈری، کالج یا پھر یونیورسٹی کا اسسٹنٹ پروفیسر اُس وقت نہیں بن سکا تھا۔ اِسی کا نام تقدیر ہے، اِسی کا نام مقدّر رہے۔

''مُقدّر'' کے بارے میں آج سے تقریباً بیس سال پہلے میرے ذہن پہ کچھ تناؤ سا پیدا ہوا تھا جس کی وجہ سے میں کسی حتمی نتیجے پہ نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

چنانچہ میں نے تقدیر سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کی کتاب ''تقدیر کیا ہے؟'' اور مولانا قاری طیب صاحب کی کتاب ''مسلۂ تقدیر'' جیسی عالمانہ کتابیں پڑھ ڈالیں تو میں تقدیر سے متعلق اس نتیجے پہ پہنچا کہ قسمت، تقدیر اور مقدّر یہ تینوں الفاظ بالعموم ایک ہی معنی میں بولے جاتے ہیں۔ ان سے مراد انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہیں۔ یہ موضوع بحث طلب نہیں ہے بلکہ غور طلب ہے۔ اس موضوع پر اظہار خیال کرنے سے پہلے یہ جان لینا نہایت ضروری ہے کہ آدمی کے بُرے افعال کا تعلق مقدّر کے ساتھ جوڑنا سراسر حماقت ہے۔ بُرے اعمال، بُری باتیں، بُرے طور طریقے، بُری نیت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ دراصل قسمت، مقدّر اور تقدیر کا تعلق نیک ارادے میں کامیابی یا ناکامیابی سے ہے۔ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس دُنیا کے بُرے لوگ اپنی تمام بداعمالیوں کو نوشتۂ تقدیر خیال کرتے ہیں یعنی اُن کے خیال میں نعوذ باللہ تمام بُرے کام خدا کرواتا ہے۔ انشا اللہ خاں انشاؔ کا یہ شعر دل میں چبھن سی پیدا کرتا ہے کہ ؎

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر
فعل بد خود ہی کریں لعنت کریں شیطان پر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل و صورت میں پیدا فرمایا ہے۔ ہر آدمی اپنے

جسم ہی پر نظر دوڑائے تو اُسے اپنے تمام اعضائے بدنی سر سے لے کر پیر تک بڑے خوب صورت اور مناسب مقام پر نظر آئیں گے یعنی دو آنکھیں، ناک، منہ، پیشانی، دو کان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں اور دو پیروں کے علاوہ پورے وجود کے اندر بے شمار جسمانی نعمتیں ہیں کہ جن کا شمار کرنا آسان نہیں ہے اور پھر دل و دماغ کی ہمارے جسم میں کیا حیثیت ہے وہ سب جانتے ہیں۔ دل چاہنے کا کام کرتا ہے اور دماغ فیصلے کا کام کرتا ہے۔ دل اچھا، بُرا سب چاہتا ہے لیکن دماغ کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ دل کی وہی بات مانے جو جائز ہو صحیح ہو۔ ہم ذرا لمحہ بھر کے لیے سوچیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمارا منہ سر کی پچھلی جانب رکھوایا ہوتا تو ہمارا کیا حال ہوتا یا اسی طرح دوسرے اعضا فرشتوں سے ادھر اُدھر رکھوا دیے ہوتے تو ہم کتنے بھدے لگتے اور کتنی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا اور پھر کرم پہ کرم یہ دیکھئے کہ انسانی شکل وصورت میں پیدا فرمایا کسی اور مخلوق میں پیدا فرمایا ہوتا تو ہماری کیا پیش چلتی۔ دُنیا کی بے شمار نعمتوں کے علاوہ ایک عظیم نعمت یہ کہ حضرت محمدؐ کی اُمت میں پیدا فرمایا۔ ایمان جیسی دولت نصیب فرمائی۔

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے ایک مکمل ضابطہء حیات ہے جو اللہ نے اپنے پیارے اور آخری نبی حضرت محمدؐ پر نازل فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں اپنی حکمت وقدرت، رحیمی وکریمی، جباری وقہاری، انسان اور کائنات کو پیدا فرمانے کی غرض وغایت، آپؐ سے پہلے کی اُمتوں کے احوال اور اپنی بے شمار نعمتوں کا ذکر بڑی فصاحت وبلاغت کے ساتھ فرمایا ہے۔ سورہ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی گوناگوں نعمتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بار بار فرمایا ہے کہ ''اے جن وانس! تُم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاو گے'' انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی صورت میں اپنے احکامات محفوظ فرمائے۔ محمدؐ کو خاتم النّبین اور رحمتہ اللّلعالمین بنا کر مبعوث فرمایا کہ جن کے پاکیزہ اور نُورانی طریقوں میں سو فیصدی کامیابی ہے اور اُن کے طریقوں

سے ہٹ کر سو فی صدی نا کامیابی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صراحت وضاحت بڑے دلائل کے ساتھ فرمائی ہے یعنی وہ کام کہ جو اللہ کو پسند ہیں اُنھیں کرنے کا حکم دیا ہے اور جو کام اللہ کو ناپسند ہیں اُنھیں نہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ غرضیکہ ماں کی گود سے لے کر قبر کی گود میں جانے تک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی رہنمائی فرمائی ہے۔ گویا معلوم یہ ہوا کہ یہ دُنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ ہر آدمی کی زندگی بہت زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے کہ یہ بار بار ملنے والی نہیں ہے۔ ہر ایمان والے کو یہ بھی معلوم ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں فرشتوں نے تین سوال پوچھنے ہیں۔ پہلا سوال یہ کہ تیرا رب کون ہے؟ دوسرا سوال تیرا دین کیا ہے؟ اور تیسرا سوال یہ کہ تیرا نبی کون ہے؟ ہم ذرا غور کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کتنی رحیم وکریم ہے۔ عالم برزخ میں انسان سے کیا کچھ پوچھا جائے گا۔ وہ سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تا کہ انسان اُس کی تیاری میں لگ جائے۔ اپنے پیارے نبیؐ کے ذریعے علم وآگہی کے سارے دروازے کھول دیے۔ تا کہ کل کو انسان یہ حجت پیش نہ کرے کہ مجھے تو علم نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات بالکل ناپسند ہے کہ کوئی آدمی اُس کی بے شمار نعمتیں کھائے اور کسی دوسرے کے گُن گائے۔ اس لیے آدمی کی زندگی کا بنیادی مقصد اللہ کی بندگی ہے۔ بقول مولانا رومیؒ ؎

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایمان والے گھرانے میں بچّہ یا بچّی پیدا ہونے کے فوراً بعد اُس کے کان میں اذان سُنائی جاتی ہے اور چھوٹی ہی عمر میں کلمہ طیبہ پڑھایا جاتا ہے کہ ”نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں“۔ اُس کے بعد جب وہ باتیں کرنے لگتا ہے تو اُسے ایمان مفصّل اور ایمان مجمل کے بول سکھائے جاتے ہیں۔ ایمان مفصل کا ترجمہ یہ ہے کہ ”میں ایمان لایا اللہ پر اور اُس کے فرشتوں

پر اور اُس کی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور اچھی، بُری تقدیر پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر'' ایمان مجمل کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے ''میں ایمان لایا اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور اپنی صفتوں کے ساتھ ہے اور میں نے اُس کے سارے حکموں کو قبول کیا۔ زبان سے اقرار ہے اور دل سے یقین ہے''

ایمان کے یہ بول بولنے کے بعد ایک آدمی کا ذہنی وروحانی رشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے ساتھ جڑ جاتا ہے گویا وہ ایک بہت بڑا اقرار کرتا ہے کہ اللہ ہی اُس کا خالق ومالک ہے۔ تمام مقرب وغیر مقرب فرشتے اُس کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ قرآن پاک سے پہلے جو آسمانی کتابیں یعنی توریت، زبور اور انجیل اُتری ہیں اُن کو اللہ کی کتابیں مانتا ہے۔ محمدؐ سے پہلے جتنے بھی رسول آئے سب پہ ایمان لاتا ہے، روزِ محشر پر اور اچھی بُری تقدیر پر ایمان لاتا ہے کہ وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے اور آخر پر یہ یقین بھی دل میں بسا لیتا ہے کہ مرنے کے بعد قیامت کے دن پھر زندہ ہونا ہے۔ اسی طرح ایمان مجمل میں بھی وہ اللہ پر اُس کے ناموں اور صفتوں کے ساتھ ایمان لاتا ہے۔ بندہ یہاں بھی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے سارے حکموں کو قبول کرتا ہے۔ ایمان میں داخل ہونے کے بعد یہ گنجائش ہی نہیں رہتی کہ ایک آدمی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا زبان سے اقرار کیا ہو اور دل سے تصدیق کی ہو اُس کے بعد وہ رب چاہی زندگی کے بدلے من چاہی زندگی گزارے۔ اتنے بڑے اقرار کے بعد اب اُس کے ذہن ودل میں کسی بھی بُرے کام کا خیال تک نہیں آنا چاہیے۔ اُس کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کے ذکر اور محمدؐ کے پاکیزہ اور نورانی طریقوں کے مطابق گزرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو آنکھیں دی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ ان آنکھوں سے کیا دیکھنا ہے اور کیا نہیں دیکھنا ہے۔ کان دیئے، دماغ دیا، دل دیا، زبان دی، ہاتھ پیر دیئے غرض بے شمار نعمتیں دیں اور یہ روک

لگادی کہ یہ تمام اعضائے بدنی میرے حکموں کے مطابق کام کرنے چاہیں۔ بُرے کاموں کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے اور اچھے کاموں کو پسند کرتا ہے۔ پورے قرآن پاک اور احادیث نبوی ؐ کی تعلیمات ایک انسان کو اچھے کام کرنے پر زور دیتی ہیں اور بُرے کام کرنے سے منع کرتی ہیں۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں کہ جب انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی حیرت انگیز ترقی نے قرآن وحدیث کی تعلیمات سے عوام الناس کو ہر طرح سے آگاہ کر دیا ہے اور عالمی معلومات کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے یعنی سب کچھ جانتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں زندگی گزارتے ہیں۔ اللہ کے رسول ؐ کے نورانی طریقوں کو چھوڑ کے جی رہے ہیں۔ لاپرواہی، بے فکری کے ساتھ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ضائع کرتے ہیں۔ حیرت اور دُکھ کی بات یہ کہ اُن تمام اپنے بُرے کاموں کو مقدر سے تعبیر کرتے ہیں۔

زندگی کے سفر میں انسان چند غیر اختیاری اور نامعلوم معاملات سے گزرتا ہے یعنی چند ایسی باتیں کہ جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے، انسان کو نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بچہ جب بڑا ہو جائے گا تو اُس کی شادی کہاں ہوگی، کس لڑکی کے ساتھ ہوگی۔ دوسرا شادی کے بعد پہلے لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی۔ تیسری بات یہ کہ کس شخص کی موت کب، کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ چوتھی بات یہ کہ کل کیا ہوگا۔ پانچویں بات یہ کہ بارش کب آئے گی۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا تعلق علم غیب سے ہے اور اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اب یہاں اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مختلف مثالوں سے یہ واضح کر دیا جائے کہ مقدّر کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ جیسے کہ شروع میں ہی یہ کہا گیا کہ مقدّر کا تعلق نیک ارادے میں کامیابی یا ناکامیابی سے ہے۔ بُری نیت اور بُرے کام کے ساتھ مقدّر کا کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ کسی امیر گھر میں جا کر چوری کرے اور اُس نے اپنے

اس بُرے خیال کو عملی طور پر انجام دیا۔ اُس نے چوری کرلی۔ اُس کے اس مجرمانہ عمل کو مقدّر نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی شراب پینے کا عادی ہے اور وہ یہ جانتا بھی ہو کہ اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے، مزید یہ کہ وہ اس اُم الخبائث کے مضر اثرات سے بھی واقف ہو لیکن اس کے باوجود اگر وہ اپنا نشہ پورا کرتا ہے تو اُس کے اس فعلِ بد کو مقدّر نہیں کہہ سکتے۔ فرض کریں کسی آدمی کو ڈاکٹر نے سگریٹ پینے سے منع کیا ہے لیکن وہ عادت پہ مجبور ہونے کی صورت میں سگریٹ پیتا ہے اور کھانستے کھانستے اُس کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ اُسے جب کوئی عقل مند آدمی یہ پوچھے کہ آپ یہ سگریٹ تمبا کو کیوں پیتے ہیں؟ تو اُس کا جواب یہ ہو کہ یہ میرے مقدّر میں لکھا ہوا ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ مقدّر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے آپ پہ ظلم کر رہا ہے۔ اسی طرح ایک اور مثال سے مقدّر کو سمجھنے کی کوشش کیجیے وہ یہ کہ فرض کریں آپ نے کسی معمولی یا غیر معمولی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کو حاصل کرنے کے لیے فارم بھرا۔ آپ نے کافی محنت کی، آدھی آدھی رات تک پڑھتے لکھتے رہے۔ پورے مقتضیات اور شرائط کے ساتھ آپ اُس پوسٹ کے لیے بالکل مناسب اُمیدوار ٹھہرتے ہیں لیکن یہی پوسٹ رشوت یا سفارش کی بنیاد پر کسی اور اُمیدوار کو مل جاتی ہے تو اس دھاندلی کو آپ مقدّر نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ آپ کی حق تلفی ہے، ظلم و زیادتی ہے۔ اسی حوالے سے ایک اور مثال وہ یہ کہ اگر کوئی آدمی رشوت کے روپے سے بہت بڑی اُونچی حویلی تعمیر کرواتا ہے اور گیٹ پہ لکھواتا ہے کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ رب کا فضل نہیں ہے بلکہ وہ رشوت کو مالِ غنیمت سمجھ کر اپنی خوش نصیبی تصور کر رہا ہے۔ اسی طرح حقوق اللہ کی بات کریں تو اس معاملے میں بھی جو لوگ نماز نہیں پڑھتے، بغیر شرعی عذر کے روزہ نہیں رکھتے، عشر و ذکوٰۃ نہیں دیتے، توفیق کے مطابق حج نہیں کرتے اتنا ہی نہیں بلکہ گناہ کے بغیر وہ سانس نہیں لیتے تو سمجھ لیجیے کہ اُن کی یہ باغیانہ روش اُن کا مقدّر نہیں ہے۔ غرضیکہ وہ تمام خبائث کہ جن سے احتراز برتنے یا بچنے کی تلقین قرآن و حدیث میں آئی ہے اور آدمی

اُن کو جانتے ہوئے بھی اپنے نفس کو جھوٹی تسکین دینے کی خاطر کر رہا ہے تو وہ تمام اعمال بد ہر گز مقدّر نہیں کہے جا سکتے، کیونکہ یہ دُنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزا۔

اب کچھ مثالیں ایسی بھی پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جن کا تعلق واقعی مقدّر سے ہے۔ مثال کے طور پر ایک کسان کے پاس مختلف پھلدار پیڑوں کا باغ ہے اور وہ ہر سال اپنے باغ کے چوتھائی حصے کے پھل غریب و مسکین لوگوں کو مفت میں بانٹ دیتا تھا لیکن ایک سال ایسا بھی آیا کہ پیڑوں پہ پھل تیار ہونے سے پہلے ہی موسمی خرابی کے سبب اُن پیڑوں پہ زوردار اولے پڑے جس کی وجہ سے ایک بھی پھل کسان کو نصیب نہ ہو سکا۔ یہ کسان کا مقدّر رہے۔ دوسری ایک اور مثال یہ کہ آپ بازار میں سے پیدل چل رہے تھے کہ اچانک آپ کی نظر پانچ پانچ سو کے بیس نوٹوں پر پڑی آپ نے اُنھیں فوراً اٹھا لیا آپ بہت خوش ہوئے۔ آپ جب گھر سے بازار کی جانب نکلے تھے تو آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ مجھے بازار میں سرِ راہ دس ہزار روپے نظر آئیں گے۔ یہ آپ کا مقدّر رہے۔ فرض کیا آپ نے آئی اے ایس کا فارم بھرا آپ نے بہت زیادہ محنت کی پہلا اور دوسرا امتحان آپ نے پاس کر دیا اور زبانی امتحانی کے دن آپ سخت بیمار پڑ گئے۔ آپ کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا آپ آئی اے ایس کا زبانی امتحان نہیں دے پائے۔ یہ آپ کا مقدّر رہے۔ آپ نے گائے یا بھینس دُودھ کے لیے خریدی، بہت اچھا دُودھ دیتی تھی، دو مہینے کے بعد وہ بیمار پڑ گئی لاکھ کوشش کرنے کے بعد بھی وہ نہیں بچ پائی، مر گئی۔ یہ آپ کا مقدّر رہے۔ اسی طرح کی کئی اور مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ اب یہاں ایک خاص بات یہ ذہن نشین رہے کہ نیک ارادوں میں منفی نتائج آدمی کو وقتی طور پر مایوس کرتے ہیں لیکن اللہ کی مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس ایک ناکامیابی کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے بہت سی کامیابیاں چھپا رکھی ہوں۔ حاصل غور و فکر یہ کہ آدمی کو ہر نیک کام کرنے میں پہل کرنی چاہیے اور فیصلہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر چھوڑ دینا

چاہیے۔ آج کل کے دور میں دُنیا میں جتنے بھی جرائم ہو رہے ہیں یہ سب آدمی کے نفسِ امّارہ کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ کاش! ہر شخص اپنے اندر اوصاف حمیدہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا تو وہ سماجی برائیاں، ذہنی الجھنیں اور تشویشناک ماحول جو ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے یا جس کے باعث زندگی مفلوج ہو کے رہ گئی ہے ہرگز نہ دیکھتے۔ علامہ اقبالؔ نے دراصل بہت پہلے توہم پرستی اور ذہنی کسل مندی کو موضوع بناتے ہوئے یہ کہنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس لیے انسان ہر حال میں اپنی ذہنی وجسمانی صلاحیتوں کو خداوندِ قدوس کی مرضی ومنشا کے مطابق برُوئے کار لائے یہ اُس کا فرضِ اوّلیں ہے۔ اس کے بعد جو نتیجہ سامنے آئے گا تو وہ اُس کا مقدّر رہے۔ آدمی کی مُنافقانہ ذہنیت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جب وہ کوئی اچھا کام کرتا ہے یا اتفاق سے اُس سے کوئی اچھا کام ہو جاتا ہے تو وہ اِتراتا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے کیا لیکن جب وہ اپنی نالائقی کا ثبوت دیتا ہے تو پھر کہتا ہے کہ میرے خدا نے میری تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا۔ گویا جب کوئی کام اُس کی مرضی کے مطابق خوش کُن نتائج برآمد کرتا ہے تو اُسے وہ اپنی ذہانت اور قابلیت سمجھتا ہے اور بُرے افعال کے مایوس کُن معاملات کو اللہ تعالیٰ کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے۔ جب ہم گیان اور دھیان کے ساتھ ہر اچھا اور نیک کام کریں گے تو خداوند کریم سے پوری اُمید ہے کہ وہ ہمیں کامیاب کرے گا لیکن جب ہم خدا کی مرضی کے خلاف کوئی بھی کام کریں گے تو مایوسی اور ناکامی یقینی ہے۔ آج دُنیا میں بسنے والوں کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہ اوّل تو کوئی نیک کام کرتے ہی نہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو اُس میں نمود ونمائش اور ریاکاری کا جذبہ شامل ہوتا ہے۔ دُوسری بات یہ کہ انسان فطرتاً عیاش پیدا ہوا ہے۔ وہ پہلے تو بُری عادتوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور جب یہ بُری

عادتیں اُس میں کسل مندی اور بے غیرتی کا مادہ پیدا کرنے کے بعد اُس کا کچومر نکالنے لگتی ہیں تو پھر وہ قسمت کا رونا رونے لگتا ہے۔ میں نے اپنے ملک ہندوستان میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں سے لے کر بوڑھے مرد اور عورتوں تک کو بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ ہاں کشمیری پنڈت اور سکھ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کو میں نے بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ تعجب تو اُن لوگوں پہ ہوتا ہے جو سالم وجود رکھنے کے باوجود بھیک مانگتے ہیں!

....

بہت سے لوگ جب دُنیا میں اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ یا تو خودکُشی کرتے ہیں یا پھر کسی نشے میں مُبتلا ہو جاتے ہیں یا پھر اپنا ذہنی توازن کھو دیتے ہیں۔ میں جب 2017ء تک ہائر اسکینڈری، کالج یا کسی یونیورسٹی کا اسسٹنٹ پروفیسر نہیں بن پایا تو میں نے نہ خودکُشی کی، نہ شراب پی، نہ چرس اور نہ ہی ذہنی توازن کھویا بلکہ میں نے حالات سے سمجھوتہ کیا اور ہر حال میں خوش رہنے کا ہُنر سیکھ لیا۔ میں اپنی زندگی سے انتہائی مُطمئین ہوں اور اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار و ممنون ہوں کہ جس نے مجھے انسان پیدا فرمایا، مجھے تندرست و توانا بنایا۔ مجھے دو آنکھیں دیں جن سے میں ہر اچھی چیز دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دو کان دیئے جن سے میں اچھی باتیں سُننے کی کوشش کرتا ہوں۔ زبان دی جس سے میں سچ بولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دو ہاتھ دیئے، دو ٹانگیں دیں غرضیکہ جب اپنے پورے صحیح و سالم وجود پر نظر دوڑاتا ہوں اور اُس کے بعد قدرت کے اس کارخانے میں اندھے، بہرے، لنگڑے، لُولے، اپاہج اور گونگے لوگوں کو دیکھتا ہوں تو ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے میرا سر اظہار تشکّر کے طور پر فوراً خدا کے آگے جُھک جاتا ہے۔ روٹی، کپڑا اور مکان انسان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ اللہ رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر بجالاتا ہوں کہ اُس نے مجھے ان بنیادی ضروریات کے علاوہ بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ رہنے کے لیے ایک خوب صورت

گھر دیا ہے، کھانے پینے کو بہت کچھ دیا ہے۔ایک وفادار اور جان نثار بیوی دی ہے۔ دو خوب صورت سے بچّے (بیٹا، بیٹی) دئے ہیں اوران تمام نعمتوں سے بڑھ کر ایمان وتندرستی جیسی عظیم نعمت سے نوازا ہے۔ ہائر اسکینڈری اسکول کا لیکچرر یا کالج اور یونیورسٹی کا پروفیسر بن جانا جنت میں جانے کا کوئی سرٹیفکیٹ تھوڑی ہے۔میری خوشی کا اُس وقت کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا جب میرا دھیان اس آفاقی صداقت پر جاتا ہے کہ انسان فانی ہے اور دُنیا کے یہ عہدے، یہ ڈگریاں، یہ حُسن وشباب، یہ اقتدار یہ جاہ وجلال اور دُنیا کی یہ رنگ رلیاں کہ جن میں آدمی دن رات مست رہتا ہے یہ سب کچھ ایک دن اُس سے چھن جائے گا! اللہ تعالیٰ نے اگر انسان کو فانی نہ بنایا ہوتا تو وہ نیکی کا کوئی بھی کام نہ کرتا۔ ظالم اور مظلوم کا سلسلہ برقرار رہتا۔انسان کا وجود تو مٹ جاتا ہے لیکن اُس کی نیکی اور بدی باقی رہ جاتی ہے۔موت کی قینچی کسی کو بھی نہیں بخشتی ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ انسان تب گناہ کرتا ہے جب اُسے موت، خدا اور آخرت یاد نہیں رہتی۔ آج اگر دُنیا میں بدامنی، بے چینی، بے حیائی اور بد دیانتی وبد اخلاقی کے مظاہرے ہورہے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانوں نے ان تینوں ناقابل تردید حقیقتوں کو بھلا دیا ہے۔میرا یہ ماننا ہے کہ انسان کی پیدائش اور موت دو طرح کی ہوتی ہے ایک پیدائش جسمانی ہے دوسری شعوری یا عقلی۔عقل وشعور کی پیدائش میں کافی وقت لگتا ہے۔اسی طرح جسمانی موت الگ ہے اور ضمیری موت الگ ہے۔ایک آدمی بظاہر زندہ ہے چل پھر رہا ہے لیکن اُس کا ضمیر مر چکا ہوتا ہے۔ تجربات ومشاہدات اور حالات وحوادث آدمی کو سنجیدہ اور دُور اندیش بنا دیتے ہیں، آداب زندگی اور صبر وتحمل سے کام کرنا سکھاتے ہیں۔تاریخ اقوامِ عالم پہ جب نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ موت سے کوئی بھی نہیں بچ پایا ہے۔ کتنے ہی حسین وجمیل، ذہین، قابل ترین، سائنس دانوں، بادشاہوں، فنکاروں اور مزے لُوٹنے والوں کو موت نے مٹی میں ملا دیا ہے! بقول حیدر علی آتشؔ ؎

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

....

اکتوبر 2001ء میں جب مجھے اپنے محکمے کی طرف سے گورنمنٹ بی ایڈ کالج جموں میں بی ایڈ کی ٹریننگ کے لیے جانا پڑا تو مجھے ایک بار پھر اپنی کالج کی زندگی کے دن یاد آ گئے تھے۔ میں تقریباً پورے ایک سال تین ماہ اس کالج میں بحیثیتِ طالب علم رہا تھا۔ اس دوران میں ڈیرے کے لیے انتہائی پریشان رہا، تقریباً چار جگہ ڈیرے بدلنے پڑے تھے۔ وکیل سُدیش کمار شرما صاحب کے مکان میں تقریباً چھ مہینے رہا تھا۔ اُس کے بعد اللہ کے رحم و کرم سے بی ایڈ کالج کی پرنسپل محترمہ شمیمہ بیگم نے مجھے ہوسٹل کا کمرہ الاٹ کرایا تھا اور میرے ساتھ میری خالہ زاد بہن کا بیٹا عبدالقیوم وانی بھی رہتا تھا۔ ڈیرے کے لیے جب میں کافی دنوں تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا تو میں انتہائی دُکھی ہو گیا اور تب میرے دل میں یہ خیال آیا کہ جس طرح آج میں جموں میں ڈیرے کے لیے پریشان اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کل میری اولاد کو بھی اسی طرح کا سامنا کرنا پڑے۔ اسی احساس نے مجھے جموں میں پلاٹ خریدنے پر آمادہ کیا۔ بہ فضلِ اللہ چند دنوں کے بعد میرے چھوٹے بھائی اشفاق احمد وانی نے اس سلسلے میں میری مدد کی تھی اور ایک لاکھ چالیس ہزار روپے میں، میں نے سنجواں فردوس آباد (جموں) میں دس مرلے کا پلاٹ خرید لیا۔ گورنمنٹ بی ایڈ کالج جموں کے ہوسٹل میں کُل چھ کمرے تھے اور ہر کمرے میں دو دو طالبِ علم رہتے تھے۔ ہمارے ہوسٹل کا جو باورچی تھا اُس کا نام اجیت بھائی تھا۔ مولی کا پرانٹھا اور لپٹن چائے سویرے ناشتے کے طور پر ملتی تھی۔ میں اور قیوم اپنے کمرے میں لکھتے پڑھتے تھے۔ باورچی خانے میں اجیت بھائی نے ایک چھوٹا سا ٹیلی ویژن رکھا ہوا تھا۔ وہ خود بھجن کیرتن سُننے کا بڑا شوقین تھا۔ میں صبح سویرے اکثر ٹیلی ویژن پہ یہ بھجن سُنتا تھا۔

بھلا کسی کا کر نہ سکو تو بُرا کسی سے مت کرنا
پُشپ نہیں بن سکتے تُم تو کانٹے بن کر مت رہنا

....

جنوری 2006ء میں، میں نے جموں میں اپنے مکان کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ میرے مکان کے نقشے میں تین کمرے، لابی، رسوئی، ایک غسل خانہ، ایک سٹور اور ایک برانڈہ ہے۔ مکان کے باہر سامنے باغیچہ ہے اور رسوئی کے پیچھے بھی سبزیاں اور پھل اُگانے کے لیے چھوٹا سا باغیچہ ہے۔ مکان کے چاروں طرف چہار دیواری کی گئی ہے۔

مکان بنانا میری زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا۔ اس سلسلے میں میرا یہ خیال ہے کہ جب تک خوب سرمایہ اکٹھا نہ کیا جائے تب تک مکان بنانے کا خواب نہیں دیکھنا چاہیے۔ دُوسری بات یہ کہ مکان کی بنیاد سے لے کر بجلی کا سوئچ لگانے تک مکان بنوانے والے کو سب اپنے اپنے طریقے سے لُوٹتے ہیں۔ راج محمد نام کے ایک ٹھیکیدار نے مجھے خود تو اینٹ، بجری، پتھر اور ریت یہ تمام چیزیں مناسب ریٹ پر فراہم کی تھیں لیکن مکان کی بنیادیں اُٹھانے سے چھت ڈالنے تک کیلاش نام کا ایک ایسا مستری ٹھیکے پر دیا تھا جس نے کئی جگہوں پر مکان بنانے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ اُس نے مجھے بڑی حکمتِ عملی سے لُوٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مستری میرے کام پر ایک بجے سے پہلے نہیں آتا تھا اور ریٹ فُٹ کے حساب سے بہت زیادہ تھا۔ مزدور تقریباً بارہ بجے تک ٹھہرتے تھے اور پھر واپس اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ مکان کی بنیادیں اُٹھانے میں اُس نے تقریباً پچیس دن لگائے تھے۔ جب اُس نے مجھے بہت زیادہ دُھواں دینا شروع کیا تو میں نے اُسے مکان کی بنیادیں مکمل کرنے کے بعد چھٹی کر دی۔ اُس کے بعد میں نے پورن نام کے ایک اور مستری کو اپنے مکان کی تعمیر کا کام دیا۔ اُس نے بہت مناسب ریٹ اور کم وقت میں میرا مکان تعمیر کر دیا تھا۔ مکان کو چھت ڈالنے کے بعد میں نے تقریباً دو سال تک کام بند رکھا اور جنوری، فروری

2008ء میں مکان کو پلستر کروادیا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کو پلّے لگوادیئے۔ مکان کی تعمیر کے سلسلے میں میرے چھوٹے بھائی اشفاق احمد وانی، بڑے بھائی محترم نذیر احمد وانی، بہنوئی پروفیسر محمد اسداللہ وانی صاحب، اہلیہ کے ماموں محترم نثار حسین صاحب اور میری اہلیہ کے خالہ زاد بھائیوں ڈاکٹر محمد یٰسن صاحب اور محمد سلیم نائب تحصلیدار نے مفید مشورے دیئے۔ ان کے علاوہ میرے ایک اور بہنوئی محمد حفیظ اُللہ وانی صاحب نے بھی ایک منیجر کی حیثیت سے مجھے مشورے دیئے تھے۔ میرے پڑوسی جناب عبدالخالق ڈی ایس پی صاحب انتہائی نرم مزاج، خوش گفتار اور دُور اندیش انسان ہیں۔ اُنھوں نے مجھے اپنا بھائی سمجھا اور میری بھرپور مدد کی۔ میں اپنے سسرال والوں کا بہت شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے میری ہر طرح سے مدد کی ہے۔

جنوری 2010ء میں، میں نے اپنے مکان کو رنگ وروغن کرانے، بجلی اور پانی کے سسٹم کو چالو کرانے کا کام لگوایا۔ تقریباً دو مہینے اسی کام میں لگ گئے۔ برآمدے، رسوئی اور لابی میں سنگ مرمر بچھوایا اور اس کے علاوہ اپنے مکان کے احاطے میں داخل ہونے کے لیے گیٹ بنوایا۔ ضرورت کی ہر چیز اپنی جگہ پہ رکھی اور جب رنگ روغن کرنے والوں نے پورے مکان کو رنگ کردیا تو میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ اب مکان کے لان میں ہری ہری گھاس، سایہ دار چھوٹے چھوٹے پیڑوں کے علاوہ پھلدار پودے اور مختلف طرح کے پھولوں سے میرا گھر آنگن مہکتا رہے۔ چنانچہ میں نے مالی سے یہ سب چیزیں لگوائیں۔ اب میرا مکان نئی نویلی دلہن کی طرح سجا سجایا نظر آنے لگا لیکن یہ سب کچھ دیکھ کے میرے دل کے اندر اک ہُوک سی اُٹھی یہ سوچتے ہوئے کہ یہ تو میرا اصلی گھر ہے ہی نہیں! میرا اصلی گھر تو جنت ہے جہاں سے حضرت آدمؑ اور اماں حوا کو نکالا گیا تھا۔ ہم سب جائز اور ناجائز طریقوں سے صرف اپنی اپنی ذمے داریوں کو نبھا رہے ہیں۔ اپنی اپنی اغراض اور مقاصد کی ڈور میں قدرت نے ہمیں باندھ دیا ہے۔ ہم سب نفسِ امّارہ اور نفسِ لوّامہ کے چکرویو میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کون کس کے لیے

روتا ہے؟ یہاں تو سب اپنے مطلب کے یار ہیں۔کسی شاعر نے صحیح کہا ہے کہ ؎

سارے جھگڑے ہی زندگی تک ہیں
کون مرتا ہے پھر کسی کے لیے

....

کبھی کبھی جب اچانک نرم گرم بستر پہ لیٹے ہوئے میرا دھیان قبر کی تنہائی اور تاریکی کی طرف جاتا ہے تو میرے دل کا چین اور آنکھوں سے نیند اُڑ جاتی ہے۔ وقت کے دریا میں ہم سب بہہ رہے ہیں۔تغیر وتبدّل قدرت کا ایک ایسا قانون ہے کہ جسے انسان بدل نہیں سکتا۔انسانی زندگی کی المناک کہانی یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں بڑے ارمان پالتا ہے اور اُن کی تکمیل کے لیے ہزاروں جتن کرتا ہے۔یہ سدا بہار رہنے کی اُمنگ میں اپنے سفید بالوں کو سیاہ کرتا ہے۔اصلیت کو چھپانے کے لیے اُس پہ بُری طرح پردہ ڈالتا ہے لیکن سچائی ہر حال میں اُبھر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔'وقت' چونکہ سب سے بڑی سچائی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں زمانے کی قسم کھائی ہے کہ انسان بے شک خسارے اور گھاٹے میں ہے مگر وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے اور صبر پر قائم رہے وہی کامیاب ہیں۔جس طرح برف کی سِل تیز کڑکتی دُھوپ میں پگھل جاتی ہے اور اُسے بیچنے والا بے بس ہوتا ہے کہ اُس میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ اُسے پگھلنے نہ دے، عین اُسی طرح انسان وقت کے آگے بے بس و مجبور ہے۔شب و روز کے بندھن میں ہم بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھے ہو جاتے ہیں!بقول امیر اللہ تسلیم ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

....

انسان، زندگی میں ٹھوکروں سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔بھلے ہی ٹھوکر لگنے کے بعد

انسان کو تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن اُس کے بعد وہ سنبھل کے آگے قدم رکھتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ سنبھل کے چلتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ ایک نئے تجربے اور مُشاہدے سے گزرتا ہے۔ اُس کی سوچ کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ وہ سماج میں رہنے والے مختلف طرح کے افراد کی نفسیات، سوچ، فکر، طرزِ زندگی اور اُن تمام ذہنی خباشتوں سے واقف ہو جاتا ہے کہ جو انسان کو پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس طرح اُس میں شعوری طور پر ایک سنجیدہ پن اور ذہنی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔

جون 1991ء میں میرے دل نے یہ چاہا کہ میں دلّی کی سیر کر آؤں۔ اُن دنوں میری ڈیوٹی گورنمنٹ مڈل اسکول بپ میں تھی۔ گرمیوں کی دس چھٹیاں پڑتے ہی میں نے دلّی جانے کا پروگرام بنایا اور پہلی بار دلّی جا رہا تھا وہ بھی اکیلا۔ میں جموں ریلوے اسٹیشن پہ پہنچا۔ میرے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اُس میں رات کو پہننے کے لیے کپڑے کا ایک سُوٹ، تولیہ، صابن، پیسٹ اور تین سو روپیہ بھی تھا۔ میں نے جنرل ڈبے کا ٹکٹ خریدا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔ ٹرین اسٹیشن سے تقریباً دس منٹ کے بعد دلّی کے لیے روانہ ہونے والی تھی۔ میں نے اپنا بریف کیس اپنی سیٹ کی چھت پہ رکھا اور ایک آدمی کو جو غالباً پٹھان کوٹ جا رہا تھا اُسے بریف کیس کا خیال رکھنے کو کہا اور خود کوئی چیز کھانے کے لیے ٹرین سے باہر آ گیا۔ مجھے اب پورا یاد نہیں کہ کیلے یا سیب باہر سے خریدے اور واپس اپنے جنرل ڈبّے کی طرف جانے لگا کہ اتنے میں ٹرین نے دھیرے دھیرے اسٹیشن چھوڑ دیا۔ میں اپنے ڈبّے کی طرف بڑی تیزی سے دوڑنے لگا اور جونہی میں جنرل ڈبّے کے قریب پہنچا تو ٹرین کی رفتار اتنی تیز ہوگئی کہ میں اُس پہ سوار نہیں ہوسکا۔۔ دیکھتے دیکھتے ٹرین میری نظروں سے اوجھل ہوگئی اور اس طرح میں نے اپنی حماقت سے بریف کیس کھو دیا۔ اگر میں کسی بھی ڈبّے میں سوار ہوا ہوتا تو میں اپنا بریف کیس ہرگز نہ گنواتا۔ چونکہ میں ٹرین کے سفر سے واقف نہیں تھا اس لیے میرے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آیا۔ پھر بھی اللہ کا شکر کہ اس بریف کیس میں

میرے تعلیمی دستاویزات نہیں تھے۔اس ٹھوکر سے میں نے یہ سیکھا کہ ٹرین اگر اسٹیشن سے چل پڑے تو آپ کسی ایک ڈبّے میں وقتی طور پر سوار ہو جایئے اور پھر بعد میں اپنے ڈبّے میں پہنچ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ جایئے۔

....

دُوسرا ایک اور اسی نوعیت کا واقعہ میرے ساتھ جون 2000ء میں پیش آیا۔ میں نے باضابطہ طور پر ٹرین کا ٹکٹ دہلی جانے کے لیے بنوالیا تھا۔ جون مہینے کی گرمی سے سارا جموں شہر دہک رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اُس میں دو ہزار روپے، کپڑوں کا ایک سُوٹ، بینک کی پاس بُک اور بھی کچھ کاغذات تھے۔ رات کے تقریباً نو بجے ریلوے اسٹیشن جموں سے غالباً پوجا ایکسپریس دہلی جارہی تھی۔ مجھے بھی اُسی ٹرین میں دہلی جانا تھا۔شام ہوتے ہی میں جموں ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ریلوے اسٹیشن پہ لوگوں کی کافی بھیڑ تھی۔ میں پلیٹ فارم نمبر تین پر پہنچ گیا۔اُس پیلٹ فارم پہ ایک اجنبی شخص نے مجھے اپنا دوست بنانے کا ڈراما شروع کر دیا۔ بڑی اچھی باتیں کرنے لگا۔ مجھے بھائی جان! میرے محترم! میرے دوست جیسے آداب والقاب سے مخاطب کرنے لگا۔اُس نے اپنا شناختی کارڈ بھی مجھے دکھایا۔اپنے آپ کو کسی پریس کا رپورٹر ظاہر کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں مجھے اُس نے اپنی طرف اتنا مائل کر دیا کہ مجھے وہ جیسے برسوں پرانا دوست معلوم ہونے لگا۔ ریلوے منتظمین نے اعلان بھی کروایا کہ دہلی جانے والی ٹرین پوجا ایکسپریس پلیٹ فارم نمبر تین کے بجائے پلیٹ فارم نمبر ایک پر سے جارہی ہے لیکن بہت شور ہونے کی وجہ سے مجھے اعلان صاف نہیں سُنائی دیا اور اُس نے بھی دہلی ہی جانا تھا۔ اُس نے مجھے پلیٹ فارم نمبر ایک پر نہیں جانے دیا یہ کہتے ہوئے کہ ٹرین اسی پلیٹ فارم پر آرہی ہے۔ رات کے ساڑھے نو بھی بج گئے۔ ٹرین نہیں آئی۔ بالآخر رات کے تقریباً گیارہ بج گئے۔ میں زبردستی اُٹھا اُس کو بھی اپنے ساتھ لیا۔ہم دونوں جب ریلوے پوچھ تاچھ والے کیبن پر

پہنچے اور ٹرین کے بارے میں معلوم کیا تو واپس یہ جواب ملا

''کیا تُم ابھی تک سوئے ہوئے تھے؟۔ دہلی جانے والی ٹرین پوجا ایکسپریس تو پورے نو بجے پلیٹ فارم تین پر سے چلی گئی ہے''

یہ سُن کے مجھے ایک دھچکا سا محسوس ہوا۔ دل انتہائی دُکھی ہوا۔ بہر حال ہم نے اپنے ٹکٹ اسٹیشن ماسٹر کو دکھائے اور ہمیں کچھ روپے واپس مل گئے اور کچھ اُس نے کاٹ لیے۔ اب آدھی رات ہونے جا رہی تھی۔ رات کو کہاں جائیں؟ ریلوے اسٹیشن سے بس اڈے کی طرف کوئی بھی چھوٹی بڑی گاڑی نہیں جا رہی تھی۔ بہت سے مُسافر کچھ تو پلیٹ فارموں پر ہی سو گئے تھے اور کچھ ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں بیٹھے اور کچھ سو گئے تھے۔ اُس اجنبی شخص نے مجھے کہا

''بھائی صاحب! اس وقت ہم کہاں جائیں گے، آدھی رات ہو چکی ہے اور پھر رات کو اِدھر اُدھر جانا خطرے سے خالی نہیں۔ پولیس پکڑ دھکڑ کرتی ہے۔ بہت سے لوگ آپ دیکھ رہے ہیں اسٹیشن کے احاطے میں سوئے پڑے ہیں۔ میرے پاس کپڑے کی ایک ڈبل چادر ہے۔ اُسے نیچے بچھا کر ہم یہیں سو جاتے ہیں اور سویرے دونوں بس پر دہلی چلے جائیں گے۔''

میں نے اُس کی بات مان لی۔ اُس نے اپنے بیگ میں سے ایک چادر نکالی، اُسے نیچے بچھایا۔ اُس کے بعد ہم بُسکٹ کھانے لگے اور باتیں کرتے ہوئے لیٹ گئے۔ میں نے اپنا بریف کیس اپنے سرہانے رکھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ سویرے تقریباً دس بج چکے تھے۔ میری آنکھیں نہیں کُھل پا رہی تھیں۔ میں بے ہوش ریلوئے اسٹیشن پہ پڑا ہوا تھا۔ دُھوپ کی وجہ سے مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے اُوپر اُٹھنے کی کوشش کی تو پھر لیٹ گیا۔ اجنبی شخص میرے ساتھ اپنی دوستی کا حق ادا کر چکا تھا۔ وہ مجھے کوئی نشیلی چیز سونگھا کے میرا بریف کیس لے

کر نہ جانے کدھر بھاگ گیا تھا اور اِدھر میں بے ہوشی سے لڑ رہا تھا!۔ بڑی مشکل سے میں کھڑا ہو گیا۔ آس پاس نظر دوڑائی تو لوگ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ میرا بریف کیس اجنبی شخص چرا کے بھاگ گیا ہے تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے کوئی نشہ آور چیز مجھے نیند پڑتے ہی سونگھانا شروع کر دی تھی اور جب میں بالکل بے ہوش ہو گیا تو تب اُس نے اپنا کام کر دیا تھا۔ مجھے دو ہزار روپے، جموں و کشمیر بینک کی پاس بُک، کپڑوں کا نیا سوٹ، تولیہ اور صابن پیسٹ وغیرہ سبھی چیزیں یاد آنے لگیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی سادگی، معصومیت اور بھولے پن پہ غصہ آ رہا تھا۔ دوستی کیا ہوتی ہے؟ اور دُشمنی کیا ہوتی ہے؟ آج میرے لیے یہ ایک نیا موضوع تھا، پھر بھی اللہ تعالیٰ کی رحیمی و کریمی دیکھئے کہ اُس نے مجھے اُس اجنبی شخص سے زندہ رکھوایا۔ ورنہ وہ تو مجھے بآسانی قتل بھی کر سکتا تھا۔ شکرِ الٰہی کرتے ہوئے واپس گھر پہنچا تو گھر والے میری کیفیت بھانپ گئے۔ سوائے اظہارِ افسوس کے کوئی کیا کر سکتا تھا! اس ٹھوکر سے میں نے بالکل ایک نئی بات سیکھی وہ یہ کہ آدمی، آدمی کو کیسے بھیس بدل کر لُوٹتا ہے۔ مکر و فریب، جعل سازی، چاپلوسی اور دھوکہ دھڑی یہ تمام حربے آدمی اپنے نفس کی آگ بجھانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ پہلے واقعے سے یہ واقعہ میرے لیے بالکل ایک نیا حیران کُن اور عبرت آمیز واقعہ تھا۔ اس لیے کہ مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہوا کہ نہ صرف ریلوے اسٹیشنوں پہ بلکہ بس اڈوں اور شادی بیاہ کی مجلسوں میں بھی چوریاں ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی بھی اجنبی شخص کو فوراً دوست نہیں سمجھنا چاہیے۔ علاوہ ازیں اپنے سامان اور ایمان کی حفاظت خود کرنی چاہیے تا کہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ مجھے اس بات کا بھی تجربہ حاصل ہوا کہ دورانِ سفر انسان کو اتنا بیدار اور فکر مند رہنا چاہیے کہ کوئی اگر اُس سے بات کرے بھی تو وہ اُسے صرف ہاں ناں میں جواب دے۔ اپنا پورا تعارف نہ کرائے۔ اپنے چہرے سے خفگی کے آثار ظاہر کرے۔ ہر شخص کو مشکوک نظروں سے دیکھے کیونکہ چور، لُچے، لفنگے اور بدمعاش قسم کے لوگ بہت

حد تک ماہرِ نفسیات ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ تر شریف اور سیدھے سادے لوگوں کی حرکات وسکنات دیکھتے رہتے ہیں اور چہرے کی کیفیت پر نظر رکھتے ہیں۔

....

تیسرا واقعہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے جو میرے سفر ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ دراصل بڑے شہروں کے چور زیادہ تر بریف کیسوں پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ روپے اور بریف کیس کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کے ہاتھ میں بریف کیس دیکھ کر چور کا دل زیادہ للچا اُٹھتا ہے۔ وہ اسی کوشش اور سوچ میں رہتا ہے کہ فلاں شخص کا بریف کیس اگر میرے ہاتھ میں آ گیا تو زیرو سے ہیرو بن جاؤں گا۔ یہ جنوری 2006ء کی بات ہے۔ میں کوئی پانچ دن کے لیے دہلی جا رہا تھا۔ میں نے فوجی کنٹین سے اپنی مرضی کا ایک خوب صورت اور تھوڑا بڑے سائز کا بریف کیس شوق سے خریدا تھا۔ تقریباً کپڑوں کے چار سُوٹ کے علاوہ کچھ اور ضروری چیزیں بھی اُس میں آ جاتی تھیں۔ جب گھر سے نکلا تو نہایت ہوشیاری سے جموں پہنچا۔ دل میں اس بات کا احساس تھا کہ میں سفر میں اکثر لُوٹا گیا ہوں لہٰذا اب میرا کوئی بھی نقصان نہ ہو۔ جموں سے دہلی تک ٹرین میں بریف کیس پر بار بار میری نظر جاتی تھی۔ اُس میں میرے بالکل دو نئے سوئٹر تھے علاوہ ازیں بالکل ایک نیا تولیہ، ایک پینٹ اور بوشرٹ، ایل پی جی گیس کی کاپی اور ایک کتاب سے متعلق مواد یہ تمام چیزیں بریف کیس میں تھیں۔ دہلی میں چار دن رہا اور پانچویں دن واپس آ رہا تھا۔ رات کو ٹرین تھی۔ دن کو میں نے مصالحے پینے والی مشین دریا گنج نئی دہلی سے خریدی اور رات کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے مجھے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے جموں کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں نے شام کا کھانا کھایا اور رکشے پہ بیٹھ کے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ٹرین پلیٹ فارم پہ ابھی نہیں لگی تھی۔ میں نے ایک پھل فروش سے انگور خریدا، اُسے بیگ میں رکھا اور ٹرین کے انتظار میں پلیٹ فارم پہ بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے سامان پہ برابر نظر

تھی۔کوئی آدھے گھنٹے کے بعد جموں جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر آ گئی۔ میں نے اپنے ڈبے کا نمبر معلوم کیا اور سامان بڑے ہوش وحواس کے ساتھ اُٹھا کر اندر ڈبے میں لے گیا۔ اپنی سیٹ معلوم کرنے کے بعد میں نے بیگ کو سیٹ پہ رکھا۔ بریف کیس اور مصالحے پیسنے والی مشین کو برتھ پہ رکھا اور خود نیچے سیٹ پہ بیٹھا انگور کھانے لگا۔کوئی پانچ منٹ کے بعد میری توجہ اپنے سامان پر سے ہٹ گئی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا کہ اتنے میں کوئی تین قلی سامان چڑھانے کے لیے میرے ڈبے میں آ گھُسے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک منٹ میں نیچے اُتر گئے۔ میں نے جب اپنی سیٹ کے اُوپر برتھ پر نظر ڈالی تو بریف کیس کو وہاں سے غائب پایا اور مصالحے پیسنے والی مشین کو وہیں پایا۔ میں نے جب بریف کیس نہیں پایا تو انتہائی دُکھی ہوا۔فوراً ٹرین سے باہر آیا آگے پیچھے دوڑا تا کہ مجھے اپنا بریف کیس کسی کے ہاتھ میں نظر آئے مگر کسی کے پاس نہیں پایا! یہ میری لاپرواہی کا نتیجہ تھا کہ میں نے اپنی نظروں میں نہیں رکھا اور اس طرح میری بے فکری کا قلیوں نے فائدہ اُٹھایا۔اس واقعے یا ٹھوکر سے جہاں مجھ میں غم وغصے کی لہر پیدا ہوئی تو وہیں میں نے یہ بھی سیکھا کہ سفر میں بریف کیس ساتھ لینا ہی حماقت اور نیند گنوانے والی بات ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی سیکھا کہ سفر میں معمولی سی لغزش یا بے فکری ایک بڑے نقصان اور افسوس کا باعث بن سکتی ہے۔اس بریف کیس کے چوری ہونے کے بعد میں نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ میں بس، ٹرین یا پیدل سفر کرنے کے دوران ہرگز بریف کیس ساتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔اب جب بھی سفر پہ جاتا ہوں تو بریف کیس کے بدلے بیگ میں اپنی ضرورت کی چیزیں ساتھ لے جاتا ہوں۔سوچنے کی بات ہے کہ جس شخص کے تین بریف کیس سفر میں چُرائے گئے ہوں کیا وہ عبرت حاصل نہیں کرے گا؟ اتنا ہی نہیں بلکہ اب جب بھی ٹرین یا بس میں سفر کرتا ہوں تو سامان کو ہاتھوں میں مضبوط پکڑ کے رکھتا ہوں اور رات کو جب ٹرین میں سوتا ہوں تو بیگ کی بدّ رکوا اپنے گلے اور بازو میں ڈال دیتا ہوں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی میرے دل ودماغ پہ

ایک فکر سی سوار رہتی ہے اور پھر خدا کے بھروسے پہ سو جاتا ہوں۔ دل و دماغ میں ایسا وہم بیٹھ گیا ہے کہ میں دورانِ سفر اسی خدشے میں رہتا ہوں کہ میرا سامان کوئی چُرا لے جائے گا۔

....

2004ء میں جب مجھے پہلی بار بریلی (یوپی) جانے کا موقع ملا تو میں وہاں ایک خانقاہ میں ٹھہرا تھا۔ ایم جے پی رُوہیل کھنڈ یونیورسٹی کے قریب ہی خانقاہِ ہاشمیہ ہے، یہ قومی شاہراہ کے بالکل کنارے پر واقع ہے۔ اسی خانقاہ کے اندر ایک طرف مسجد شریف بنائی گئی ہے۔ یہاں اللہ کے کوئی ولی مدفون ہیں اور بلالحاظ مذہب وملّت یہاں لوگ آتے ہیں، دُعا مانگتے ہیں۔ میں اجنبی شہر کا اجنبی آدمی ہونے کی حیثیت سے اس خانقاہِ ہاشمیہ میں چلا گیا۔ نمازِ عصر کا وقت ہو چکا تھا اور میں نماز پڑھنے کی غرض سے مسجد میں پہنچا۔ میری ملاقات اُس خانقاہ کے منتظم حافظ سید فریدالاسلام ہاشمی صاحب سے ہوئی۔ وہ انتہائی خدادوست، نیک سیرت اور فیاض ہیں۔ اُنھوں نے مجھے اپنے بھائی سے بھی زیادہ پیار دیا۔ تقریباً دو دن میں اُن کے پاس ٹھہرا تھا۔ بڑے آرام سے اُنھوں نے مجھے اپنے پاس رکھا تھا۔ مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں گھر سے باہر ہوں۔ رات کو کھانا کھاتے ہوئے مجھے اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ واقعی دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام۔ گھر سے نکلتے ہوئے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ بریلی پہنچ کر حافظ سید فریدالاسلام ہاشمی صاحب مجھے نہ صرف مہمان بلکہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھیں گے۔ بریلی کا سُرمہ بڑا مشہور ہے۔ میں نے بچپن میں ریڈیو پہ فلم 'میرا سایہ' کا یہ گیت کئی بار سُنا ہے کہ ؎

بریلی کے بازار میں جھمکا گرا رے

اور آج میری آنکھوں کے سامنے بریلی کا بازار تھا۔ بریلی کے نام سے دو شہر بڑے مشہور ہیں ایک رائے بریلی اور دوسرا بانس بریلی۔ ہمارے فلم سازوں نے

ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر اور کئی دیہات کے خوب صورت مقامات کے کلچر، ثقافت اور فطری ماحول کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کر دیا ہے۔ میں دو دن بریلی شہر میں ٹھہرا تھا۔ اس دوران میرے ساتھ ایک جان لیوا واقعہ پیش آیا تھا، ہوا یوں کہ بریلی شریف میں ہر سال جناب احمد رضا خان بریلوی کی دینی خدمات کو یاد کرنے کے لیے ایک اجتماع کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اتفاقاً ان ہی دو دنوں میں یہ اجتماع ہو رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں بھی اس اجتماع میں جاکر علمائے کرام کے ولولہ انگیز دینی شعور اور جذبات و احساسات سے مستفید ہو جاؤں۔ میں نے پہلے تو احمد رضا خان صاحب بریلوی کے مزار پر جاکر فاتحہ خوانی کی اور اُس کے بعد اجتماع گاہ کی طرف چل پڑا۔ محترم احمد رضا خان بریلوی اپنے وقت کے ایک جیّد عالم و فاضل شخصیت تھے۔ جہاں تک میری قلیل واقفیت، معلومات یا دینی مطالعے اور حافظے کا تعلق ہے۔ میں یہ بات وثوق سے کہتا ہوں کہ موصوف نے کہیں پر بھی اپنے دینی لٹریچر میں یہ نہیں لکھا ہے کہ ایک کلمہ گو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو بھول جائے اور صرف کسی ولی اللہ کی قبر پر جاکر سجدہ کرے اور اُس سے اپنی مُرادیں مانگے۔ میری آنکھوں نے دیکھا کہ لوگ جن میں برائے نام مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی وہ آؤ دیکھ رہے تھے نہ تاؤ فوراً آکر احمد رضا خان صاحب بریلوی کے مزار پر سجدہ ریز ہو کر اپنی ناک اور پیشانی رگڑتے اور اُس کے بعد ہاتھ اُٹھا کر اُن سے دُعا مانگتے! میں نے جب یہ حال دیکھا تو میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں دل ہی دل میں استغفار پڑھنے لگا۔ میں یہ سوچتا رہا کہ سجدہ تو اللہ کے لیے مخصوص ہے اور یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ انسان، انسان کو سجدہ کر رہا ہے! افسوس صد ہا افسوس! دین کی محنت چھوٹنے کی وجہ سے اُمتِ مسلمہ آج اس حد تک گر گئی ہے کہ اُس نے مخلوق کو خالق کا درجہ دے رکھا ہے۔ دراصل شیطانی بہکاوے میں آکر آج جہاں مُسلمانوں کے کئی فرقے وجود میں آچکے ہیں تو وہیں ایک اور نیا فرقہ قبر پرستوں کا سامنے آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی کی عقل مسخ ہو جاتی

ہے اور قوتِ ادراک سلب ہو جاتی ہے تو پھر انسان ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ جنھیں دیوانہ پن اور نازیبا کہا جاسکتا ہے۔ ہاں تو میں اپنے جان لیوا واقعے کے سلسلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب میں اجتماع گاہ میں پہنچا تو ایک وسیع وعریض میدان میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ دینی کتابوں کے اسٹال جگہ جگہ لگے ہوئے تھے۔ وعظ ونصیحت چل رہی تھی اور بیچ بیچ میں نعت خوانی بھی ہو رہی تھی۔ اس بھاری اجتماع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے بریلی شہر کے تاجروں نے بھی مختلف طرح کی دُکانیں سجا رکھی تھیں۔ کچھ ہی وقت کے بعد یہ دو روزہ اجتماع اختتام پذیر ہوا اور لوگوں کا ہجوم ایک بڑے چوک میں سے گزرتا ہوا اچانک رُک گیا۔ میں بھی ہجوم کے وسط میں تھا۔ لوگ دراصل اپنی اپنی راہ کی تلاش میں دو بڑے گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ اچانک جب آگے سے بھی ہجوم آیا اور پیچھے سے بھی کہ جس میں، میں بھی شامل تھا۔ سبھی کچھوے کی چال چل رہے تھے اور دونوں ہجوم مخالف سمتوں میں اپنی راہ پہ چلنے کے لیے زور لگانے لگے۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، بچّے اور جوان ایک دُوسرے کو دھکّے مارنے لگے۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بھگدڑ مچنا شروع ہوئی۔ میں ہجوم کے بیچ میں پھنس چکا تھا، وہاں سے نکلنے کی کوئی بھی راہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ آگے پیچھے لوگ ہی لوگ ایک دوسرے پر بے بسی کے عالم میں گرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہاہا کار میں کوئی بھی کسی کی بات سُننے کو تیار نہیں تھا، تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی اور ڈر وخوف کی وجہ سے ٹانگوں میں رعشہ آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں نیچے گر جاؤں گا۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دھکّے کی ایک تیز لہر میں کچھ بوڑھے مرد وعورتیں اور بچّے چیخنے چلّانے پر مجبور ہو گئے۔ میں اپنے آپ کو آزاد کرانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا مگر بے سُود۔ بالآخر مجھے موت کے آثار دکھائی دینے لگے۔ میں دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے ملتمس ہوا۔ یاالٰہی! میری مدد کیجیے! میں پردیس میں آیا ہوں، یہاں میرا کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ مجھے اس مُصیبت سے چھٹکارا دلا دیجیے!

چند لمحوں میں ہی اللہ تعالیٰ نے میری فریاد سُن لی۔ میں آہستہ آہستہ ایک فصیل کی جانب سرکنے لگا۔ اُس فصیل کے ساتھ ہی ایک ریڑھی لگی ہوئی تھی اور ایک شخص اُس ریڑھی پہ چڑھ کر اپنے کسی بوڑھے شخص کو کندھے پر چڑھنے کو کہہ رہا تھا۔ بوڑھا آدمی کوشش کے باوجود اُس نوجوان کے کندھے پر نہیں چڑھ پا رہا تھا۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور اُس نوجوان سے التجا کی کہ وہ مجھے ہجوم سے نجات دلانے میں میری مدد کرے۔ ابھی وہ ہاں ناں بھی نہ کہہ پایا تھا کہ میں نے فوراً اُچھل کر اُس کے دونوں کندھوں پر پاؤں رکھے اور فصیل پر چڑھ گیا۔ فصیل کے اُس طرف ایک کھلا میدان تھا، میں نے فوراً تقریباً 12 فُٹ کی اُونچائی سے نیچے چھلانگ لگائی اور اس طرح میں اللہ ربُ العزت کا شکر ادا کرتے ہوئے اُس لوگوں کے ہجوم اور بھگدڑ سے نجات پانے میں کامیاب ہوگیا۔ آج بھی جب مجھے بریلی شہر میں ہوئے اُس جان لیوا واقعے کی یاد آتی ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

....

2 فروری 2005ء کو مجھے اپنی اہلیہ کے ماموں زاد بھائی بشارت حُسین کی برات میں لکھنو جانے کا موقع ملا۔ میں نے پہلی بار لکھنو دیکھا تو پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مرزا محمد ہادی رُسوا کے دور کا لکھنو یاد آ گیا۔ لکھنو، نوابوں اور رئیس زادوں کا شہر رہا ہے۔ یہاں کی تہذیب کسی زمانے میں ایک خاص درجہ رکھتی تھی۔ ہم رات کو جموں سے تقریباً آٹھ بجے لکھنو جانے والی ٹرین پہ سوار ہوئے تھے۔ ہم تقریباً پندرہ آدمی تھے اور دوسرے دن تین بجے کے قریب لکھنو پہنچ گئے تھے۔ ہمیں لکھنو والوں نے ایک اچھے ریسٹورنٹ میں بڑے اعلیٰ انتظام کے ساتھ رات کو ٹھہرایا تھا۔ دُوسرے دن ہم سب لکھنو شہر کی چند تاریخی عمارتوں کو دیکھنے گئے تھے۔ بھُول بھلیّاں اور امام باڑوں کے علاوہ نوابوں کے محلات، چوک بازار دیکھ کر مجھے جہاں ایک طرف بہت خوشی ہوئی تھی تو وہیں دوسری طرف میری آنکھیں چھلک پڑی تھیں یہ سوچتے ہوئے کہ آخر کہاں

گئے وہ لوگ جنھوں نے یہ عالیشان محلات اور حیران کُن کارنامے انجام دیے ہیں! لکھنو کے چند اہم مقامات کی سیر کرنے کے بعد ہم پھر اُسی ریسٹورینٹ میں جمع ہوگئے اور دُلہے کو تیار کرنے کے بعد رات کے تقریباً آٹھ بجے اُس ہوٹل سے ہم برات کی صورت میں بارہ دری نام کی ایک مشہور جگہ کے لیے روانہ ہوگئے تھے۔ لڑکی والوں نے نہایت عمدہ کھانے کا انتظام کیا تھا۔ مہمان نوازی، نفاست پسندی اور تہذیب وشائستگی کے میدان میں لکھنو والوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ پہلے نکاح خوانی ہوئی تھی اور اُس کے بعد کھانے کا عمل شروع ہوا تھا۔ دُوسرے دن ہم تقریباً چار بجے کے قریب ریلوے اسٹیشن لکھنو سے جموں کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ مجھے ندوۃ العلما دیکھنے کا بہت شوق تھا مگر بامرِ مجبوری وہاں جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ میں ٹرین میں بیٹھے بیٹھے یہ سوچتا رہ گیا تھا کہ جب بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اُسے یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ زندگی کے سفر میں مجھے کن کن مراحل سے گزرنا ہے۔ بے شک اللہ کی مرضی کے بغیر تو پتا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا ہے۔

....

8/ اکتوبر 2005ء کو بوقت 9 بجکر 21 منٹ پر ہماری ریاست جموں وکشمیر کے علاوہ آزاد کشمیر، مظفرآباد اور پاکستان کے پہاڑی علاقوں میں ایک زبردست بھونچال آیا تھا۔ میں نیا نیا گورنمنٹ ہائر اسکینڈری اسکول سُدھ مہادیو سے ماسٹر گریڈ لے کر ہائی اسکول بپ (اب بپ میں ہائر اسکنڈری اسکول ہے) میں تعینات کیا گیا تھا اور ابھی مجھے چار ہی ماہ اس اسکول میں کام کرتے گزرے تھے کہ 8/ اکتوبر 2005ء کو ایک ایسا بھونچال آیا تھا کہ جسے میں اپنی زندگی میں کبھی بھی بھول نہیں پاؤں گا۔ لوگ مکئی کی فصل کاٹ چکے تھے اور اب کھیتوں میں سرسوں اور گندم بونے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے اسکول کے ساتھ ہی ایک راجپوت گھرانے میں کمرہ کرائے پہ لے رکھا تھا۔ چائے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں بیڈ پہ بیٹھا چھٹی کی درخواست لکھ رہا

تھا۔ ریڈیو کشمیر جموں سے صبح 9.20 پر خبریں نشر ہو رہی تھیں کہ اسی دوران میرا بیڈ جھول کھانے لگا اور کڑ کڑ کی آواز سے سارا مکان ہلنے لگا۔ ریڈیو بھی بند ہو گیا۔ میں ڈر اور گھبراہٹ کی وجہ سے فوراً کمرے سے دوڑتا ہوا باہر آیا۔ باہر آ کر میں نے دیکھا کہ تمام درخت اس طرح جھوم رہے تھے کہ جیسے تیز آندھی چل رہی ہو۔ میرا مکان مالک اور اُس کی بیوی گھر کے سامنے کھیت میں کاٹی ہوئی مکئی کی فصل ایک جگہ اکٹھی کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے کھیت میں چھلانگ لگائی اور فوراً سجدے میں گر گیا۔ میں آیۃ الکرسی، تیسرا کلمہ، الحمد شریف اور درود شریف پڑھتا رہا۔ میرا مالکِ مکان اور اُس کی بیوی رام رام کہتے رہے۔ اتنا شدید بھونچال تھا کہ زمین اپنے اوپر کھڑے نباتات کے ساتھ کانپ رہی تھی۔ مجھے پورا یقین ہوا کہ آج قیامت کا دن ہے اور اب عنقریب وہی رونما ہو کے رہ جائے گا جس کی پیشن گوئی قرآن وحدیث میں آئی ہے۔ بپ (زون چھہنی) کے تقریباً تمام لوگوں کے مکانات کی بنیادیں ہل گئیں تھیں اور مٹی گارے سے تعمیر شدہ مکانات کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کشمیر اور پاکستان کے پہاڑی اور شہری علاقوں میں بھونچال سے متاثرین کے جان و مال کے نقصان کی جھلکیاں دکھائی جانے لگیں۔ تمام اسکول، کالج اور دیگر صنعتی و تکنیکی اداروں میں کام کرنے اور تربیت پانے والے طلبہ و طالبات کو فوراً چھٹی کر دی گئی چونکہ وقفے وقفے کے بعد بھونچال کے جھٹکے محسوس کیے جا رہے تھے۔ جموں و کشمیر اور آزاد کشمیر میں بھونچال کے باعث ہزاروں لوگ، جانور اور اُونچی اُونچی عمارتوں کو زمین نے نگل لیا تھا۔ ہزاروں لوگوں کے ارمان اُن کے سینوں ہی میں دفن ہو کے رہ گئے تھے! موت نے زندگی کا نقشہ بگاڑ دیا تھا۔ مجھ پہ اپنی بیوی بچّوں، خاندان اور رشتے داروں کے علاوہ تمام جہان میں بسنے والوں کی جان و مال کی فکر سوار ہو گئی۔ بہر حال بہ فضل اللہ اپنے بیوی، بچّوں، خاندان والوں اور رشتے داروں کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ سب بخیر و عافیت ہیں۔ دل میں اطمینان ہوا مگر اپنے اُن

بھائیوں کی ہلاکت اور اُن کے مال واسباب کے بارے میں انتہائی صدمہ ہورہا تھا جو ہمیشہ کے لیے دُنیا سے آخرت کی طرف کوچ کر گئے تھے۔ دراصل دُنیا میں زلزلے، بیماریاں، طوفان (چاہے وہ آندھی کا ہو یا پانی کا) قحط اور ارضی وسماوی آفات وبلیات انسانوں پہ تب نازل ہوتی ہیں جب دُنیا میں زنا، شراب، چوری، جھوٹ، دھوکہ وفریب، بداخلاقی، فحاشی، گالی گلوچ، ظلم وناانصافی، چاپلوسی اور سب سے بڑی بات یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کھلے عام ہونے لگےاور بدکاری ایک فیشن کے طور پر کی جانے لگےتو اس صورت میں اللہ کی طرف سے قہر وغضب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ ربُ العالمین بڑا بے نیاز ہے۔ وہ پل بھر میں شاہ کو گدا اور گدے کو شاہ بنا دیتا ہے۔ اُونچی اُونچی حویلیوں والے، سرمایہ دار کہ جن کی گردنیں انانیت اور غرور کے نشے میں اکڑی ہوئی رہتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں کنگال کر کے جُھگی جھونپڑی والوں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیا۔ ہزاروں لوگ مر گئے اور بے شمار اپاہج ہو گئے۔ انسان کو ہر وقت خوفِ الٰہی کے ساتھ نیک اعمال کرنے چاہئیں تاکہ خدا کے فیصلے انسانوں کے لیے بہتر ہی اُتریں۔ قومِ عاد، قومِ لوط اور قومِ ثمود کا جو حشر ہوا ہے وہ بھی محض اللہ کی نافرمانی اور اُن کے ظلم وزیادتی کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن قوموں کو اپنے عذاب میں مُبتلا کر کے دُنیا سے نیست ونابود کر دیا۔ زلزلے، آندھی اور پانی کا طوفان، قحط، بیماریاں اور عجیب وغریب قسم کے حالات وواقعات کے رُونما ہونے سے انسانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ یہ دُنیا کا نظام ایک خودکار مشین کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کے پسِ پردہ ایک بہت بڑی ان دیکھی قوّت کارفرما ہے۔ ایک معمولی سا ذرہ بھی خود بخود وجود میں نہیں آتا ہے اور پھر یہ جن وانس، حیوانات ونباتات اور یہ حشرات الارض یا یہ تمام کائنات خود بخود تو وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اس کو پیدا فرمانے والا اور اسے چلانے والا اللہ ہے جو اوّلین وآخرین ہے۔ جب کچھ بھی نہیں تھا تو وہ تب بھی تھا اور جب سب کچھ فنا ہو جائے گا تو وہ پھر بھی باقی رہے گا۔ بقول غالبؔ ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا نہ ہوتا کچھ تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

....

جولائی 2010ء میں لداخ میں بادل پھٹنے کی وجہ سے ہزاروں افراد اور جانور مرے اور کروڑوں رُوپے کا نقصان ہوا تھا۔ قہرِ خدا نے ہزاروں گھروں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ وہاں کے باشندوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک دن وہ مٹی میں بُری طرح مل جائیں گے لیکن قُدرت کی طرف سے کب کس پہ کون سی مار پڑے گی یہ تو اُوپر والا ہی بہتر جانتا ہے۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان میں غالباً 2004ء میں سمندر میں سونامی کی لہریں اُٹھیں اور لاکھوں لوگوں کو پانی نے نگل لیا! یہ تمام سانحات ہم انسانوں کو خالقِ کائنات کے بارے میں غور و تدبر کی دعوت دیتے ہیں اور اپنے اعمال کا جائزہ لینے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ یہ طے شُدہ بات ہے کہ جیسے ہمارے اعمال ہوں گے ویسے ہی آسمان سے فیصلے اُتریں گے۔

....

16 / اکتوبر 2009ء کو مجھے افسانہ کلب ملیر کوٹلہ (پنجاب) کی طرف سے بہترین افسانہ نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اُس زمانے میں جناب محمد بشیر مالیر کوٹلوی، سالک جمیل براڑ اور جناب ڈاکٹر اسلم وغیرہ اس کلب کے ممبر تھے۔ یہ اُردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کرنے والوں کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کے تحت شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ملیر کوٹلہ کا یہ افسانہ کلب کئی برسوں سے اُردو کے اہم ادیبوں اور شاعروں کو انعامات و اعزازات سے نوازتا آ رہا ہے۔ مجھ جیسے معمولی آدمی کو بھی 16، اکتوبر 2009ء کو اس کلب میں مدعو کیا گیا۔ میں چھنی سے اُدھم پور آیا اور اُدھم پور سے ٹرین پہ پٹھان کوٹ چلا گیا اور وہاں سے انبالہ کی ٹرین پہ بیٹھا اور ساری رات سفر میں نیند نہیں آئی تھی۔ انبالہ سے میں ملیر کوٹلہ جانے والی بس

پہ سوار ہوا اور فجر نماز پہ ملیر کوٹلہ کی ایک مسجد میں جا پہنچا تھا۔ جناب محمد بشیر ملیر کوٹلوی (جو اُردو افسانہ نگاری کے میدان میں کافی مشہور و مقبول ہیں) کے ساتھ فون پہ میری ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اُنھوں نے اور سالک جمیل براڑ نے مجھے مدعو کیا تھا۔ چنانچہ مجھے چونکہ جناب محمد بشیر ملیر کوٹلوی کا گھر معلوم نہیں تھا اور نہ ہی میری اُن سے پہلے کبھی بالمشافہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس لیے ملیر کوٹلہ پہنچ کر اُن کو میں نے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وہ مجھے لینے آئے اور اپنے گھر کا پتا بتاتے ہوئے بالآخر ہم دونوں اُن کے گھر کے قریب ہی ملے۔ میں نے اُنھیں پہچان لیا کہ یہی محمد بشیر ملیر کوٹلوی ہیں کیونکہ اُردو کے رسائل میں کئی مرتبہ اُن کے افسانوں کے ساتھ اُن کی تصویر چھپی دیکھ چکا تھا۔ ہم دونوں ایک دُوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ اُنھوں نے مجھے اپنے گھر پہ لایا۔ بڑے ادب واحترام سے پیش آئے۔ وہ ملیر کوٹلہ کے بالکل وسط میں رہتے ہیں۔ پنجاب وقف بورڈ سے اب سبکدوش ہو چکے ہیں۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح دو دن اور دو راتیں اپنے پاس رکھا تھا۔ جس دن میں محمد بشیر ملیر کوٹلوی صاحب کے دولت کدے پر پہنچا تھا اُسی دن اُنھوں نے سالک جمیل براڑ کو میرے بارے میں بتایا کہ میں ملیر کوٹلہ پہنچ چکا ہوں۔ سالک جمیل سے بھی میں ملا تھا۔ ایک خوب صورت نوجوان ہیں۔ خوش اخلاق و خوش مزاج ہیں۔ اُردو میں بچّوں کے لیے کہانیاں لکھتے ہیں۔ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''لمحے'' کے نام سے چھپ کر دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اب تو اُن کا دوسرا مجموعہ ''مٹی کے رنگ'' بھی چھپ کر آ گیا ہے۔ دوسرے دن شام کو میرے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس محفل میں پنجاب کے نامور ادیب، شاعر اور دانشور موجود تھے۔ میں نے اس نشست میں اپنا مختصر افسانہ ''فتنہ'' کے عنوان سے پڑھا تھا۔ سامعین نے اُسے بہت پسند کیا تھا۔ میرے علاوہ جناب محمد بشیر ملیر کوٹلوی اور سالک جمیل براڑ نے بھی کہانیاں پڑھی تھیں۔ تیسرے دن میں تقریباً نو بجے جناب محمد بشیر ملیر کوٹلوی اور سالک جمیل براڑ سے بس اڈے سے رُخصت ہوا تھا۔

سالک جمیل براڑ نے مجھے چند کتابیں عنایت کی تھیں۔ ملیرکوٹلہ کا میرا یہ ادبی سفر بہت اچھا رہا تھا۔ زندگی میں یادیں انسان کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع دیتی ہیں۔ یادوں ہی کے سہارے وہ نئے عزائم لے کر زندگی میں کچھ نیا کرنے کی سوچتا ہے۔

....

15/ جون 2010ء کو مجھے گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بھدرواہ کے شعبۂ اُردو کے اُس وقت کے صدر ڈاکٹر طارق تمکین کشتواڑی اور اُس دور کے کالج کے پرنسپل جناب محمد اقبال زرگر نے مدعو کیا تھا اور ''ایک شخصیت سے ملاقات'' کے تحت میری عزت افزائی کی گئی تھی۔ ''ایک شخصیت سے ملاقات'' کا آغاز مجھ جیسے معمولی آدمی ہی سے کیا گیا تھا اور اس کے بعد ریاست جموں وکشمیر کے اور بھی کئی ادیبوں کی شعبۂ اُردو کے طلبہ وطالبات سے ملاقات کرائی گئی۔ ڈاکٹر طارق تمکین ایک جواں سال شاعر اور اُردو زبان وادب سے بے پناہ محبت کرنے والا شخص ہے۔ خوب صورت زبان بولتا ہے۔ نرم مزاج ہے۔ اُس کے حوصلے بلند ہیں۔ اُردو زبان کے فروغ اور اس کی ترقی وبقا کے لیے ہر ممکن کوشاں ہے۔ میں اُسے اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایم اے کرتا تھا۔ میں اُس زمانے میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ میرا اس خوب صورت، خوش مزاج اور ذہین نوجوان سے بڑا گہرا رشتہ رہا ہے۔ میں اکثر ہوسٹل میں اُس کے پاس ٹھہرتا تھا۔ اُس کی فرمائش پر کبھی اپنی لکھی اور کبھی کسی بلند پایہ شاعر کی غزل اُسے ترنم میں سُنایا کرتا تھا۔ بھدرواہ کو چھوٹا کشمیر کہتے ہیں۔ جون، جولائی میں یہاں کا موسم انتہائی مسرور کُن اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ طارق تمکین کے بار بار اصرار کرنے پر میں مقررہ تاریخ سے ایک دن قبل بھدرواہ اُن کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے 1985ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ سے بی اے فائنل کا امتحان پاس کیا تھا۔ میں نے پورے چار سال بھدرواہ میں گزارے تھے۔ آج میں تقریباً 19 برس کے بعد بھدرواہ جا رہا تھا۔ میں دن کے کم وبیش نو بجے

اُدھم پور بس اسٹینڈ سے بھدرواہ جانے والی بس پہ سوار ہوا تھا۔ کدھ، پٹنی ٹاپ، بٹوت، بگر، عسر، کنڈیری نالا، جتھی، رگی نالا، کھلینی، پُل ڈوڈہ، پرانوں، بھالا اور دُرڈو سے ہوتے ہوئے میں جب بھدرواہ کی سرحد میں داخل ہوا تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میرا ماضی مجھے آواز دے رہا ہے۔ مجھے عہدِ گذشتہ کی یاد دلا رہا ہے۔ جیسے مجھ سے یہ سوال پوچھ رہا ہو کہ آپ نے اپنا بچپن، لڑکپن اور وہ سجن ساتھی کہاں چھوڑ دیئے جن کے ساتھ آپ اکثر زندگی کو رنگین اور پُرسکون بنانے کے منصوبے بناتے تھے! کیلاش پربت میری نظروں کے سامنے تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے مجھے بھدرواہ میں داخل ہونے پہ خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ دریائے نیرُو کا جھلمل کرتا پانی اُچھل اُچھل کے جیسے میری پیاس بجھانا چاہتا ہو۔ چاروں طرف سے ہریالی اور راستے نظر آئے تو دل میں اک ہوک سی اُٹھی۔ گاٹھا، اُدرانا، سرُول باغ، پاسری بس اڈا، چِلّہ، ڈنڈی، سیری بازار، ڈگری کالج کی عمارت، چِنتا، سرتنگل، بھالڑا اور پھر دھان کے ہرے بھرے کھیتوں، ناشپاتی، خوبانی اور سیب کے درختوں کو دیکھتے دیکھتے بالآخر میری نگاہ جامع مسجد بھدرواہ کے میناروں پہ جا کے ٹھہری۔ اسی مسجد میں، میں نے خالقِ کائنات کی حمد وثنا کی خاطر پانچ وقت کی حاضری دی ہے۔ بھدرواہ کی گلیاں اور محلے مجھے یادِ ماضی دلا رہے تھے۔ اُن راستوں اور گلیوں سے میں ایک زمانے میں اکثر گزرا کرتا تھا۔ بھدرواہ کا قلعہ جو سیاسی اور غیر سیاسی قیدیوں کی کئی داستانیں لیے ہوئے ہے۔ مجھے دُور سے نظر آیا کہ جو بھدرواہ شہر کی بالائی سطح پر واقع ہے، جیسے بہانگِ دُھل بڑے فخریہ انداز میں یہ یقین دلا رہا ہو کہ اے دُنیا والو! تُم تو باری باری اس دُنیا سے چلے جاؤ گے لیکن میں باقی رہوں گا نئی داستانیں مرتب کرنے کے لیے۔ میں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں بھدرواہ کے چاروں موسم دیکھے ہیں۔ موسمِ بہار میں اس خوب صورت وادی کی کیا بات ہے۔ چاروں طرف دلکش مناظر دیکھنے والے کا دل موہ لیتے ہیں۔ برسات کا موسم تو بالکل ایک الگ ہی سماں

پیدا کرتا ہے۔ گھنگھور گھٹاؤں کے چھا جانے کے فوراً بعد موسلا دھار بارش شروع ہوجاتی ہے۔ دیوداروں کے گھنے پیڑوں اور دیگر کئی قسم کے درختوں نے اس علاقے کی قدرتی خوب صورتی کو دوبالا کردیا ہے۔ پت جھڑ کا موسم اپنا ایک الگ لُطف دیتا ہے۔ چناروں کے پتّے دھیرے دھیرے مہندی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ آخروٹ کے پیڑوں اور دُوسرے درختوں کے پتّے معمولی سی ہوا چلنے سے گرنے لگتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے چند دنوں کے بعد تمام پیڑ پودے اپنا ہرے رنگ کا لباس نہ چاہتے ہوئے بھی ہوا کو سونپ دیتے ہیں۔ سردی کا موسم نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ پہاڑوں سے خُنک ہواؤں کی آمد شروع ہوجاتی ہے۔ لوگ سردیوں سے پہلے ہی جلانے کے لیے کوئلے اور لکڑی کا انتظام کر لیتے ہیں۔ برف باری ہونے کے بعد پورا علاقہ سفید پوش دکھائی دیتا ہے۔ کانگڑی، کمبل یا پھر فیرن پہن کر لوگ اپنے جسم کو گرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھدرواہ کے ہندو اور مُسلمان کشمیری اور بھدرواہی دونوں زبانیں بولتے ہیں۔ بھدرواہ میں رہتے ہوئے میں نے بھی بھدرواہی سیکھ لی تھی۔ بھدرواہ کا کلچر بہت حد تک ہماچلی اور کشمیری کلچر سے ہم آہنگ ہے۔ جس زمانے میں، میں بھدرواہ میں پڑھتا تھا تب پُل ڈوڈہ سے بھدرواہ جانے والی سڑک انتہائی خستہ حالت میں تھی۔ بالکل تنگ سڑک تھی اور وہ بھی کیچڑ سے بھری ہوئی ہوتی تھی لیکن آج بھدرواہ، ڈوڈہ اور کشتواڑ جانے والی سڑکیں قومی شاہراہیں بنادی گئی ہیں۔ غلام نبی آزاد صاحب نے اپنی سیاسی قیادت اور سرپرستی میں بھدرواہ، ڈوڈہ، کشتواڑ اور بھلیسہ کو خصوصی اہمیت دی اور بھدرواہ میں یونیورسٹی کیمپس قائم کرکے نئی نسل کے لیے اعلیٰ تعلیمی سہولیات پیدا کیں۔ آزاد صاحب نے ریاسی، رام بن، سانبہ اور کشتواڑ کو ضلع کا درجہ دے کر بہت حد تک ایک نئے سیاسی وسماجی منظر نامے کو تشکیل دیا۔ لوگوں کو خاص کر دُور دراز پہاڑی علاقوں میں رہنے والے غریب اور کمزور طبقے کے لوگوں کے لیے راحت کا سامان پیدا کرنے میں اپنا اہم کردار نبھایا۔ کاش! غلام نبی

آزاد صاحب کی سرکار کچھ سال اور قائم رہی ہوتی تو جموں وکشمیر ہندوستان کی تمام ریاستوں میں ہر لحاظ سے خوشحال اور ترقی یافتہ ریاست ہوتی!

میں 14 جون، 2010ء کو تقریباً چار بجے بھدرواہ پہنچا تھا اور جناب ڈاکٹر طارق تمکین کشتواڑی کے پاس دو دن اور دو راتیں ٹھہرا تھا 15، جون 2010ء کو اُنھوں نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور کالج کے پرنسپل جناب محمد اقبال زرگر اور دیگر شعبوں کے اساتذہ کرام سے میری ملاقات کروائی۔ اُس کے بعد شعبۂ اُردو میں لے گئے کہ جہاں میری عزت افزائی کے بعد مجھ سے اپنا تازہ افسانہ سُنانے کی فرمائش کی گئی۔ شعبے کے ایک ہال میں طلبہ وطالبات کی ایک بھاری تعداد موجود تھی۔ میں نے اپنا ایک تازہ افسانہ ''جسم خور کیڑا'' اُس بھری ادبی محفل میں پڑھا تھا جسے تمام سامعین نے بہت پسند فرمایا تھا اور مجھے دادِ تحسین ملی تھی۔ ''جسم خور کیڑا'' میرا وہ افسانہ ہے جس میں، میں نے 'وقت' کو موضوع بنا کر انسان کی بے بسی کو کہانی بند کیا ہے۔ میری اُمید سے کہیں زیادہ یہ افسانہ متاثر کن ثابت ہوا تھا۔ مجھے نہایت خوشی ہوئی تھی کہ میں کہانی کے ذریعے سامعین کو ایک پیغام دینے یا احساس دلانے میں کامیاب ہوا۔ اُردو مختصر افسانے پر میں نے لیکچر بھی دیا تھا اور آخر پر طلبہ وطالبات نے مجھ سے فکشن سے متعلق کئی اہم سوالات پوچھے تھے جن کے جوابات میں نے کسی حد تک تسلّی بخش دیئے تھے۔ نازیہ حسن نے جو عارضی طور پر اس شعبے میں ایم اے کی کلاس کو پڑھاتی تھی، نظامت کے فرائض انجام دیئے تھے۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد میں ڈاکٹر طارق تمکین کشتواڑی کے ڈیرے پر آیا تھا اور شام کو تقریباً سات بجے بھدرواہ شہر میں گھومنے کے لیے نکل گیا تھا۔ مسجد محلّہ میں آکر اُس مکان کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھا کہ جہاں میں اپنی بہن شمیم اختر اور بہنوئی پروفیسر محمد اسداللہ وانی کے ہمراہ رہتا تھا اور جہاں میں نے اپنی طالب علمی کے چار سال گزارے تھے۔ کرایے کا وہ مکان بالکل ویسا ہی تھا جیسا اُس زمانے میں تھا

لیکن اُس میں رہنے والے بدلتے رہے ہوں گے۔ بھولی بسری یادوں نے میرے ذہن پہ دستک دی تو بیک وقت بہت کچھ یاد آیا۔ وقت اور حالات انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں! ہم سب وقت کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لاکھ چاہنے کے باوجود ہم وقت کے ہاتھوں میں مجبور ہوتے ہیں۔ اس لیے کچھ بھی نہیں کرپاتے ہیں۔ رات کو میں ڈاکٹر طارق تمکین کشتواڑی کے پاس ٹھہرا تو ہماری مختلف موضوعات پہ گفتگو ہوئی تھی۔ وہ ردِ تشکیل پہ زیادہ زور دیتے رہے۔ سماجی اور ادبی روایتوں کے حوالے سے بہت سی باتیں ہم نے زیرِ بحث لائیں تھیں۔ دُوسرے دن میں تقریباً سات بجے کے قریب بس اسٹینڈ سیری بازار آیا اور جموں جانے والی بس پر سوار ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بس آہستہ آہستہ جموں کے لیے چل پڑی تھی اور پھر اُس کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ میری نظروں سے بھدرواہ کی حسین وادی چند لمحوں کے بعد اوجھل ہوگئی تھی۔ تب مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ خوب صورت یادوں کے جو دریچے کئی برسوں کے بعد کُھلے تھے آج اچانک بند ہوگئے!

....

19، جون 2010ء کو میرے اعزاز میں راجوری میں چند ادب نواز دوستوں نے ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا تھا جس میں عمر فرحت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مجھ جیسے معمولی آدمی کی تحریریں جب عمر فرحت نے مختلف معیاری رسائل میں پڑھیں تو وہ غائبانہ طور پر میرا گرویدہ ہوگیا۔ بہرحال مجھ سے موبائل فون پہ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عمر فرحت کے بار بار اصرار کرنے پر 18، جون 2010ء کو میں جموں بس اسٹینڈ پر سے ایک ٹیمپو پر سوار ہوا تھا اور تقریباً دن کے تین بجے راجوری شہر میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے پہلے کبھی بھی عمر فرحت کو نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی محبت مجھے راجوری کھینچ لائی تھی۔ جموں سے راجوری پہنچنے تک میرے اُس عزیز نے مجھ سے برابر فون پہ رابطہ رکھا تھا اور بڑی فکرمندی اور مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے راجوری بس

اسٹینڈ پہ لینے آیا تھا۔ اپنے گھر پر رکھا تھا۔ شام کو جناب صابر مرزا (مرحوم) کے گھر پر
اُن سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ وہ اپنی دُکان پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دُعا وسلام کے
بعد شعر وادب کی باتیں ہوئی تھیں۔ دُوسرے دن تقریباً ساڑھے دس بجے مجھے عمر
فرحت نے اپنے ساتھ محترم نثار راہی صاحب کے ہائر اسکینڈری اسکول پہنچایا تھا۔
میری ملاقات نثار راہی صاحب اور اُن کے اسکول کے دیگر ممبران سے بھی ہوئی تھی۔
ایک ہال میں چند لوگوں میں میری عزت افزائی کی تھی۔ محترمہ زنفر کھوکھر، صابر مرزا
صاحب (مرحوم) جناب نثار راہی صاحب، مولانا لعل دین صاحب اور جناب علمدار
اس ادبی پروگرام میں شامل تھے۔ میں نے اس ادبی نشست میں اپنا تحریر کردہ افسانہ
''باغی'' کے نام سے پڑھا تھا۔ تمام سامعین نے اسے پسند فرمایا تھا۔ اس ادبی نشست
کے اختتام کے بعد میں اور عمر فرحت دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد شاہدرہ شریف چلے
گئے تھے۔ ایک طویل مدت سے میرے دل میں یہ تمنا مچل رہی تھی کہ میں بابا غلام شاہ
بادشاہ صاحب کی زیارت گاہ پہ جاؤں۔ بہ فضل اللہ راجوری کا میرا یہ دورہ نہایت مفید
ثابت ہوا تھا۔ میں اور عمر فرحت راجوری شہر سے بس پہ تقریباً 32 کیلومیٹر کا سفر طے
کرنے کے بعد شاہدرہ شریف زیارت گاہ پہ پہنچے تھے۔ انتہائی خوب صورت مقام پہ
یہ زیارت بنی ہوئی ہے۔ وہاں کی جامع مسجد دیکھ کر میرا دل شاد ہوا تھا۔ اللہ تعالٰی کے
ولیوں نے جب دین کی محنت اور اس کی تبلیغ کو اپنا نصب العین بنایا تو اللہ تعالٰی کی براہِ
راست مدد اُن کے شامل رہی۔ حکومتِ جموں وکشمیر نے اس زیارت گاہ کو اپنی تحویل
میں لے رکھا ہے۔ زائرین کے ٹھہرنے اور دیگر عقیدت مندوں کے لیے مسافر خانے
بنائے گئے ہیں۔ میں نے وہاں کی تقریباً ہر چیز دیکھی تھی اور نمازِ عصر پڑھنے کے بعد
وہاں کا کھانا کھایا تھا۔ اُس کے بعد ہم راجوری چلے آئے تھے۔ دوسرے دن میں
جموں آ گیا تھا۔ راجوری کسی زمانے میں راجوں کی جاگیر تھی اور مغل بادشاہوں نے
زیادہ تر کشمیر جانے کے لیے راجوری اور پونچھ کے علاقوں کو خصوصی اہمیت دی تھی۔

اُس زمانے میں نہ تو ہوائی جہاز تھے اور نہ ہی ریل گاڑیاں اور بسیں چلتی تھیں۔ اس لیے کئی کئی ہفتوں اور مہینوں کے بعد پیدل یا گھوڑوں پر بادشاہ اور اُن کے سپہ سالار سفر کرتے تھے۔ بہر حال راجوری کا میرا یہ سفر بھی میری زندگی کا ایک نیا تجربہ اور مشاہدہ ثابت ہوا تھا۔ دراصل میں ہر مقام، ہر چیز اور ہر آدمی کو کافی قریب سے دیکھتا ہوں اُس کے داخلی پہلوؤں پہ زیادہ دھیان دیتا ہوں اور انسانی نفسیات کی گتھیوں کو سمجھنے کی بھر پور کوشش کرتا ہوں۔ میرا یہ ماننا ہے کہ انسان ہر قدم پہ ایک نئے تجربے اور مشاہدے سے گزرتا ہے اور کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسان جہاں اچھے ماحول اور معاشرے سے بہت کچھ سیکھتا ہے تو وہیں وہ بُرائی اور بُرے لوگوں سے بہت سی عبرت آمیز باتیں سیکھتا ہے۔

....

میرا ایک سپنا جو تمنا کا رُوپ اختیار کر کے رہ گیا تھا اُسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے بالآخر 13، اکتوبر 2010ء کو پورا کیا اور وہ تمنا یہ تھی کہ ہمارے پاس اپنی ایک چھوٹی گاڑی ہو۔ زندگی میں بہت پیدل چلا ہوں۔ لوگوں کی رنگ برنگی چھوٹی بڑی گاڑیاں سڑک پہ ہوا سے باتیں کرتی ہوئی دیکھتا تو خوش ہو جاتا اور دل و دماغ کے کسی گوشے سے یہ حسرت جاگ اُٹھتی کہ کاش! میرے پاس بھی گاڑی ہوتی! میرے اللہ نے آخر کار میری، میرے بچّوں اور میری اہلیہ کی یہ تمنا بھی پوری کر دی۔ 13، اکتوبر 2010ء کو اُدھم پور کے ہُنڈائی شوروم سے ہم نے آئی ٹین (I10) نام کی گاڑی خریدی جو چار لاکھ ساٹھ ہزار روپے میں پڑی۔ انتہائی آرام دہ گاڑی ہے۔ زندگی کے غیر یقینی سفر میں انسان، خواہشوں اور اُمنگوں کو لے کر جیتا ہے۔ میرے بیٹے رضا الرّحمٰن نے چند دنوں میں گاڑی چلانا سیکھ لیا۔ گاڑی خریدنے سے قبل ہم دونوں باپ بیٹے نے اُدھم پور ہی میں جے کے نام کے ایک ڈرائیونگ انسٹی ٹیوٹ میں تقریباً بیس دن چھوٹی گاڑی چلانے کا کورس مکمل کیا تھا۔ ڈرائیونگ کے سلسلے میں میرا یہ کہنا ہے کہ گاڑی میں

بیٹھنا یا گاڑی چلانا جان کو ہتھیلی پہ رکھنے کے مترادف ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مانا کہ آپ بڑے احتیاط کے ساتھ گاڑی چلا رہے ہیں لیکن یہ کوئی طے شُدہ بات نہیں ہے کہ آگے سے آنے والا بھی آپ ہی کی طرح بڑی سنجیدگی اور ڈرائیونگ کے اُصولوں کی پابندی کرتے ہوئے آرہا ہو۔ گاڑی عموماً حادثے کا شکار تب ہوتی ہے جب ڈرائیور لاپرواہی برتتا ہے۔ موڑ پہ گاڑی آہستہ کرنا، ہارن بجانا، موڑ پہ کسی گاڑی سے پاس نہ لینا، رات کو ڈِپّر کا استعمال کرنا، ٹرن لیتے وقت سگنل دینا، بازار یا چوراہوں میں سے گاڑی آہستہ سے گزارنا۔ یہ تمام باتیں ڈرائیونگ کے سلسلے میں نہایت ضروری ہیں۔ گاڑی چلاتے وقت معمولی سی چُوک بھی ایک بہت بڑے خطرے یا حادثے کا باعث بن سکتی ہے۔ ہر روز ہزاروں آدمی گاڑیوں کے حادثوں میں اپنی جان گنوا دیتے ہیں۔ تقریباً نوے فی صدی حادثے ڈرائیوروں کی لاپرواہی سے ہوتے ہیں۔ خداوندِ قدوس کو یاد رکھتے ہوئے نہایت احتیاط کے ساتھ گاڑی چلانی چاہیے اور اس کے بعد اگر کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو وہ آپ کا مقدر رہے۔

جب میں نے ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے جے کے انسٹی ٹیوٹ ادھم پور میں داخلہ لیا تھا تو پہلی مرتبہ مجھے مارُوتی کے اوپر بٹھا کے اسٹیئرنگ دیا گیا۔ مجھے ڈرائیونگ سکھانے والا شخص بہت اُجڈ اور غیر مہذب آدمی تھا۔ اُس کی بات چیت اور حرکات وسکنات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ضرور اُس نے خچروں اور گھوڑوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارا ہوگا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے اسٹیئرنگ ہاتھوں میں لے کر گھمانا شروع کیا تو میرا رُخ کافی حد تک صحیح تھا تمام کنٹرول ڈرائیور نے اپنے پاس رکھا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ میں اسٹیئرنگ گھمانے کی تربیت پاتا رہا۔ اُس کے بعد اُس ڈرائیور نے مجھے کلچ اور گئیر بدلنا سکھانا شروع کیا۔ میں نے اُس سے پوچھا تھا

"مجھے یہ بتائیے کہ کلچ، بریک، ایکسیلیٹر اور گئیر کا کیا کام ہوتا ہے؟ گاڑی کھینچنے والے ان چاروں انگوں کے بارے میں مجھے واقف کرائیے"

اُس نے کہا تھا

''دیکھو ماسٹر! جو حصہ گاڑی کا تُم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا ہے اِسے اسٹیئرنگ کہتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اسے تُم جس طرف گھماؤ گے پوری گاڑی اُدھر ہی گھوم جائے گی اور یہ جب لوگوں کو صحیح طریقے پر گھمانا نہیں آتا تو گاڑی یا تو سڑک سے ہمیشہ کے لیے اُتر جاتی ہے یا اگر کہیں بازار یا چوراہے میں احتیاط نہ برتی گئی تو اپنی گاڑی کسی کی گاڑی سے ٹکرا جائے گی اور دیکھئے یہ جو آپ کے پیروں کے نیچے سسٹم ہے اسے کنٹرول کہتے ہیں جب آپ گاڑی روکنا چاہیں تو بریک دبا دیجیے مگر دبانے سے پہلے کلچ ضرور دبائیے ورنہ گاڑی ٹھل ٹھل کرتی بند ہو جائے گی اور آپ پریشان ہو جائیں گے۔ کلچ کا کام گیئر بدلنے کا ہے۔ جب بھی آپ گیئر بدلنا چاہیں تو کلچ کو آہستہ سے دبا دیجیے گاڑی نیوٹل ہو جائے گی۔ ہاں یاد رکھیے جب بھی ہم گاڑی چلانا شروع کریں تو پہلا گیئر لگائیے کیونکہ گاڑی شروع میں پہلا گیئر مانگتی ہے اور جونہی گاڑی چل پڑے تو آہستہ سے کلچ دبا کر دُوسرا گیئر لگائیے۔ کلچ اور بریک پر برابر پاؤں رکھیں۔ جب سڑک بالکل ہموار ہو تو چوتھا اور پانچواں گیئر بھی لگا سکتے ہیں لیکن موڑ پہ یا تو گیئر بدلیں یا پھر بریک پہ پاؤں دبا دیں، جب کوئی گاڑی اچانک آگے سے آ جائے تو فوراً کلچ دبا کر بریک لگائیں اور پہلا گیئر لگا دیں۔ ہرگز گاڑی غلط سمت پہ نہ چلائیں۔ جب اُترائی والی سڑک آ جائے تو پیٹرول بچانے کے لیے گاڑی کو نیوٹل کر دیں اور جونہی ہموار سڑک پہ چلنے لگیں تو فوراً تیسرا یا چوتھا گیئر لگائیں۔ اگر آپ کی گاڑی کے آگے کوئی بھی بڑی یا چھوٹی گاڑی چل رہی ہو تو اپنی گاڑی

تقریباً دس فُٹ کا فاصلہ رکھ کر اُس سے دُور رکھیں تا کہ پیچھے سے کوئی
دوسرا گاڑی والا بیچ میں گھس کر آپ کی گاڑی کو نقصان نہ پہنچائے۔
سڑک کے کناروں پر اگر لوگ چل رہے ہوں یا چوراہے اور بازاروں
میں سے آپ گاڑی چلا رہے ہوں تو یاد رکھیے پہلے اور دوسرے گیئر
میں گاڑی چلائیں۔ ایکسیلیٹر کا کام یہ ہے کہ جب ہم گاڑی اسٹارٹ
کریں تو پہلا گیئر لگانے کے بعد کلچ دبائیں پھر بالکل آہستہ آہستہ کلچ
چھوڑیں اور ایکسیلیٹر کو معمولی سا دبانا شروع کر دیں۔ گاڑی آگے
چلنے لگے گی۔ اس کے بعد فوراً کلچ دبا کر دوسرا گیئر لگائیں اور جب
بالکل رش نہ ہو تو ایکسیلیٹر کو معمولی سا زیادہ دبائیں پھر تیسرا اور چوتھا
گیئر لگالیں۔ ایکسیلیٹر کا اصل کام گاڑی کی رفتار کو تیز کرنا ہے۔
ایکسیلیٹر پر سے پاؤں ہٹا دیجیے تو گاڑی کی رفتار مدھم پڑ جائے گی"

میں بڑے دھیان سے اُس ڈرائیور کی باتیں سُنتا رہا اور پھر جب عملی طور پر اُس کی باتوں کے مطابق گاڑی چلانے لگا تو بار بار بھولنے لگا۔ مجھے یاد نہیں رہتا تھا کہ کلچ کہاں ہے اور بریک اور ایکسیلیٹر کہاں ہے۔ بہر حال کچھ ہی دن کے بعد میں اس تمام ڈرائیونگ سسٹم کو سمجھنے کے بعد اُس کا صحیح ستعمال کرنا سیکھ گیا تھا۔ قومی شاہراہ پہ چونکہ گاڑیوں کی آمدورفت بہت زیادہ رہتی ہے اور بہت سی گاڑیاں چلانے والے اتنی تیز رفتاری سے گاڑیاں چلاتے ہیں کہ جیسے زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرنا چاہتے ہوں۔ میں اُنھیں دیکھ کے ڈر جاتا تھا۔ اللہ کے فضل سے تقریباً بیس دن کے اندر میں گاڑی چلانا سیکھ گیا تھا لیکن اپنی گاڑی نہ ہونے کی وجہ سے دھیرے دھیرے سب کچھ بھول گیا اور چار ماہ کے بعد میں نے اپنی گاڑی آئی ٹین (I10) خریدی تو اُس وقت تک میں تقریباً ڈرائیونگ کی بہت سی بنیادی باتیں بھول چکا تھا۔ میں نے ماڑوتی گاڑی چلانا سیکھی تھی لیکن میری گاڑی پاور بریک ہے۔ اسے معمولی سی بریک لگائیے تو

فوراً رُک جاتی ہے یا معمولی سا بھی ایکسیلیٹر دبایئے تو شیر کی طرح تیز دوڑنے لگتی ہے۔ اسی طرح معمولی سا بھی اسٹیئرنگ گھمایئے تو بہت جلد گھوم جاتی ہے۔غرضیکہ اس کا تمام سسٹم پاور سے جڑا ہوا ہے۔اس قسم کی گاڑی چلانا میرے لیے اور زیادہ مشکل تھا۔گاڑی خریدنے کے بعد اس چیز کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس بہترین گاڑی کو حفاظت سے چلایا جائے، چنانچہ ہمیں اسے باضابطہ سیکھنے کے لیے ڈرائیور کی ضرورت محسوس ہوئی۔اسٹیئرنگ تو ہم دونوں باپ بیٹے کا پہلے ہی سے دُرست تھا۔البتہ ڈر و خوف کی وجہ سے گاڑی کو چلانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔میرے دوست جناب سُریندر اروڑا (اُدھم پور والے) نے ہمیں جاوید نام کا ایک ڈرائیور رکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ مجھے اور میرے بیٹے کو ہر روز صبح تقریباً سات بجے اپنے ڈیرے آدرش کالونی (ادھم پور) سے ریلوے اسٹیشن اور بائی پاس جیسی کُشادہ سڑک پہ اس پاور بریک گاڑی کو سکھانے کے لیے لے جاتا۔شروع شروع میں یہ نئی گاڑی ہمارے قابو میں نہیں رہنے لگی۔اس پہ ہمارا پورا کنٹرول نہیں رہتا تھا۔کبھی زیادہ بریک دبا کر فوراً گڑگڑ کرتی بند ہو جاتی اور کبھی گیئر بدلنے میں دِقّت آجاتی تھی مگر بہ فضلِ اللہ میرے بیٹے کا اندازہ اور توازن گاڑی پہ تقریباً ایک ہفتے کے اندر صحیح طور پر بحال ہوا۔ایک دن وہ جاوید ڈرائیور کو اپنے ساتھ بٹھا کر خود ڈرائیو کرتا ہوا چنہنی لے گیا اور پھر اُس کا حوصلہ بڑھا۔ڈر و خوف جاتا رہا اور پھر ایک دن اُس نے خود گاڑی چلاتے ہوئے اپنے گھر کے افراد کو لاٹی دھونہ ایک شادی کی تقریب میں لے گیا اور وہاں سے واپس اُدھم پور لایا۔اُس روز مجھے اور میری اہلیہ کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ بعد میں اُس نے اُدھم پور سے جموں اپنے مکان میں گاڑی پہنچائی۔میرا خیال ہے کہ بچے ہر چیز بڑوں کے مقابلے میں جلدی سیکھ لیتے ہیں۔

مجھے بھی جاوید ڈرائیور نے ہی گاڑی چلانا سکھائی تھی۔ کچھ دن تو وہ مجھے اُدھم پور بائی پاس کی کُشادہ سڑک پہ گاڑی چلانے کی تربیت دیتا رہا اور پھر جب مجھے گاڑی چلانے کا اعتماد حاصل ہوا، اُس کے کنٹرول سے اچھی طرح واقف ہوا تو میں نے

جاوید ڈرائیور کو اپنے ڈیرے آدرش کالونی اُدھم پور سے آگے ٹکری تک خود گاڑی چلانے کو کہا۔ وہ میری سامنے والی سیٹ پہ بیٹھا رہا اور مجھے ہدایات دیتا رہا۔ میں نے ہمت کر کے آہستہ آہستہ بھاری بھیڑ میں گاڑی چلائی اور ریمبل تک لے گیا۔ اسی طرح ایک دن نرسُوح تک لے گیا۔ جب میں جموں فردوس آباد نچواں میں آبسا تو میں بہت حد تک ڈرائیونگ بھول چکا تھا۔ میں نے یہاں ایک بار پھر گاڑی چلانے کے لئے داخلہ لیا۔ ایک سکھ کا ڈرائیونگ ادارہ ہے جہاں میں نے بیس دن گاڑی چلانے کی تربیت حاصل کی۔ پھر جب میں نے اپنی آلٹو800 خریدی تو کل پانچ دن میرے دوست اور پڑوسی جناب ماسٹر فرمان جی میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر مجھے ضروری ہدایات دیتے رہے اور پانچویں دن انھوں نے مجھے اکیلے گاڑی چلانے کی اجازت دے دی۔ الحمدللہ اب نہ صرف پورے جموں شہر میں گاڑی چلا لیتا ہوں۔ بلکہ ہر جگہ گاڑی چلانے میں کامیاب ہوا ہوں۔ اللہ کرے میں بہ صحت وسلامت اپنی گاڑی چلاتا رہوں! دُنیا کا کوئی بھی کام مُشکل نہیں ہے صرف مستحکم ارادہ اور ذوق وشوق ہونا چاہیے۔ اس موقعے پہ کسی شاعر کے اس شعر میں صداقت نظر آرہی ہے کہ

ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا
وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا

میرا یہ خیال ہے کہ گاڑی خریدنا کسی حد تک آج کے دور میں آسان ہے لیکن گاڑی کی حفاظت کرنا اور سڑک پہ چلتی ہوئی دُوسری گاڑیوں سے اپنی گاڑی بچانا انتہائی کٹھن ہے کیونکہ ایک تو ہر شخص نے گاڑی چلانے کا شوق پال رکھا ہے اور سڑکوں پہ اتنی زیادہ چھوٹی بڑی گاڑیاں نظر آتی ہیں کہ ایک عام آدمی گھبرا جاتا ہے۔ دُوسری بات یہ کہ ہر گاڑی چلانے والا اپنی منزل مقصود پہ پہلے پہنچنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے وہ ڈرائیونگ کے اُصولوں کی پابندی نہ کرتے ہوئے جلد بازی اور بوکھلاہٹ میں نہ صرف خود کو بلکہ دُوسروں کو بھی رُوندتا ہوا ابدی نیند سُلا دیتا ہے! بعض لوگ نشے کی

حالت میں گاڑی چلاتے ہیں۔ اکثر موڑ پہ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ دونوں جانب کے ڈرائیور نہ تو ہارن بجاتے ہیں اور نہ ہی گاڑی کی رفتار کم کرتے ہیں۔ آئے دن سینکڑوں افراد ڈرائیوروں کی بے اُصولی کی وجہ سے لُقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ اس لیے گاڑی چلانے والوں کو چاہیے کہ وہ نہایت احتیاط اور تحمل مزاجی سے گاڑی چلائیں تاکہ زندگی سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔

....

9/ اکتوبر 2009ء کو جب میرا چچیرا بھائی مشکور احمد وانی اللہ کو پیارا ہو گیا تو اُس کی اچانک موت کی خبر سُن کر میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ اُس سے وابستہ بچپن کی کئی یادیں میرے ذہن کے کینوس پہ یکے بعد دیگرے اُبھرتی چلی گئیں۔ دل میں خونی رشتے کی اک ہُوک سی اُٹھی اور آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ مشکور احمد وانی میرا بچپن کا ساتھی تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ جنگل میں بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے اور اکثر آپس میں کُشتی لڑتے تھے۔ وہ نہایت شریف، نیک سیرت اور مخلص تھا۔ تقریباً پندرہ سال تک اُس نے اپنے گاؤں بہوتہ کی جامع مسجد میں امامت کی تھی۔ جامع مسجد بہوتہ کی تعمیر کے سلسلے میں اُس نے لوگوں سے تقریباً دولاکھ روپیہ چندہ اکٹھا کیا تھا۔ خدا نے اُسے دین کی خدمت کا خاصا جذبہ ودیعت فرمایا تھا۔ خوب صورت شکل اور سُریلی آواز تھی اُس کی۔ نعت خوانی کرتے وقت اُس کی سُریلی آواز سُننے والوں کو بہت متاثر کرتی تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنا، صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ہر کسی کو نیک راستے پر چلنے کی دعوت دینا اُس کی زندگی کا نصب العین تھا۔ میں مشکور کی نمازِ جنازہ میں شامل نہیں ہو سکا تھا جس کا مجھے افسوس ہے! 12، اکتوبر 2009ء کو جب میں تعزیت کے لیے اپنے آبائی وطن مرمت گیا تو تقریباً تیرہ برس کے بعد مرمت آیا تھا۔ کھلینی سے میں منی بس میں سوار ہوا تھا۔ دل میں مشکور احمد وانی کے گزرنے کا غم ہچکولے کھا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے منی بس کلہوتہ پہنچی پھر حمبل اور اُس کے بعد بھرگراں سے

ہوتے ہوئے گوہا پہنچی تو میری آنکھوں میں بچپن اور لڑکپن کی یادیں گھومنے لگیں۔ پل پل اپنا بیتا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ میرے دور کا گوہا اور آج کے دور کے گوہا میں زمین و آسمان کا فرق پایا۔ تب گوہا میں برہمنوں، ٹھکروں اور سُناروں کی چند دُکانوں کے علاوہ بس ایک ہائی اسکول ہوا کرتا تھا اور تقریباً سبھی مکان پتھر اور مٹّی سے بنے ہوئے تھے جب کہ آج گوہا میں بس اڈّہ ہے، ہائر اسکینڈری اسکول ہے اور لوگوں نے تقریباً چار چار منزلہ پختہ مکان تعمیر کیے ہیں۔ پورے علاقہ مرمت میں مختلف مقامات پہ موبائل فون کے ٹاور لگے دیکھے۔ گویا مواصلاتی انتظام کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ آج وہاں کا ہر شخص بآسانی ایک دُوسرے سے موبائل فون پہ بات کرتا ہے جب کہ میرے دور کی مرمت تمام سہولیات سے محروم تھی۔ ایک آدمی جب دوسرے آدمی کو دُور سے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتا تھا تو گلا پھاڑ پھاڑ کر اُسے آواز دیتا تھا۔ آج ایسا نہیں ہے۔ آج بس اللہ کا کرم ہے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں موبائل سیٹ ہے۔ بھرگراں سے مُوٹھی، پربل، لبڑ، بٹنگل، منگوتہ اور بہوتہ جیسے تمام پہاڑی علاقوں کو سڑک رابطے میں لانے کے لیے پردھان منتری گرام سڑک یوجنا (پی ایم جی ایس وائی) کے تحت ایک کشادہ سڑک میرے گاؤں بہوتہ تک پہنچ چکی ہے۔ اس سڑک کا کام برابر چل رہا ہے۔ گوہا میں منی بس سے اُترنے کے بعد میں پیدل اپنی جائے پیدائش سروال کی طرف چل پڑا۔ گوہا سے تھوڑا آگے ایک نالے پہ پہنچا کہ جہاں ایک زمانے میں چنار کا بہت بڑا پیڑ ہوا کرتا تھا اور ساتھ میں ٹھنڈے میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا۔ راہ گیر جن میں زیادہ تر طالب علم، مزدور اور کسان ہوتے اُس چنار کے پیڑ کے نیچے پانی پینے کے بعد سُستانے بیٹھ جاتے تھے۔ میں خود اُس چنار کے نیچے اکثر بیٹھا کرتا تھا۔ یہاں پہنچ کے مجھے چنار کا پیڑ تو کہاں اُس کے آثار تک نظر نہیں آرہے تھے۔ البتہ چشمہ اُسی طرح اب بھی بہہ رہا تھا۔ میرے لڑکپن نے میری یادوں کے سمندِ تخیل پر تازیانہ لگانا شروع کردیا۔ میری نگاہیں طالب علمی کے زمانے کا وہی چنار کا پیڑ ڈھونڈ رہی تھیں جس سے

میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں لیکن وقت اور حالات کے تیز جھونکوں نے اُس چنار کے پیڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ پانی پینے کے بعد میں چند لمحوں تک وہاں کھڑا رہا، چاروں جانب نظریں دوڑائیں اک ہُو کا عالم تھا۔ بس صرف میں تھا اور میری یادوں کے ٹمٹماتے چراغ تھے۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے یادوں کی دُنیا سے باہر نکالنا چاہا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھانے شروع کیے تو فوراً مجھے شکیل بدایونی کے گیت کے یہ بول یاد آ گئے تھے کہ ؎

آج پُرانی راہوں سے کوئی مجھے آواز نہ دے
درد میں ڈوبے گیت نہ دے غم کا سسکتا ساز نہ دے

چلتے چلتے میں بلدری نالے پہ پہنچا۔ ہریجنوں کے مکان دیکھے جو کسی زمانے میں یہاں جھگی جھونپڑیوں کی مانند تھے۔ اب اُنھوں نے بھی پکّے مکان بنا لیے ہیں۔ بلدری سے گزرنے کے بعد جب درنگا پہنچا تو سورج غروب ہونے جا رہا تھا۔ درنگا، مرمت کی ایک مشہور و معروف جگہ ہے یہاں دو ندیوں کا سنگم ہوتا ہے۔ ایک ندی منگوتہ گاؤں کی طرف سے بہتی ہے اور دُوسری بہوتہ، روٹ کے درمیان بہتی ہے۔ جب میں گوہا پڑھنے جاتا تھا تو بہوتہ اور روٹ کے لڑکے اکثر درنگا میں گرمیوں کے موسم میں نہایا کرتے تھے۔ عہدِ ماضی کا ایک ایک ورق میرے ذہن و دل کے دریچوں پہ نمودار ہو رہا تھا۔ درنگا سے اُوپر سیدھی چڑھائی چڑھنے کے بعد میں گواڑی نام کی جگہ پہ پہنچا کہ جہاں کسی زمانے میں میری سب سے بڑی خالہ رہتی تھی۔ خالہ کو دُنیا سے گزرے ایک طویل زمانہ ہو چکا ہے۔ البتہ میرا خالہ زاد بھائی اب بھی اُسی جگہ رہائش پذیر ہے۔ یہاں پہنچ کے مجھے بچپن کے دن بار بار یاد آ رہے تھے۔ دادا عمر دین یہیں رہتے تھے۔ مھارُو کے پیڑوں پہ جب چمگادڑ نما گلہریاں شام ہوتے ہی اُڑ اُڑ کے بیٹھنے لگتیں تو اُنھیں دیکھ کے بڑا لطف آتا تھا۔ میں کچھ اور چڑھائی چڑھنے کے بعد دھان کے کھیتوں میں سے گزرنے کے بعد اپنی جائے پیدائش سروال پہنچا۔ بچپن،

لڑکپن اور جوانی کے دن یاد آئے۔ اپنے خاندان کے بُزرگ مثلاً دادا ثنا اللہ، دادی، اپنی سگی دادی، چچا محمد خوشحال، چچا محمد سُلطان، چچا غلام نبی، چچا غلام محمد، چچا عبدالکریم، چچا عبدالغنی اور چچا محمد اکرم یکے بعد دیگرے یاد آنے لگے۔ میرے خاندان کے یہ تمام افراد آج دُنیا میں نہیں ہیں! اُوپر سروال میں چچا غلام محی الدّین اُن کا بڑا بیٹا محمد لطیف اور جاوید احمد بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اب علی دادا بھی ایک سو دو سال کے بعد اس جہانِ فانی سے گزر چکے ہیں۔ مغرب نماز پڑھنے کے بعد میں بطورِ تعزیت مشکور احمد کی والدہ چاچی صفوراں، اُس کی اہلیہ اور بچّوں کے پاس گیا۔ وہاں پہ رشتے دار اور خاندان کے تقریباً سبھی افراد موجود تھے۔ آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ میں نے لواحقین کو صبر کی تلقین کی اور مرحوم کے لیے دُعائے مغفرت کی۔ میرے خالہ زاد بھائی جناب غلام حسن، جماعت علی، محمد سعید، عطا اُللہ، شبیر احمد، مختار احمد، محمد حسین کے علاوہ چچا حبیب اللہ، چچا محمد اقبال، چچا محمد انور اور میرے بہنوئی نذیر احمد سرپنچ صاحب بھی اس ماتمی مجلس میں شامل تھے۔ چاچی حلیمہ کے ہاں رات کو ٹھہرا تھا۔ میرا ذہن دیر تک میری گذشتہ کتابِ زندگی کے اوراق پلٹتا رہا۔ یادوں کے سبھی دریچے کھل چکے تھے۔ دوسرے دن میں نے مشکور احمد کے مزار پر فاتحہ خوانی کی تھی اور اُس کے بعد چچا محمد اقبال صاحب کی فرمائش پر اپنے خالہ زاد بھائی عطا اللہ وانی کے ہمراہ گورنمنٹ ہائی اسکول بہوتہ (خاص چاہوت) کے بچّوں کو نیک ہدایات دینے گیا تھا۔

....

5/دسمبر 2010ء کو میری اہلیہ کی چھوٹی بہن نازیہ مہتاب کی شادی کشمیر کے ضلع بارہمولہ، تحصیل رُوحامہ میں سکونت پذیر عبدالحق تانترے سے ہوئی اور 6 دسمبر 2010ء کو جب برات واپس گئی تو میں، میری اہلیہ اور بچّے نازیہ کے ساتھ کشمیر گئے۔ ہمارے علاوہ میری اہلیہ کے چار خالہ زاد بھائی محمد سلیم کنٹھ نائب تحصیلدار، محمد ارشد، محمد طارق اور اہلیہ کی چھوٹی بہن سعیدہ اختر اور اُس کی بیٹی مصباح بھی ہمارے ہمراہ تھی۔

ہم تقریباً گیارہ بجے چھنی سے کشمیر کے لیے روانہ ہوئے تھے۔عطااللہ نے بڑی عمدگی سے ہماری گاڑی آئی ٹین (I10) چلائی تھی۔ میں، میرا بیٹا رضا اُلرّحمٰن، میری بیٹی صبا کریم اور میرا ہم زُلف محمد طارق اپنی گاڑی میں تھے جب کہ اہلیہ اپنی بہن نازیہ مہتاب کے ہمراہ تھی۔ارشد، سلیم، سعیدہ اور مصباح اپنی گاڑی میں تھے۔کدھ، پتنی ٹاپ، بٹوت، رام بن اور رام بن سے آگے ڈراونے پہاڑوں سے گزرنے کے بعد ہم تقریباً دن کے دو بجے بانہال پہنچے تھے۔بانہال کی جامع مسجد میں، میں نے اور میرے ہم زُلف محمد طارق نے نمازِ ظہر پڑھی تھی اور اُس کے بعد ہم جواہر ٹنل کی طرف روانہ ہوئے تھے۔بانہال قصبے میں پہنچنے کے فوراً بعد مجھے بانہال کے قصائی یاد آئے تھے جو میرے بچپن کے زمانے میں اکثر مرمت میں آکر بھیڑ واور بکرے خریدتے تھے۔کچھ ہی وقت کے بعد ہم جواہر ٹنل کے دہانے پر پہنچ گئے۔میں بچپن ہی سے قدرتی مناظر کا دلدادہ رہا ہوں۔بانہال کے فلک بوس پہاڑ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، کافی اُونچائی پہ برف سے لدے پہاڑوں کو دیکھا تو خالقِ کائنات کی کاریگری نے میرے احساسِ جمال کو بیدار کر دیا۔ بے ساختہ میری زبان سے سُبحان اللہ اور اللہ اکبر جیسے پُرعظمت کلمات نکلے۔ایک زمانے میں کہ جب جواہر ٹنل نہیں بنا تھا تو لوگ پیدل ٹنل کے اوپر پہاڑ پر سے گزر کر کشمیر جایا کرتے تھے مگر اب بڑے آرام اور کم وقت میں کشمیر پہنچ جاتے ہیں۔ اُس دور میں برفباری کے باعث مہینوں تک ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے کشمیر کا رابطہ کٹ جاتا تھا۔ ہماری گاڑی چلتے چلتے اچانک جواہر ٹنل کے اندر داخل ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں دن کے اُجالے سے نکل کر شب کی سیاہی میں آ گیا ہوں۔میری اہلیہ کا خالہ زاد بھائی عطا اُللہ نے ٹنل میں داخل ہوتے ہی گاڑی کی لائٹیں آن کر دی تھیں اور وہ بڑے اطمینان کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ ٹنل میں سے گزرتے ہوئے مجھے قبر کی تاریکی اور تنہائی یاد آنے لگی تو وحشتِ دل بڑھنا شروع ہوئی۔ یاالٰہی !ایک دن مجھے دُنیا سے منتقل ہونا ہے! تمام اپنے اور پرائے مجھ

سے جُدا ہو جائیں گے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سب کچھ چھوڑ کے جانے پر مجبور ہو جاؤں گا! یہی کچھ سوچتے ہوئے ہماری گاڑی کے سامنے دُور آگے معمولی سی دن کی روشنی بالکل ایک چھوٹے سے گول شیشے کی مانند نظر آنے لگی اور جوں جوں ہماری گاڑی آگے بڑھتی گئی توُں توُں اُس روشنی کا دائرہ بڑھتا چلا گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد ہماری گاڑی مکمل طور پر بھک سے ٹنل میں سے باہر آ گئی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ جس نے ہمیں اندھیرے سے روشنی کی طرف لایا۔ اب ہم کشمیر میں داخل ہو گئے تھے۔ ٹنل کے اُس پار انتہائی روح پرور اور دامنِ دل کو اپنی جانب راغب کرنے والا فطری ماحول تھا۔ ویری ناگ کے پہاڑوں پہ میری نظر جا کے ٹھہری کہ جن پہاڑوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے سنوارا ہے۔ دیودار، فر اور توس کے قد آور پیڑوں کی سدا بہار ہریالی اور مختلف طرح کے چھوٹے بڑے پیڑوں نے جو حسین سماں باندھا ہے اُنھیں دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ ٹنل کے ساتھ ہی بہت دُور نیچے تک بل کھاتی ہوئی قومی شاہراہ پہ چھوٹی بڑی گاڑیاں دوڑتی ہوئی یوں لگ رہی تھیں کہ جیسے گھائل ہرنیاں چوکڑیاں بھر رہی ہوں۔ قاضی گُنڈ میں پہنچنے کے بعد ہم سب کو براتیوں نے ایک ہوٹل پہ کھانا کھلایا تھا اور پھر وہاں سے بارہمولہ کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ ضلع اننت ناگ میں سے گزرتے ہوئے مجھے کشمیری کے دو عظیم شاعر مہجورؔ اور محمود گامی یاد آئے تھے۔ سفیدے کے پیڑوں کا ایک طویل سلسلہ نہایت خوشنما معلوم ہو رہا تھا۔ اب چونکہ ہم بالکل میدانی علاقے میں پہنچ چکے تھے اس لیے ہماری گاڑی دُوسری گاڑیوں کی طرح بڑی تیز رفتاری سے گزر رہی تھی، جونہی ہم پانپور پہنچے تو زعفران کے وسیع کھیتوں کو دیکھ کر میرا دل شاد ہوا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو پنجاب کی طرح بالکل ہموار میدان نظر آئے۔ فلم سازوں نے ایک زمانے میں کشمیر کے فطری حُسن کا بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ تقریباً تمام کلاسیکل فلموں کی شوٹنگ کشمیر میں ہوئی ہے۔ کشمیر کے باغات، جھرنے، جنگل، جھیلیں، آبشار اور پہاڑوں کے علاوہ کشمیری کلچر اور

ثقافت کو فلموں میں دکھایا گیا ہے۔ پانپور سے گزرنے کے کچھ ہی وقت بعد شام کے ملگجی سائے پھیلنے لگے اور دیکھتے دیکھتے بالکل اندھیرا چھا گیا۔ سرینگر شہر کے ایک طرف سے ہماری گاڑیاں بہت دُور آگے نکل گئی تھیں۔ ناربل اور پٹن سے گزرنے کے بعد ہم سوپور پہنچے تھے۔ کہتے ہیں شادی کے جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں اور زمین پہ اُن کا ملن ہوتا ہے۔ آج مجھے اس بات کا مکمل یقین ہو رہا تھا۔ کہاں کا لڑکا! اور کہاں کی لڑکی! شادی اور نکاح کے جائز رشتے میں آج بندھ گئے تھے۔ تقریباً رات کے دس بجے کے قریب ہم ضلع بارہمولہ کے صدر مقام پہ پہنچے اور اُس کے بعد براتیوں کی گاڑیاں ایک دوسری سڑک پر چلنے لگیں، ہماری گاڑی سے آگے تین گاڑیاں چل رہی تھیں۔ کچھ دُور جانے کے بعد ہم تحصیل روحامہ کے مرکزی مقام پر پہنچ گئے۔ گاڑیوں کی رفتار مدھم پڑ گئی اور اب ہم دُلہے کے گھر پہنچنے والے تھے۔ ایک گھر پہ بجلی کے قمقمے چمک رہے تھے اور لوگ بھی وہاں پہ جمع تھے۔ وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ یہی ہماری منزلِ مقصود ہے۔ سردی بہت شدید تھی، ہم بہت حد تک کانپنے لگے تھے۔ بڑے اچھے طریقے سے ہمیں گھر کے اندر لیا گیا۔ بزرگوں سے بغلگیر ہوئے، اُنھیں مبارک باد دی اور پھر ہمیں الگ ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کشمیر کی مہمان نوازی ساری دُنیا میں مشہور و مقبول رہی ہے۔ کشمیر کو دُنیا کی جنت بھی کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ واقعی کشمیر ہر کسی کے لیے دلکشی کے تمام نظارے اپنے اندر رکھتی ہے۔ کشمیری چائے اور قہوہ پینے کے بعد تھکان دُور ہوئی اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد رات کا کھانا کھلایا گیا۔ رات کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے اور نیند کا سب پہ غلبہ ہو رہا تھا اس لیے ہم سو گئے۔

دُوسرے دن صبح اُٹھے تو آسمان پہ کسی حد تک بادل تھے۔ ہمیں واپس گھر آنے کی فکر سوار ہوئی۔ رات کو اندھیرے میں ہمیں چونکہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا، اس لیے میں بستر سے اُٹھا، نمازِ فجر پڑھی اور مکان سے باہر آ کر دیکھنے لگا۔ آخروٹ کے پیڑ،

بادام اور سیب کے باغات چاروں طرف نظر آئے۔اُن کے علاوہ دھان کے کھیتوں میں کبوتروں کے جھنڈ اُتر رہے تھے۔

چائے اور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میری اہلیہ کے بغیر میں، میری بیٹی صبا کریم، میرا بیٹا رضا الرحمٰن، عطااللہ، ارشد، سلیم، سعیدہ اور طارق اپنے گھروں کو واپس لوٹنے کی تیاری کرنے لگے لیکن ہمدرد کشمیری ہمیں نہ جانے پر اصرار کر رہے تھے۔ بہر حال وہ مجبوراً ہماری واپسی پر متفق ہوگئے اور ہم روحامہ سے تقریباً دس بجے کے قریب سرینگر کے لیے روانہ ہوگئے۔ بارہ بجے ہم لال چوک میں تھے۔لال چوک پہنچتے ہی میں، عطااللہ، میرا بیٹا رضاالرحمٰن اور محمد طارق اپنی گاڑی میں لال منڈی کلچرل اکادمی دفتر گئے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر اپنی تحقیقی وتنقیدی مضامین کی کتاب ''اعتبار ومعیار'' کی اشاعت کے سلسلے میں منظور شدہ رقم کا تصدیق نامہ (Agreement Form) حاصل کرنا تھا۔ کلچرل اکادمی کے دفتر سے نکل کر ہم سب چشمہ شاہی دیکھنے گئے تھے۔ کشمیر کے پُرکشش مقامات میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ مُغلیہ دورِ حکومت میں کشمیر کے قدرتی حُسن کو چار چاند لگانے میں کوئی بھی کسر نہیں رکھی گئی تھی۔ ان حسین اور دلکش مقامات کی کتنی ہی یادیں سیاحوں کے ذہنوں میں محفوظ ہوں گی۔ میں یہی سوچتا رہ گیا۔ چشمہ شاہی دیکھنے کے بعد ہم جھیل ڈل کے کنارے پر آ کے مختلف طرح کے آبی پرندوں کا نظارہ کرنے لگے۔ ڈل جھیل پہ میں نے نظر دوڑائی تو اُس کی وسعتوں پہ حیران ہو کے رہ گیا۔ جھیل کا پانی بالکل شانت تھا دُور دُور تک ہاوس بوٹوں کا سلسلہ پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے ڈل کے باسیوں کی زندگی پہ تعجب ہو رہا تھا کہ آخر کڑاکے کی ٹھنڈ، کہرے اور برفباری میں یہ لوگ کس طرح اپنا جیون بتاتے ہوں گے! ڈل جھیل کے کنارے پر چند شکارے والے کھڑے تھے۔ ہمارے جی نے چاہا کہ ہم بھی شکارے میں بیٹھ کے ڈل جھیل کی سیر کریں۔ دو بوڑھے شکارے والے ہمیں بُلانے لگے

''آیئے آپ کو ڈل جھیل کی سیر کرائیں''

میرے ہم ذُلف محمد سلیم نائب تحصیلدار، محمد ارشد اور عطا اُللہ نے مجھے اُن بوڑھے شکارے والوں سے کشمیری میں بات کر کے ریٹ معلوم کرنے کو کہا۔ میں نے اُن کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے جب شکارے والوں سے ریٹ دریافت کیا تو اُنھوں نے ایک شکارے پہ سوار ہونے کے پانچ سو روپے بتائے۔ میں نے انکار کیا تو وہ خدا اور قُرآن پاک کی قسمیں کھانے لگے اور کہنے لگے کہ اس سال کشمیر میں مسلسل ہڑتالوں کی وجہ سے ہم لوگ کچھ بھی نہیں کما سکے ہیں۔ ہم نے اُنھیں ایک شکارے کے دوسو روپے بتائے تو وہ نہیں مانے۔ ہم واپس جانے لگے تو وہ پیچھے سے آواز دینے لگے ''آیئے، تین سو روپے دیجیے'' ہم نے مناسب سمجھا اور دو شکاروں پر سوار ہو گئے۔ سلیم، سعیدہ اُن کی بٹیا مصباح اور میری بیٹی صبا کے علاوہ ارشد ایک شکارے میں سوار ہوئے اور دوسرے میں، میں، عطا اُللہ، محمد طارق اور رضا بیٹھے۔ شکارے ہچکولے کھاتے ہوئے ڈل جھیل پہ تیرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے اور مجھ پہ یہ خوف سوار ہوا کہ اگر کہیں ہمارا یہ شکارہ توازن کھودے تو ہمارا کیا حال ہوگا؟ کیونکہ ڈل جھیل نے آج تک کئی لوگوں کو اسی طرح نگل لیا ہے۔ ہم سب ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ڈل جھیل کا نظارہ کررہے تھے۔ جون، جولائی کے مہینے میں یہ شکارے والے لاکھوں روپیہ کماتے ہیں۔ سیاحوں کی آمد پر یہ ڈل کے باسی رُوپے کمانے کی حرص میں اپنی عزیز ترین شے کو بھی داؤ پہ لگا دیتے ہیں۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے یہ کیا کچھ نہیں کرتے۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد ہم سب شکاروں سے نیچے اُتر آئے۔ اُس کے بعد ہم لال چوک اور ٹورسٹ سینٹر کے آس پاس خریداری کرتے رہے یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ بہر حال سب نے یہی مشورہ کیا کہ رات کو سفر کرنا مناسب نہیں اس لیے آج رات کو سرینگر شہر میں ہی رُکیں گے اور کل سویرے یہاں سے چھنی کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ دن کو جب ہم خریداری کررہے تھے تو ہماری گاڑی لال چوک

میں ایک جگہ کھڑی تھی، عطا اللہ گاڑی سے باہر کسی ضروری کام کے لیے گیا ہوا تھا۔ میں اور میرا بیٹا اپنی نئی گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں پچھلی سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا اور میرا بیٹا اگلی سیٹ پہ تھا کہ اسی دوران کوئی پاگل بوڑھا آدمی میرے بیٹے کو کشمیری میں کچھ پوچھنے لگا۔ بیٹے نے اُسے کہا کہ میں کشمیری نہیں جانتا تو اُس بوڑھے پاگل کو اُس کی بات پہ غصہ آیا اور زور سے ایک مُکا گاڑی پہ مارا اور چلتا بنا۔ جام میں ہماری گاڑی بھی کھڑی تھی اور جب کچھ وقت کے بعد جام کُھلا اور گاڑیاں آگے کو کھسکنے لگیں تو اُس پاگل نے ہماری گاڑی پہ پتھراؤ شروع کر دیا۔ دو موٹے موٹے پتھر ہماری گاڑی کے اگلے حصے پہ پڑے پھر بھی اللہ نے ہماری گاڑی کے شیشوں کو بچایا ورنہ کیا رہنا تھا۔ جب ہماری گاڑی پہ پتھر پڑا تو میرے بیٹے کا گرم خون اُبلنے لگا، وہ گاڑی سے نیچے اُترنے لگا اور چاہتا تھا کہ اُس پاگل کی ہڈی پسلی ایک کر دے لیکن میں نے اُسے روکا اور پاگل کے ساتھ اُلجھنے سے منع کیا۔ بڑی مشکل سے ہم دونوں باپ بیٹے نے اپنے غصے پہ قابو پایا۔ دراصل کشمیر میں پتھر بازی نے وہاں کے بہت سے لوگوں کی زندگی مفلوج بنا دی ہے۔ ہم نے دھیرے دھیرے لال چوک سے گاڑی نکلوائی اور شام ہوتے ہوتے لال منڈی میں آ کر رائل ریذیڈنسی نام کے ایک ریسٹورنٹ میں رات کو ٹھہرے۔ میرے ہم زُلف محمد سلیم نے تین کمرے بُک کروائے تھے اور بڑے آرام سے ہم رات کو اُس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ دُوسرے دن ہم نے پہلگام جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میری دیرینہ تمنّا تھی کہ پہلگام دیکھوں، اللہ تعالیٰ نے سب کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ پہلگام سے گزرتے ہوئے چھنی چلے جائیں۔ غرضیکہ ہم نے اپنی گاڑیوں کے رُخ پہلگام کی طرف موڑ دیے۔ چناروں اور آبشاروں کے حُسین مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے تھے۔ مختلف بستیوں سے گزرنے کے بعد ہماری گاڑیاں پہلگام جانے والی سڑک پہ دوڑ رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہم سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ہم دیوداروں اور کئی طرح کے

جنگلی پیڑوں میں سے گزرتے ہوئے پہلگام کی دلکش اور صحت افزا وادی میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دُور تک گھومے پھرے اور اپنی یادیں کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کرنے لگے۔ گلمرگ دیکھنے کی خواہش بھی ہمارے دل میں مچل رہی تھی مگر وقت اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں نے تمام ساتھیوں سے اصرار کیا کہ آج گھر واپس جاتے ہوئے ہم ویری ناگ کا چشمہ بھی دیکھتے چلیں گے۔ الحمداللہ میری یہ تمنا بھی اللہ تعالیٰ نے اسی سفر میں پوری کردی۔ ایک طویل مُدت سے میرے دل میں ویری ناگ کا تاریخی چشمہ دیکھنے کی خواہش تھی۔ ہم تقریباً پانچ بجے ویری ناگ چشمے پر پہنچے تھے۔ مُغل بادشاہوں نے اُس چشمے کو بڑی مضبوط بنیادوں پہ تعمیر کروایا ہے کہ دیکھنے والوں کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دریائے جہلم یہاں ہی سے نکلتا ہے۔ تقریباً بارہ فُٹ گہرا اور کم وبیش دوسوفُٹ چوڑا یہ چشمہ شاہی صاف وشفاف پانی سے لبالب بھرا رہتا ہے۔ زمین کے اندر سے پانی اُبال کی صورت میں باہر آتا ہے۔ بڑی بڑی مچھلیاں پانی میں غوطہ زنی کرتی رہتی ہیں جنھیں پکڑنا قانونی جُرم قرار دیا گیا ہے۔ میں بچپن میں اکثر اپنے خاندان کے بُزرگوں سے یہ ضرب المثل سُنتا تھا کہ ”ویری ناگ کی مچھلیاں دیکھنی حلال اور کھانی حرام“ ہم کوئی بیس منٹ اس چشمے پہ ٹھہرے اور اُسکے بعد گاڑیوں پہ سوار ہوکر اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ اب ہماری گاڑیاں آہستہ آہستہ جواہر ٹنل کی طرف بڑھ رہی تھیں اور میں کشمیر کے تاریخی پس منظر کے بارے میں سوچنے لگا کہ ایک زمانے میں وادیٔ کشمیر بہت بڑی جھیل تھی بالکل ڈل جھیل کی طرح پھر اس میں تبدیلی آئی۔ پانی کا نکاس ہوا تو لوگ آباد ہوئے۔ یہ وہی کشمیر ہے جو رشیوں، مُنیوں، صوفیوں، سنتوں، اولیائے کرام، بزرگانِ دین اور اہل علم وفن کی سرزمین رہی ہے۔ اسی کشمیر میں موئے مقدّس ہے۔ شیخ العالمؒ، لل دید، حبہ خاتون، دستگیر صاحب، مخدوم صاحب، سید یعقوب صاحب، نقش بند صاحب، خانقاہِ معلّٰی، بابا ریشی صاحب، بابا شکرالدّین صاحب اور بابا زین شاہ صاحب۔ ان تمام اولیائے کرام اور بزرگان دین

کا تعلق کشمیر ہی سے ہے کہ جنھوں نے دُنیا والوں کو قرآن وحدیث کے مطابق زندگی بسر کرنے کی دعوت دی۔ ان کے علاوہ شنکر آچاریہ، امرناتھ، کھیر بھوانی، ہری پربت اور مٹن کا مندر بھی کافی مشہور ہیں۔ اُردو اور فارسی کے عظیم شاعر علامہ اقبالؔ کہ جنھیں شاعرِ مشرق کہا جاتا ہے، اُن کے آباواجداد بھی کشمیر ہی سے تھے۔ بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ بھی کشمیر ہی رہی ہے۔ غرضیکہ ہزاروں داستانیں کشمیر سے جُڑی ہیں۔ آج بھی پوری دُنیا کی نظریں کشمیر پر ہیں مگر کشمیر کی نظر کسی پہ نہیں ہے۔ کتنے ہی صاحب علم وہنر کشمیر میں پیدا ہوئے کہ جنھوں نے پوری دُنیا میں اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔ وقت کی کمی کے پیش نظر میں عصر حاضر کے مشہور ومعروف اور کہنہ مشق محقق، نقاد، شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار اور دانشور محترم حامدی کاشمیری صاحب (اب مرحوم ہو چکے ہیں) کے دولت کدے پہ جاکے اُن سے ملاقات نہیں کر سکا تھا۔ اُن کے علاوہ جناب فاروق نازکی، جناب ایاز رسول نازکی، محمد یوسف ٹینگ، غلام نبی خیال، جناب نور شاہ (جو ایک اہم افسانہ نگار، ناول نگار اور مکالمہ نگار بھی ہیں اور جنھیں میں دُوسرا کرشن چندر کہتا ہوں) اور ماہر اقبالیات جناب پروفیسر بشیر احمد نحوی سے بھی بالمشافہ ملاقات نہیں کر سکا تھا کیونکہ وقت نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔

سچ سُنیے، کشمیر سے واپس لوٹنے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ہماری گاڑی جواہر ٹنل کے نزدیک پہنچی تو میں نے ایک حسرت بھری نگاہ سے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ دل نے چاہا کہ میں گاڑی سے اُتر جاؤں مگر میں یوں محسوس کر رہا تھا کہ جیسے میرے وجود کو کوئی آگے کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔ ٹنل سے باہر آنے کے بعد یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں نیند کے عالم میں کوئی حسین سپنا دیکھ کے اُٹھا ہوں۔ ٹنل کے ساتھ ہی نیچے کی طرف ایک ہوٹل پہ ہم سب نے نمکین چائے پی تھی، اُس کے بعد ہم تقریباً ڈھائی گھنٹے میں چھنی پہنچ گئے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد میں، میرا بیٹا رضا الرّحمٰن اور میری اہلیہ کا خالہ زاد بھائی عطا اللہ اُدھم پور چلے آئے تھے۔

....

ضلع ڈوڈہ، رام بن اور کشتواڑ سے مُلحقہ تمام علاقے انتہائی پہاڑی غیر ہموار اور جنگلات سے گھرے ہوئے ہیں۔ بٹوت سے ضلع ڈوڈہ، کشتواڑ اور بھدرواہ کے لیے جو سڑک جاتی ہے وہ موجودہ دور میں کافی کشادہ اور تقریباً تارکول سے بالکل سیاہ بنادی گئی ہے لیکن جس دور میں، میں بالکل چھوٹا تھا اور مرمت میں رہتا تھا بلکہ جب میں بھدرواہ میں پڑھتا تھا اُس زمانے میں بھی بٹوت سے آگے کشتواڑ تک نہایت تنگ کچی سڑک تھی جس پہ گاڑیاں چیونٹیوں کی طرح چلا کرتی تھیں اور اکثر اُس سڑک پہ چھوٹی بڑی گاڑیاں حادثوں کی شکار ہوجایا کرتی تھیں۔ غالباً 1988ء میں کشتواڑ سے ایک بس جموں کے لیے آرہی تھی، رگی نالے پہ بریک فیل ہوگئی اور بس سیدھی نالے میں جاگری تھی۔ اُس میں باون آدمی سوار تھے جن میں کوئی بھی زندہ نہیں رہا تھا۔ اسی بس میں کشتواڑ کے میرے چند ہم جماعت بھی تھے جو بھدرواہ کالج میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ مولوی عبدالرضا رضاؔ نے بجا فرمایا ہے کہ

آدمی بُلبلہ ہے پانی کا
کیا بھروسا ہے زندگانی کا

آج تک ضلع ڈوڈہ میں ہزاروں افراد سڑک حادثوں میں جاں بحق ہوئے ہیں، حالانکہ اب بٹوت سے کشتواڑ، ڈوڈہ، بھدرواہ اور بھلیسہ تک کی سڑکیں کافی کشادہ اور پکّی ہیں مگر اس کے باوجود حادثے ہوتے ہیں اور چھوٹی یا بڑی گاڑی جب حادثے کا شکار ہوتی ہے تو سیدھی چناب میں چلی جاتی ہے۔ اس طرح لواحقین تک ہلاک شدگان کی لاشیں بھی نہیں پہنچ پاتی ہیں کیونکہ دریائے چناب کی گہرائی اور اُسکی لہریں لاشوں کو برآمد کرنے میں مختلف طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ سراج کا پورا علاقہ اس قدر ڈھلوان ہے کہ معمولی سا کنکر بھی اگر اُوپر سے گرتا ہے تو وہ سیدھا چناب میں پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح بٹوت تا کشتواڑ جتنی بھی گاڑیاں چلتی ہیں سب دریائے

چناب کے کنارے سے گزرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسافر جان کو ہتھیلی پہ رکھ کر سفر کرتے ہیں اور یہی خدشہ لگا رہتا ہے کہ نا معلوم کس وقت گاڑی سڑک سے نیچے چلی جائے گی۔ گاڑیوں کے حادثوں کی بنیادی وجہ ڈرائیوروں کی بے اُصولی اور لاپرواہی ہوتی ہے۔ غالباً فروری 2009ء میں جب عسر اور بگّر کے علاقے کے درمیان تقریباً ایک کیلومیٹر سے زیادہ سڑک کافی نیچے دھنس گئی اور دھیرے دھیرے دریائے چناب کی جانب کھسکتی گئی تو ضلع ڈوڈہ کا رابطہ گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیے بالکل منقطع ہو کے رہ گیا تھا۔ اس طرح ریاست کے دُوسرے ضلعوں سے تعلق برقرار نہ رہنے کی وجہ سے پورے ضلع ڈوڈہ میں اقتصادی اور معاشی بحران پیدا ہوا تھا۔ جب لوگ تشویشناک صورتحال سے گزرنے لگے تو اُس وقت کی حکومت نے حتی الامکان اس بات کی سعی کی کہ عوام کو راحت پہنچانے کے لیے ہوائی سروس شروع کی جائے چنانچہ بھدرواہ، ڈوڈہ، کشتواڑ اور بھلیسہ کے دُور دراز اور پسماندہ علاقوں میں اشیائے خوردنی اور دیگر بنیادی چیزوں کی ترسیل کے لیے ہوائی جہازوں سے کام لیا گیا۔ یہ سلسلہ تقریباً بیس دن تک قائم رہا تھا۔ سڑک چناب کی جانب دھنس جانے کی بنیادی وجہ نہ صرف شدید برفباری اور بارش تھی بلکہ بغلیاڑ بجلی پروجیکٹ کے مکمل ہونے پر دریائے چناب میں پانی کی سطح بڑھ جانا تھی۔ چندرکوٹ کے نزدیک تعمیر شدہ یہ بجلی پروجیکٹ تقریباً اٹھارہ برس کے بعد مکمل کیا گیا کہ جس کا افتتاح وزیراعظم جناب ڈاکٹر من موہن سنگھ نے کیا تھا۔ اس پروجیکٹ سے جہاں بجلی کی پیداوار میں بیش بہا اضافہ ہوا تو وہیں دُوسری طرف دریائے چناب کا پانی کہ جو پہلے کسی عفریت کی طرح بل کھاتا ہوا تیز بہتا نظر آتا تھا اب یوں دکھائی دینے لگا کہ جیسے یہ کوئی جھیل ہو۔ اسی تھمے ہوئے پانی نے دریا کے دونوں کناروں میں اپنا ردِعمل اس صورت میں ظاہر کیا کہ دریا کے کناروں سے جُڑی زمین کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ اس بحرانی صورتِ حال سے چھٹکارا پانے کی خاطر محکمۂ تعمیراتِ عامہ نے مُتبادل سڑک کا کام فوری طور پر شروع کیا لیکن

یہ متبادل سڑک کسی بھی وقت پھر دریائے چناب کی نذر ہوسکتی ہے۔ بہر حال حکومت اور عوام نے اس مسئلے کو نہایت سنجیدگی سے لیا اور بالآخر اسی نتیجے پر پہنچے کہ مرمت اور سُدھ مہادیو کے درمیان بذریعہ ٹنل ضلع ڈوڈہ کا رابطہ ریاست کے دوسرے خطوں سے برقرار کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح نہ صرف دریائے چناب کے حملوں سے بچاؤ کی صورت نکلی بلکہ سدھ مہادیو اور مرمت کے درمیان بننے والی سڑک کا فاصلہ بھی کھلینی تک تقریباً پچاس کیلومیٹر کم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ سدھ مہادیو سے مرمت کے لیے سڑک نکالنے اور ٹنل کی نشاندہی کی خاطر ایک خصوصی سروے ٹیم بھیجی گئی کہ جس نے سدھ مہادیو اور مرمت دونوں طرف سے سڑک اور ٹنل کا سروے کیا اور اس منصوبے میں دونوں ضلعوں کے عوام کی فلاح و بہبودی کے روشن امکانات کا اعلان کیا گیا۔ اس ٹیم کے بعد سابق وزیر تعمیرات جناب غلام محمد سروری نے ہوائی جہاز پہ سوار ہوکے سدھ مہادیو اور مرمت کا ہوائی سروے کرنے کے بعد اس بات کی خوشی کا اظہار کیا کہ ڈوڈہ، بھدرواہ، بھلیسہ اور کشتواڑ کو مرمت اور سدھ مہادیو سڑک رابطے سے جوڑنا جہاں مسافروں کے لیے جموں پہنچنا کم وقت اور بے خطر صورت میں ممکن ہے تو وہیں محکمۂ سیاحت کے فروغ اور اس کی ترقی کے تابناک پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ مرکزی سرکار نے اس سڑک اور ٹنل کی مکمل پلاننگ کو تشکیل دیا ہے۔ اس ٹنل پہ خرچ ہونے والی رقم کو منظوری دی ہے۔ مرمت، سدھ مہادیو قومی شاہراہ کی تعمیر کا کام شروع ہوچکا ہے۔ ٹنل کا کام ابھی اگرچہ شروع نہیں ہوا ہے لیکن پوری اُمید ہے کہ یہ کام بہت جلد شروع ہوگا۔ کشتواڑ، ڈوڈہ، بھدرواہ اور بھلیسہ کے لوگوں کے لیے جہاں جموں آنا نہایت آرام دہ، کم وقت اور قدرتی نظاروں سے لُطف اندوز ہونا یقینی امر ہے تو وہیں جموں، اُدھم پور، سانبہ اور کٹھوعہ کے لوگ بھی بآسانی بھدرواہ، ڈوڈہ اور کشتواڑ جاسکیں گے۔ خدا کرے عوام کی ایک اہم اور بنیادی ضرورت پوری ہو اور حکومت کے اس منصوبے کو عملی صورت حاصل ہو!

....

ہر سال نومبر سے مارچ کے آخری ہفتے تک جموں و کشمیر قومی شاہراہ برفباری یا شدید بارشوں کی وجہ سے گاڑیوں کی آمد ورفت کے لیے دردِ سر بن جاتی ہے۔ کشمیر جانے والی تمام چھوٹی بڑی گاڑیوں کو ٹریفک پولیس اُدھم پور، بلی نالا وغیرہ کے مقامات پر روک دیتی ہے اور عام طور پر سڑک پہ گاڑیاں کھڑی کردی جاتی ہیں۔ دوطرفہ گاڑیوں کی آمد ورفت ناممکن ہوجاتی ہے۔ایک دن کشمیر سے گاڑیاں جموں کی طرف روانہ کی جاتی ہیں اور دُوسرے دن جموں سے کشمیر کی طرف۔تقریباً چار ماہ تک اسی طرح قومی شاہراہ پہ گاڑیاں چلائی جاتی ہیں۔اس صورت میں جب زیادہ تر قومی شاہراہ پہ جام لگتا ہے تو مسافروں کو بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال گذشتہ چند برسوں میں جب ریاست کی باگ ڈور جناب غلام نبی آزاد کے ہاتھ میں تھی تو اُنھوں نے مرکزی سرکار کی توجہ قومی شاہراہ کی طرف مبذول کرائی اور خدا کے فضل سے مرکزی سرکار نے جموں سے کشمیر تک اتنی کشادہ سڑک بنانے کی منظوری دی کہ جس میں بیک وقت چار گاڑیاں سڑک کی دونوں جانب چل رہی ہیں۔ جموں وکشمیر کے درمیان سڑک کے فاصلے کو کم کرنے کے لیے چنہنی کے نزدیک پُل مادا سے تھوڑا اُوپر نو کیلومیٹر ٹنل بنایا گیا ہے جو رام بن کی جانب ناشری نالے پہ نکلتا ہے۔ یہ ٹنل 44 کیلومیٹر کے فاصلے کو کم کرتا ہے اور کدھ، پتنی ٹاپ اور بٹوت جیسے بالائی علاقوں سے گزرتے ہوئے مسافروں کے وقت اور گاڑیوں کے پیٹرول اور ڈیزل کو بچانے میں مفید ثابت ہوا ہے۔خوشی کی بات یہ ہے کہ مذکورہ ٹنل برِّاعظم ایشیا کا سب سے بڑا ٹنل ہے جو چنہنی کے نزدیک بن چکا ہے۔لائٹن (LIGHTON) نام کی ایک آسٹریلین کمپنی نے تقریباً اسّی فیصدی ٹنل بنانے کا کام کیا لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر وہ اُسے مکمل نہ کرسکی اور یہ کام ایک دوسری کمپنی کو دیا گیا۔ٹنل بننے کی وجہ سے چنہنی کے گردونواح کا ماحول ومنظر بھی بدل چکا ہے۔یہ ٹنل سیاحوں کے لیے بھی کسی عجوبے سے کم نہیں ہے۔تقریباً دس سال تک اس تاریخی ٹنل کی تعمیر رام نگر، رام بن، ڈوڈہ،

بانہال، اُدھم پور، ریاسی اور خاص کر چھنی کے لوگوں کے لیے مزدوری کمانے کا ایک بہتر ذریعہ ثابت ہوا۔

....

2 جنوری 2017ء کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں اُردو کی اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ پہ میرے جوائن کرنے سے پہلے ہی وائس چانسلر پروفیسر جاوید مسرت صاحب نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی میں دو شعبے اُردو اور اسلامک اسٹیڈیز قائم کر دیے تھے۔ اُن کی پُر وقار اور باغ و بہار شخصیت سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اُن کے اوصاف حمیدہ نے میرے دل میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی۔ میں نے اُن کو قریب سے دیکھا، سوچا، سمجھا اُن کے صالح افکار و نظریات سے مستفید ہونے کا موقع ملا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُن میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کو ہر طرح سے ترقی کی راہ پہ گامزن دیکھنے کی للک دیکھی تو میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے تین چار ملاقاتوں کے دوران ہی اُن سے اُن کے سوانحی کوائف اور سائنسی و علمی کارناموں کی جانکاری حاصل کر لی اور اُن کی فعال اور باکمال شخصیت پر ایک مضمون لکھ ڈالا جس کا عنوان تھا ''پروفیسر جاوید مسرت: وائس چانسلر بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (سمندر سوچ، ریشمی دل، شبنمی آنکھیں)''

....

28/جون 2017ء کو مجھے وشاکھا پٹنم میں ایک سیمینار میں جانے کا موقع ملا۔ اُس سفر کی یادیں بھی میرے شعور، تحت الشعور اور لاشعور کا حصہ بنی ہوئی ہیں۔ زندگی، اپنے فطری عمل میں ایک طویل مگر غیر یقینی سفر ہے، اس لیے کہ کوئی بھی شخص یہ نہیں جانتا ہے کہ کب؟ کہاں اور کن حالات و واقعات میں اُس کی یا کسی کی زندگی کی شام ہو جائے۔ آدمی، تجربے اور مشاہدے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک یا ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر مہینوں بلکہ برسوں

میں کیا کرتے تھے۔ آج کے دور میں قریب وڈور کا سفر کرنا بہت کم وقت میں بہت آسان ہوگیا ہے۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے کہ جس نے انسان کو عقل سلیم، اختراعی ذہنیت اور سائنسی علوم وفنون کی دولت سے مالامال کیا کہ آج کے انسان کے لیے وہ تمام تصورات اور ناممکنات کہ جو کسی زمانے میں خواب وخیال سے تعلق رکھتے تھے آج وہ ممکنات میں شامل ہیں۔

وشاکھا پٹنم، جموں سے تقریباً 2000 کیلومیٹر دُور ہے۔ 2016ء میں جب مجھے وشاکھا پٹنم کی اُردو ادبی تنظیم ''اصنام شکن'' کے صدر جناب عثمان انجم (افسوس! یہ اردو کا شیدائی 2021ء میں اللہ کو پیارا ہوگیا) نے یک روزہ قومی سیمی نار بعنوان ''اکیسویں صدی کی اردو قلم کار خواتین'' میں مدعو کیا تھا تو میں کچھ اہم گھریلو مسائل کی وجہ سے اُس سیمینار میں شرکت نہیں کرسکا تھا۔ میری عدم موجودگی نے مجھے یہ احساس دلایا تھا کہ میں اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور اُن سے اچھی باتیں سیکھنے سے محروم رہ گیا لیکن مارچ 2017ء میں جب مجھے جناب عثمان انجم نے یہ خوشخبری سنائی کہ ہماری اُردو ادبی تنظیم 2 جولائی 2017ء کو وشاکھا پٹنم میں یک روزہ قومی سیمینار بعنوان ''اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت'' کا انعقاد کررہی ہے تو مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے مجھے اس سیمی نار میں جموں وکشمیر میں اردو تنقید کی پیش رفت کے حوالے سے بطور خاص شرکت کی دعوت دی۔ میں انکار نہیں کرسکا۔ میں نے ''اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت (جموں وکشمیر کے حوالے سے) ''انھیں اپنا مقالہ لکھ بھیجا جو وہاں کتابی صورت میں شائع بھی ہوا اور یہ مصمم ارادہ کیا کہ ان شاءاللہ میں اس سال وشاکھا پٹنم کے یک روزہ قومی سیمینار میں شرکت کروں گا۔

28 جون 2017ء کو میں شام 6 بجے ریلوے اسٹیشن جموں سے پوجا ایکسپریس میں سوار ہوا اور صبح تقریباً 4 بجے پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن پہ اتر گیا۔ مجھے بچپن سے نیند پیاری ہے اور جب کبھی تھکان کی وجہ سے میری صبح کی نماز قضا ہوجاتی

ہے تو مجھے علامہ اقبالؔ کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے کہ ؎

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے

ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

اللہ کا شکر کہ ریلوے اسٹیشن پہنچنے سے دس منٹ پہلے ہی میں جاگ گیا ورنہ وشاکھاپٹنم کے بجائے جے پور کی جانب روانہ ہو گیا ہوتا۔ ریلوے اسٹیشنوں اور ریل گاڑیوں میں اکثر چوریاں ہوتی ہیں۔ چور رُوپ بدل بدل کر سیدھے سادے اور شریف آدمیوں کا سامان چرا لیتے ہیں اور جیب کترے اپنا کام کرتے ہیں۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ ریلوں اور ریلوے اسٹیشنوں پہ وہی آدمی اپنا سامان سفر لٹنے یا چوری ہونے سے محفوظ رہتا ہے جو نہایت ہوش مند، چوکنا اور چار چشمی قسم کا ہو۔ آج کل کے چور بہت حد تک ماہر نفسیات ہوتے ہیں۔ اُن کی نظر مسافر پہ کم اور اسکے سامان پہ زیادہ رہتی ہے۔

میں سرد طبعیت کا آدمی ہوں، اس لیے میں معمولی سردی بھی برداشت نہیں کر پاتا ہوں۔ ہاں گرمی برداشت کرنے کا مادہ مجھ میں زیادہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اے سی کے بجائے سلیپر کوچ میں سفر کرنا بہتر سمجھا۔ رات کے تقریباً گیارہ بجے میں اپنی سیٹ پہ سو گیا۔ سونے سے پہلے میں کھڑکی سے باہر بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ ٹرین بپھرائی ہوئی شیرنی کی طرح گزرتی رہی اور میری آنکھوں کے سامنے گاؤں، قصبے، شہر، بیاباں آتے اور دیکھتے دیکھتے گزر جاتے۔ اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ دُنیا بھی ایک ٹرین کی مانند ہے۔ کون کب کہاں اُتر جائے کوئی نہیں جانتا۔ میں اسی خیال میں گم تھا کہ ٹرین میں دُور سے چائے چائے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میرے دل نے چاہا کہ میں چائے کا ایک کپ پی کے سو جاؤں۔ میرے مانگنے پہ چائے والے نے ایک چکنے موٹے کاغذ سے تیار شدہ کپ میں چائے انڈیلی اور مجھے دیتے ہوئے بولا ''بابو جی دس روپے''

میں نے جیب سے دس روپے نکالے اور اُسے دیتے ہوئے پوچھا

''چائے اچھی ہے نا؟''

''ہاں بابو جی ایک دم مزے دار، بڑھیا پی کے دیکھ لیجے بابو جی''

یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ اُس کی کاروباری آواز دھیمے دھیمے ریل گاڑی کی چھک چھک کی آواز میں بند ہو گئی۔ میں نے چائے سِپ کی تو پہلے گھونٹ ہی میں چائے کے بے مزہ ہونے کا احساس ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں چائے کے بدلے گرم پانی پی رہا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب لوگ ایماندار ہوا کرتے تھے تو خالص دُودھ ملا کرتا تھا لیکن اب سفید پانی بکتا ہے۔

29 جون 2017ء کو صبح تقریباً چار بجے میں پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن پر اُتر گیا۔ طرح طرح کے لوگ بچّے، جوان، بوڑھے مرد عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں اپنی اپنی زندگی کو خوبصورت بنانے کی فکر میں بھاگتے دیکھے۔ میں اور میرے علاوہ دو نوجوان لڑکے ریلوے اسٹیشن سے باہر آئے اور آٹو میں بیٹھ گئے۔ آٹو والے نے ہمیں نظام الدّین ریلوے اسٹیشن پہنچایا۔ میں نے کنٹین میں ناشتہ کیا اور وشاکھا پٹنم جانے والی ٹرین کا پتا لگانے اور پلیٹ فارم معلوم کرنے کے لیے انکوائری رُوم کی طرف گیا۔ معلوم یہ ہوا کہ ساڑھے آٹھ بجے صبح میری ٹرین سمتا سپر فاسٹ ایکسپریس پلیٹ فارم نمبر سات سے جائے گی۔ پورے آٹھ بجے ٹرین پلیٹ فارم پہ لگی۔ میں ٹرین پہ سوار ہو گیا اور اپنے مقررہ وقت پر ٹرین وشاکھا پٹنم کے لیے روانہ ہو گئی۔ تین فوجی جن میں ایک شادی شدہ نوجوان اور دو ادھیڑ عمر کے میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ دیکھتے دیکھتے ٹرین ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ڈیڑھ بجے کے قریب جب ٹرین جھانسی پہنچی تو مجھے جھانسی کی رانی یاد آ گئی کہ جو کسی زمانے میں مردانہ وار انگریز فوجیوں کے ساتھ لڑی تھی اور جس کی بہادری کے کارنامے آج بھی ہندوستان کی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور اُن غیر مسلم فوجی بھائیوں کو سامان کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور ظہر کی نماز ادا

کرنے کے لیے وضو کرنے چلا گیا۔ٹرین کی رفتار تیز ہوگئی ۔ میں وضو کر کے آیا۔سورج کس جانب غروب ہوتا ہے یہ معلوم نہیں ہورہا تھا۔اپنے ساتھیوں سے پوچھا تو وہ بھی اپنی اپنی قیاس آرائی کرنے لگے۔اسی اثنا میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے فوراً اپنے موبائل سیٹ پہ قطب نما ڈھونڈ نکالا اور مجھے اُسکے ذریعے کعبہ معلوم ہوا۔میں نے سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے دو رکعت نماز کسر پڑھی اور اسکے بعد کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ٹرین ایک سنسان علاقے سے گزر رہی تھی۔ یہ چمبل گھاٹی کا علاقہ تھا۔ ٹرین ویرانیوں اور آبادیوں سے گزرتی ہوئی جب گوالیار پہنچی تو مجھے شہنشاہ سنگیت ،تان سین یاد آ گیا۔ چاروں طرف ہریالی، گنے کے کھیت، کہیں آم کے پیڑ اور کہیں پرندوں کا راجا، رانی مور مورنی نظر آئے۔تاحد نگاہ ہموار میدانی سلسلہ دلکش معلوم ہورہا تھا۔ساڑھے پانچ بجے میں نے نمازِ عصر پڑھی۔ دیکھتے دیکھتے شام کے مہیب سائے پھیلنے لگے۔کہیں کسی شوالے سے گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی اور کہیں کسی مسجد سے اذان سنائی دی۔ میں نے نمازِ مغرب پڑھی۔ٹرین کی رفتار مدھم ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ ایک ریلوے اسٹیشن پہ رُک گئی۔ میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو ایک بوڈ نظر آیا اس پہ بھوپال ریلوے اسٹیشن لکھا ہوا تھا۔ مجھے تاج المساجد کے ساتھ ساتھ بھوپال گیس ٹریجڈی یاد آ گئی۔میرا وجود لرز اُٹھا۔تھوڑی دیر کے بعد ٹرین ایک ہلکے جھٹکے کے ساتھ چل پڑی۔ بجلی کی روشنی سے بھوپال شہر جگمگا رہا تھا۔ میں کلاسیکل موسیقی کا بچپن سے دلدادہ رہا ہوں۔ میں زیادہ تر ایسے گیت سنتا ہوں جو مجھے رُلائیں یا جو مجھے زندگی کی صداقتوں کا گیان دھیان فراہم کریں۔ میں نے ایرفون لگایا اور موبائل پہ سدا بہار گیت سننے لگا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد ٹرین آگرہ ریلوے اسٹیشن پہنچی۔آگرہ پہنچتے ہی میرا دھیان تاج محل کی طرف گیا اور مجھے شاہجہاں اور ممتاز بیگم یاد آئے۔ میں کچھ دیر کے لیے محبت، تاریخ اور وقت کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رہا۔ٹرین کے ڈرائیور نے زور سے سٹی بجائی اور میرا ذہن فوراً اپنی جگہ پہ واپس آ گیا۔ میں نے موبائل پہ دیکھا تو رات کے

ساڑھے نو بج چکے تھے۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھا، وضو کیا اور نمازِ عشا کسر پڑھی۔ ٹرین پوری تیز رفتاری کے ساتھ پٹری پہ دوڑ رہی تھی۔ میں نے سونے سے پہلے چار قل، آیۃ الکرسی، الحمد شریف اور درود شریف پڑھا اور داہنی کروٹ لیٹ گیا۔

30 جون 2017ء کی صبح کو جب میں نیند سے بیدار ہوا تو سات بج چکے تھے۔ نمازِ فجر کا وقت نکل چکا تھا۔ ٹرین اُڑیسہ کی سرحد سے گزر رہی تھی۔ ایک نابینا آدمی ٹرین میں لاٹھی ٹیکتا ہوا سریلی آواز میں گا رہا تھا ''اولا دوالو! پھولو پھلو۔ بھوکے غریب کی یہی دعا ہے'' وہ ہاتھ آگے بڑھائے بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے کچھ روپے نکالے اور اسکے ہاتھ پہ رکھ دیئے۔ وہ راہ ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ کچھ ہی وقت کے بعد تیز ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر بوندا باندی شروع ہوگئی۔ ٹرین کی رفتار اچانک مدھم پڑ گئی۔ اب وہ میدانی علاقوں کو عبور کرتی ہوئی ایک کوہساری علاقے میں داخل ہوگئی تھی، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اسی دوران ٹرین میں مونگ پھلی بیچنے والے نے آواز دی

''مونگ پھلی کھالو، گرم تازہ مونگ پھلی''

میں نے اور میرے ساتھیوں نے دس دس روپے میں مونگ پھلی کے تین پیکٹ خریدے اور ایک اخبار پہ اکٹھے کھانے لگے۔ ہم مونگ پھلی کھاتے ہوئے سیاست، ادب اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہے۔ وقت معلوم کرنے کے لیے موبائل فون پہ نظر کی تو دو بجنے میں دس منٹ کم تھے۔ میں اٹھا وضو کیا اور نماز ظہر جونہی ادا کی تو عثمان انجم صاحب کا فون آیا۔ سلام وڈعا کے بعد میں نے اُنھیں بتایا کہ ٹرین ایک جنگلی علاقے سے گزر رہی ہے اور ساتھیوں کے کہنے کے مطابق یہاں سے وجے نگرم تین گھنٹے کا سفر ہے۔ عثمان انجم صاحب کو اس بات کا اطمینان ہوا کہ میں ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے وشاکھا پٹنم نہیں پہنچوں گا۔ ٹرین دُور آگے نکل جانے کے بعد

میدانی علاقے میں داخل ہوگئی۔ میرے ساتھ بیٹھے تینوں فوج کے سپاہی بڑے سیکولر اور خوش مزاج تھے۔ باتوں باتوں میں ہم بہت دُور آگے نکل آئے۔ ان تینوں کو وجے نگرم ریلوے اسٹیشن پہ اُتر جانا تھا۔ اُنھوں نے اپنا اپنا سامان سفر باندھا اور اُترنے کی تیاری کرنے لگے۔ بیس منٹ کے بعد وہ وجے نگرم ریلوئے اسٹیشن پہ اُتر گئے اور میں تنہا رہ گیا۔ میں نے نمازِ عصر ادا کی اور ذکراللہ میں مشغول ہوگیا۔ اسی دوران ٹی ٹی آیا اُس نے مجھ سے ٹکٹ مانگی، میں نے دکھائی پھر وہ دوسرے آدمی کے پاس گیا۔ اُس کے پاس جنرل ڈبے کا ٹکٹ تھا۔ ٹی ٹی کی باچھیں کھل گئیں وہ خوش ہوا۔ وہ آدمی منت سماجت کرنے لگا لیکن ٹی ٹی نے اسکی کوئی بھی بات نہیں مانی اور اُسے سات سو روپے جرمانہ کیا۔ وہ آدمی ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اب ٹرین وشاکھا پٹنم کی حدود میں داخل ہوگئی تھی اور سورج لال ٹکیا کی مانند قریب الغرُ وب تھا۔ شام کی سیاہی پھیلنے لگی۔ میں نے نماز کی نیت باندھی۔ نماز کے بعد میں نے عثمان انجم صاحب کو فون کیا اور اُنھیں یہ اطلاع دی کہ ان شااللہ میں ایک گھنٹے کے بعد وشاکھا پٹنم ریلوے اسٹیشن پہ پہنچ جاؤں گا لیکن ٹرین نہ جانے کیوں کچھوا چال چلنے لگی۔ خدا خدا کر کے میں رات کو نو بجے وشاکھا پٹنم ریلوے اسٹیشن سے پہلے ہی عثمان انجم صاحب کے کہنے پر گوپال پٹنم سٹاپ پہ اُتر گیا۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر آیا تو عثمان انجم صاحب نے مجھے دیکھ لیا بالمشافہ ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی۔ اُنھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ وہ موٹر سائکل پہ تھے۔ لمبے سفید بال، قد کاٹھی والے آدمی، رنگ سانولا، چہرے پہ نکھار۔ رفتار و گفتار میں اردو کی بہار۔ بڑے پرتپاک انداز میں مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ میں اُن کے ساتھ موٹر سائیکل پہ بیٹھ گیا اور ہم وشاکھا پٹنم شہر کی طرف نکل گئے۔ آسمان بالکل صاف تھا اور تارے جھلملا رہے تھے۔ موٹر سائیکل پہ سوار ہم دونوں کچھ ہی لمحوں میں لکشمی نگر کالونی پہنچ گئے۔ جی این ثانیہ ہومز نام کی ایک فلک بوس عمارت کے سامنے رک گئے۔ گیٹ کیپر آیا، اُس نے گیٹ کھولا اور ہم اندر

چلے گئے۔ عثمان صاحب نے موٹر سائیکل ایک جانب پارک کیا اور ہم لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پہ پہنچ گئے۔ فلیٹ نمبر 204 عثمان انجم صاحب کا اپنا فلیٹ ہے۔ دیکھ کے میرا دل خوش ہوا۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ کھانا تیار تھا۔ میں نے وضو کیا۔ نمازِ عشا پڑھی اور اُس کے بعد کھانا کھایا۔ وشا کھا پٹنم کی لذیذ بریانی، نان اور گوشت کھایا تو بہت مزہ آیا۔ رات کو تقریباً ہم سوا گیارہ بجے سوئے۔ صبح نمازِ فجر وقت پہ پڑھنا نصیب ہوا۔ ناشتے کے بعد عثمان انجم صاحب نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور ہم دونوں آنے والے کل یعنی 2 جولائی 2017ء کے قومی سیمی نار کی تیاری میں لگ گئے۔ ہمارے علاوہ عثمان انجم صاحب کے برادر نسبتی محمد معیز خان اور اُن کے پوتے محمد سہراب عرف چاند نے بھی بہت کام کیا۔ وشا کھا پٹنم شہر اب میری نگاہوں میں تھا۔ انتہائی خوبصورت اور صاف ستھرا شہر دیکھ میرا دل خوش ہوا اور رُوح کو تازگی حاصل ہوئی۔ مجھے اِس شہر کو دیکھ کے چنڈی گڑھ شہر یاد آ گیا۔ سیمینار کے شرکاء کے قیام وطعام کا انتظام وشا کھا پٹنم کے ایک مشہور ہوٹل سائی پیلس میں کیا گیا تھا۔ تیسری منزل پہ ہم سب شعرا و ادبا ٹھہرائے گئے۔ کلکتہ کے کہنہ مشق شاعر جناب صابر حلیم، جناب شان بھارتی (جھارکھنڈ) جناب ڈاکٹر احسان عالم (بہار) جناب محمد متین ندوی (مدھیہ پردیش) جناب امتیاز احمد راشد (مغربی بنگال) جناب اقبال حسین (جھارکھنڈ) اور جناب رئیس اعظم (کلکتہ) میرے ہم کمرہ تھے۔ ہم ادیبوں اور شاعروں کی ایک نرالی دنیا ہوتی ہے۔ ایک طرح کے جذبات واحساسات کے کھلاڑی۔ جو شخص جذبات واحساسات کا کھیل کھیلنے میں جتنا زیادہ ماہر ہوتا ہے۔ وہ اتنا ہی مشہور ومقبول ہوتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر اگر یوں کہیں کہ شاعر اور ادیب الفاظ کے جادوگر ہوتے ہیں تو موزوں ہوگا۔ کون کیا لکھتا ہے؟ کیسا لکھتا ہے؟ کیا لکھنا چاہیے اور کیا نہیں لکھنا چاہیے؟ ادب کے اِن تمام اہم امور پر ہماری گفتگو ہوتی رہی۔

دوسرے دن یعنی 2 جولائی 2017ء کو سیمینار تھا اور اُسی روز شام کو مشاعرہ بھی

تھا۔ پورے دس بجے سیمینار شروع ہوا۔ عثمان انجم صاحب نہایت فعال اور متحرک علمی وادبی شخصیت تھے۔ اُن کی اردو دوستی کا یہ عالم دیکھنے میں آیا کہ وشاکھا پٹنم جیسے غیر اُردو داں علاقے میں وہ اکیلے اُردو کی جوت جلائے بیٹھے تھے۔ اردو زبان وادب کی آبیاری اور اسکے فروغ کے لیے وہ تقریباً چھبیس برس سے مسلسل اُردو کا ایک معیاری سہ ماہی رسالہ ''اصنام شکن'' نکالتے آرہے تھے۔ اُن کی اس اردو دوستی پہ اُنھیں جتنی زیادہ داد دی جائے وہ کم ہوگی۔ اُنھوں نے اُردو کے قد آور ادیبوں کی مشاورت سے فیض حاصل کیا ہے۔ ایک اکیلا آدمی کہ جس میں اُردو کا ذوق وشوق اس قدر پروان چڑھا ہو کہ اردو کے لیے وہ سب کچھ نچھاور کردینے کو تیار بیٹھا ہو۔ وہ اُردو کا دیوانہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اُنھوں نے ''اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت'' کے موضوع پہ یک روزہ قومی سیمینار کروایا کہ جس کی صدارت کے فرائض کلکتہ کے اُستاذ الشعراء جناب صابر حلیم نے انجام دیے۔ ایوان صدارت میں وشاکھاپٹنم کی ایک بزرگ ہستی جناب اقتدار حسین، جناب پروفیسر محمد اقبال آندھرا یونی ورسٹی اور خود جناب عثمان انجم موجود تھے۔ نظامت کے فرائض میں نے انجام دیے تھے۔ تلاوت کلام پاک سے سیمینار کا آغاز ہوا پھر صابر حلیم صاحب سے نعت شریف کی فرمائش کی گئی۔ اُنھوں نے بڑی مترنم آواز میں نعت شریف سے سامعین کو محظوظ کیا۔ جناب اقتدار حسین نے خطبۂ استقبالیہ دیا اور مولانا بشیر القادری صاحب نے وشاکھاپٹنم میں اُردو کی صورت حال پر اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کیا۔ اسکے بعد مقالہ نگار حضرات کو یکے بعد دیگرے اپنا اپنا مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر احسان عالم نے پیش کیا جس کا عنوان تھا ''بہار میں اردو تنقید کی پیش رفت'' اُن کے بعد جناب محمد متین ندوی نے ''مدھیہ پردیش میں اردو تنقید کی پیش رفت'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ جناب امتیاز احمد راشد نے ''مغربی بنگال میں اردو تنقید کی پیش رفت'' ڈاکٹر اقبال حسین نے ''جھارکھنڈ میں اردو تنقید کی پیش رفت'' اور میں نے ''جموں وکشمیر میں اردو

تنقید کی پیش رفت'' کے عنوان سے اپنا مقالہ سامعین کی نذر کیا۔ اس کے بعد ایوان صدارت میں تشریف فرما معزز حضرات نے سیمینار سے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور آخر پہ جناب عثمان انجم نے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح وشاکھا پٹنم کی سرزمین پہ یہ یک روزہ قومی سیمی نار جناب عثمان انجم کی مساعئ جمیلہ سے نہایت مفید اور کامیاب قرار پایا تھا۔

دن کو پانچ بجے کے قریب میں، جناب صابر حلیم، جناب رئیس اعظم اور عثمان انجم صاحب سمندر دیکھنے گئے۔ سمندر سے کچھ دُور اُوپر پہاڑی پر حضرت اسحاق مدنی کی زیارت دیکھی۔ وشاکھا پٹنم کی وجہ تسمیہ اُنہی کے نام سے منسوب ہے۔ تاریخی روایت میں یہ بات شامل ہے کہ مغل تاجدار اورنگ زیب، حضرت اسحاق مدنی سے ملنے وشاکھا پٹنم آئے تھے اور یہاں عالم گیری مسجد تعمیر کروائی تھی۔ فشنگ ہاربر میں الگ الگ قسم کی مچھلیوں کے ڈھیر دیکھ کے میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی۔ خالق کائنات کا نظام عالم بڑا عجیب وغریب ہے۔ وشاکھا پٹنم کے ہزاروں لوگوں کی روزی روٹی کا مسئلہ مچھلیوں کی تجارت سے جڑا ہوا ہے۔ فیشنگ ہابر دیکھنے کے بعد ہم وشاکھا پٹنم کا ایکوریم دیکھنے گئے۔ وہاں ایک عجیب وغریب قسم کی زندہ مچھلیوں کی دنیا دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ سب دیکھ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا ؎

ہو شکر تیرا ہر دم دنیا بنانے والے
دنیا میں رنگ برنگی بستی بسانے والے

ایکوریم دیکھنے کے بعد ہم سائی پیلس چلے آئے تھے۔ رات کو آٹھ بجے مشاعرہ شروع ہوا تھا۔ جناب شان بھارتی نے مشاعرے کی صدارت فرمائی تھی اور نظامت کے فرائض جناب اطیب اعجاز (حیدرآباد) نے انجام دیے تھے۔ اس مشاعرے میں وشاکھا پٹنم اور بیرون وشاکھا پٹنم کے ہندو، مسلم، شعرا کے علاوہ سکھ برادری کے اہل ثروت لوگوں نے بھی شرکت کی تھی۔ رات کے ساڑھے دس بجے کے

قریب مشاعرہ اختتام پذیر ہوا تھا۔ میں نے رات کو ہی تمام ساتھیوں سے گلے لگ کے رخصت لی تھی۔

دوسرے دن 3 جولائی 2017ء کو صبح ساڑھے سات بجے میں ریلوے اسٹیشن آ گیا تھا۔عثمان انجم صاحب کے برادر نسبتی جناب محمد معیز خان مجھے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے تھے۔ میں ٹرین میں بیٹھ گیا تھا۔ آٹھ بجکر بیس منٹ پہ میری ٹرین دہلی کے لیے روانہ ہوگئی تھی اور میں نے ''سب کی ماں'' نام کی ایک کہانی لکھنا شروع کی تھی۔ میرے کیبن میں سامنے سیٹ پہ ایک غیر مسلم نوجوان فوجی، اُسکی بیوی اور اُن کے دو چھوٹے چھوٹے بچّے بیٹھ گئے تھے۔ وہ فوجی نوجوان مدراس کا رہنے والا تھا۔ وشاکھا پٹنم میں تین سال ڈیوٹی دینے کے بعد اُس کی ٹرانسفر دہلی ہوگئی تھی۔ اُن دونوں میاں بیوی کو رخصت کرنے کچھ عورتیں اور مرد آئے ہوئے تھے۔ سامان اُن کے پاس بہت زیادہ تھا۔ جب ٹرین وشاکھا پٹنم ریلوے اسٹیشن سے چل پڑی تو اُس فوجی نوجوان سے متعارف ہونے کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ سوشیالوجی میں ایم اے ہے اور اُس کی بیوی کامرس میں ایم اے ہے۔ مجھے وہ دونوں نہایت مہذّب معلوم ہوئے تھے۔ دورانِ سفر اُس فوجی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ راجوری اور پونچھ کے سرحدی علاقوں میں ڈیوٹی دے چکا ہے۔ دن کو ایک بجے کے قریب جب وہ کھانا کھانے لگے تو میرے منع کرنے کے باوجود اُنھوں نے میرے لیے بھی پلیٹ میں میٹھے چاول ڈال دئے تھے۔ میں نے بغیر کسی چھوت چھات کے وہ چاول کھا لیے تھے اور اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ وہ دونوں مجھے بھیا بھیا کہہ کر پکارتے رہے۔ جونہی میری نماز کا وقت آتا تو وہ بڑے ادب واحترام کے ساتھ خاموش اپنے بچّوں کے ساتھ ایک طرف بیٹھ جاتے۔ تب تک کوئی بھی بات نہیں کرتے جب تک میں نماز سے فارغ نہ ہوتا۔ میرے خیال میں یہ نہ صرف خیال ہے بلکہ سچائی ہے کہ ہم مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، جین، بدھ اور دوسرے عقیدوں کے لوگ بعد میں ہو سکتے ہیں، پہلے ہمارا انسانی

اوصاف حمیدہ سے متصف ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ ایمان میں داخل ہونے کے لیے انسان ہونا شرط ہے۔ حیوانوں کو ایمان جیسی عظیم دولت نصیب نہیں ہے۔
4 جولائی 2017ء کو تقریباً سات بجے کے قریب شام کو میں نظام الدّین ریلوے اسٹیشن پہ ٹرین سے اتر گیا تھا۔ پرانی دہلی سے کٹرہ ویشنو دیوی جانے والی میری ٹرین سمپرک کرانتی کا وقت رات ساڑھے دس بجے تھا۔ میں چھوٹی گاڑی میں بیٹھا اور ایک گھنٹے میں پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ میں پلیٹ فارم نمبر ایک پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک کہیں سے ہجڑوں کی ٹولی آگئی، چہرہ مردوں جیسا اور سراپا عورتوں جیسا۔ چھوٹے چھوٹے پرس کندھوں سے لٹکائے۔ مخصوص انداز میں تالیاں پیٹنے لگے۔ اسٹیشن پہ بیٹھے لوگوں سے بھیک مانگتے ہوئے گزر گئے تھے۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی، اپنے وجود پہ نظر دوڑائی تھی اور خداوند کریم کی گوناگوں نعمتوں کو یاد کر کے میرا سرنگوں ہوا تھا۔ تھوڑے وقت کے بعد ایک عورت ڈھولکی لے کر آگئی تھی اُس کے ساتھ کوئی آٹھ سال کا لڑکا تھا۔ عورت بیچ پلیٹ فارم پہ بیٹھ کے مخصوص تال میں ڈھولکی بجانے لگی تھی اور لڑکا عجیب طرح کی قلابازیاں دکھانے لگا تھا۔ جب وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا تو کشکول قسم کا ایک برتن ہاتھ میں لے کے بھیک مانگنے لگا تھا۔ پاپی پیٹ آدمی سے کیا کیا کرواتا ہے۔ میں یہ سوچ کے دنگ رہ گیا تھا۔ یہ پاپی پیٹ کب کس سے کیا کروائے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ مجھے غالبؔ کے اس شعر کا قائل ہونا پڑا کہ ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

جموں جانے والی ٹرین سمپرک کرانتی اپنے صحیح وقت پہ پلیٹ فارم نمبر ایک پر آگئی تھی اور میں اُس پہ سوار ہوا تھا۔ لوگوں کی اپنی سیٹ پہ بیٹھنے کی بھگدڑ شروع ہوئی تھی۔ رات کے دس بج کر چالیس منٹ پہ ٹرین چل پڑی تھی۔ نماز عشا میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ تھکان کی وجہ سے جب نیند میری آنکھوں میں اُتر آئی تھی تو میں سو گیا تھا۔

دوسرے دن صبح پانچ بجے کے آس پاس جالندھر کے قریب میری نیند کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ نماز فجر پڑھنے کے بعد پھر لیٹ گیا تھا۔ ہیرانگر پہنچ کے جاگ آئی تھی۔ گھر میں اہلیہ کو فون کیا تھا۔ خیریت معلوم کی تھی۔ بیٹے کو ریلوے اسٹیشن بلایا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ٹرین جموں ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی تھی اور میں نے اسی سفر کے دوران کہانی ''سب کی ماں'' لکھ ڈالی تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی میرا بیٹا گاڑی میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے میرا سامان گاڑی میں رکھا تھا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور آدھے گھنٹے میں ہم اپنے گھر سنجواں (جموں) پہنچ گئے تھے۔ گیٹ پہ پہنچتے ہی اپنی اہلیہ اور بچّوں کو دیکھا تھا، گھر آنگن پہ نظر دوڑائی تھی تو دل خوش ہوا تھا۔ اہلیہ اور بچّے بھی مجھے دیکھ کے بہت خوش ہوئے تھے۔ پھر میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ میں آج پورے ایک ہفتے کے بعد وشاکھا پٹنم سے گھر لوٹا ہوں لیکن ایک دن جب میرا سفر ملک عدم کی طرف شروع ہوگا تو پھر واپس گھر نہیں آؤں گا!

....

8 جولائی 2017ء اور 30 دسمبر 2017ء کو مجھے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی جانب سے کٹھوعہ کے ایک کمپیوٹر سینٹر میں امتحان کے دوران بحیثیت معائنہ کار تعینات کیا گیا تھا۔ ان دونوں دنوں میں، میں نے بڑی ایمانداری اور خوش اسلوبی کے ساتھ ڈیوٹی انجام دی تھی۔ کٹھوعہ میں بریام منڈے نام کا ایک نوجوان اور اُس کی اہلیہ کمپیوٹر سینٹر چلاتے ہیں۔ میں امتحان کی مقررہ تاریخ سے پہلے ہی ایک دن رات کو اپنے دوست ڈاکٹر کرن سنگھ کے گھر چلا گیا تھا۔ کٹھوعہ میں میرے چاہنے والے میرے دوست ڈاکٹر لیش پال شرما اور ڈاکٹر کرن سنگھ ہیں۔ لیش پال شرما کالج میں اردو کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں اور ڈاکٹر کرن سنگھ ہائر اسکنڈری اسکول میں لکچرر ہیں۔ میرے یہ دونوں دوست اردو کے شیدائی اور بڑے سچے اچھے انسان ہیں۔ میں نے دو راتیں ڈاکٹر کرن سنگھ کے گھر میں کاٹی ہیں۔ ڈاکٹر کرن شاعری بھی کرتا ہے اور

نثر بھی لکھتا ہے۔ جب وہ کسی بات پر ہنستا ہے تو بھر پور قہقہے کے ساتھ ہنستا ہے۔ ان دونوں دوستوں نے مجھے آج تک بہت عزت واحترام کی نظر سے دیکھا ہے۔ کٹھوعہ صوبہ جموں کا ایک بڑا اور پرانا ضلع ہے جس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔

....

11 جولائی 2018ء کو میرے بچّوں کے نانا جناب محمد اقبال مغل ساکنہ چھنی (ضلع ادھم پور) اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ وہ انتہائی شریف، نیک، مخلص اور محنتی انسان تھے۔ سب کا خیال رکھنے والے، پورے قصبہ چھنی کے لوگ بلالحاظ مذہب وملّت اُنھیں بہت پسند کرتے تھے۔ تقریباً تیس سال تک اُنھوں نے محکمہ مچھلی پالن میں سروس کی اور آخری برسوں میں وہ انسپکٹر کی پوسٹ سے سبکدوش ہوئے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اُن سے وابستہ یادیں مجھے کبھی کبھی اُداس کرتی ہیں۔ اللہ اُنھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین! میرے بچّوں کی نانی اماں محترمہ محمودہ بیگم بھی بہت شریف، سیدھی سادی اور ہمدرد ہیں۔ میرے بچّوں کی نگہداشت اور پرورش میں اُنھوں نے اہم کردار نبھایا ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میری ترقی، کامیابی اور خوشحالی میں جہاں میرے والدین کی دعائیں شامل حال رہی ہیں۔ تو وہیں میرے سسرال والوں نے بھی میرا ہر طرح سے ساتھ دیا ہے۔ اللہ میرے بچّوں کی نانی کو صحت وتندرستی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔ آمین! یہاں میں اپنے قارئین کی معلومات کے لئے تحریر کرنا لازمی سمجھتا ہوں کہ میری اہلیہ کی چار بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ اُن کی بھابی کا نام تسلیم بانو ہے۔ بہنیں سب اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ میری اہلیہ کی سب سے بڑی بہن کا نام شبنم ہے۔ اُس سے چھوٹی میری اہلیہ ہے۔ اُس سے چھوٹی بہن کا نام سمینہ ہے۔ اُس سے چھوٹی سعیدہ ہے اور اُس سے چھوٹی نازیہ ہے۔ میری اہلیہ کے خالہ زاد بھائیوں میں ڈاکٹر محمد یٰسین جو اس وقت ڈپٹی چیف

میڈیکل آفیسر ادھم میں تعینات ہیں۔اُن کے چھوٹے بھائی محمد سلیم نائب تحصیلدار ہیں وہ بھی ادھم پور ہی میں اپنی ملازمت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔وہ میرے ہم زلف بھی ہیں۔اُن کے علاوہ ماسٹر محمد طارق ساکنہ لاٹی دھونہ، محمد ایوب ملک ساکنہ لاٹی دھونہ اور عبدالحق تانترے ساکنہ روحامہ ضلع بارہمولہ(کشمیر) یہ سب میرے ہم زلف ہیں۔محمد ارشد نائیک میری اہلیہ کی سب سے بڑی خالہ کا بیٹا ہے۔نہایت خوش اخلاق اور ملنسار ہے۔اللہ سب کو ایمان، تندرستی اور کامیابی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے!۔

....

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کا ماحول مجھے راس آیا۔آٹھ ماہ تک میں یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا، اُس کے بعد مجھے بی جی آرسی ہوسٹل کے کمرہ نمبر 202 میں رہنے کا موقع ملا۔کوئی تین ماہ اس ہوسٹل میں رہنے کے بعد میں علامہ اقبال ہوسٹل کے کمرہ نمبر 406 میں آ گیا۔ اسی کمرے میں، میں نے ''ڈراوانی آوازیں'' سماج ''میرا کام تیرے نام'' اور ''میں ہوشیار پوری ہوں'' جیسی کہانیاں لکھیں۔ کچھ وقت کے بعد جب مجھے مولانا آزاد ہوسٹل کا وارڈن بنایا گیا تو میں اس ہوسٹل کے کمرہ نمبر 105 میں آ گیا۔اسی کمرے میں رہتے ہوئے میں نے متعدد تحقیقی وتنقیدی مضامین اور کہانیاں لکھیں۔اپنے معنوی اُستاد پروفیسر حامدی کاشمیری کی اس دارِ فانی سے رخصت ہونے کی مایوس کُن خبر سُنی۔اُن سے جڑی کئی یادیں، باتیں اور اُن کی مجھ پہ شفقتیں میں کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔تبدیلی، وقت کا دوسرا نام ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں وقت کی قسم کھائی ہے۔ یہ وقت ہی ہے جو ہمیں بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے اور بالآخر موت کی آغوش میں سُلا دیتا ہے۔زندگی ایک غیر یقینی سفر ہے اس لیے کہ زندگی کب، کہاں اور کن حالات میں کس کا ساتھ چھوڑ دے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔موت پہ انسان کی کاوشوں، خواہشوں اور حرکت وعمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔وقت کے ساتھ ہر چیز ختم ہو جاتی ہے اور اگر

کوئی چیز باقی رہتی ہے یا انسان کے دنیا سے گزرنے کے بعد اُس کے ساتھ جاتی ہے تو وہ اُس کے اچھے یا بُرے اعمال ہیں۔ دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر شخص اپنا اچھا یا بُرا رول ادا کر کے موت کے پردے کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ بہت زیادہ قیمتی ہے کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ یادیں انسان کے شعور، تحت الشعور اور لاشعور کا ایک اہم حصہ ہوتی ہیں۔ اہم شخصیات کے ساتھ گزارے لمحے تو انسان بھلائے نہیں بھول پاتا ہے۔ اُن کی سبق آموز باتیں، اُن سے ملاقاتیں اور اُن کی متانت وسنجیدگی انسان کو سلیقۂ زندگی سکھا دیتی ہیں اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوتی ہیں تو اُن کی یادوں کے نقوش ذہن و دل میں چراغاں بن کر اُن کی یاد میں آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہیں۔ حامدی کاشمیری کا شمار بھی اُنہی اہم اور نابغۂ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری اس جہان فانی سے 27 دسمبر 2018ء بروز بدھ وار شب بوقت 9 بج کر 45 منٹ پر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ جانے والے تو نہیں آتے، جانے والوں کی یاد آتی ہے۔ میں نے جب 27 دسمبر 2018ء کو سرینگر کے میرے ایک دوست جناب شبیر صاحب (میزان پبلشرز) کی میرے واٹس ایپ پہ بھیجی یہ مایوس کُن خبر پڑھی کہ ہماری ریاست کے ایک عظیم شاعر، نقاد، محقق اور فکشن نگار پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب اس دنیا میں نہیں رہے تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرے پورے وجود میں مایوسی کی اک لہر سی دوڑ گئی۔ اپنے کئی دوست واحباب کو یہ مایوس کُن خبر سنائی۔ جس کسی نے سُنی اُس نے افسوس کا اظہار کیا۔ اردو شعر وادب کی ایک ایسی عظیم شخصیت کہ جسے اردو دنیا پروفیسر حامدی کاشمیری کے نام سے جانتی ہے اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اُن کا شعری وادبی سرمایہ اور اُن کی قد آور شخصیت کے تابناک پہلو اُنھیں زندہ جاوید رکھیں گے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری میرے معنوی استاد تھے۔ ماضی کے دریچوں سے

جب جھانکتا ہوں تو اُن سے جڑی کئی یادیں میرے سمندِ تخیل پر تازیانہ لگانے لگتی ہیں۔
میں نے اسکول اور کالج کے زمانے میں ہی اُن کی غزلیں، مضامین اور کہانیاں پڑھنا شروع کی تھیں۔ میرے ذوقِ مطالعہ اور شوقِ تحریر نے مجھے اُن کی کتابیں خرید کر پڑھنے پر آمادہ کیا۔ یہاں میں یہ لکھے بغیر آگے بڑھنا نہیں چاہتا کہ پروفیسر حامدی کاشمیری اور اُن کے معاصرین میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر ظہورالدّین، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر عتیق اللہ، قاضی افضال حسین اور وزیر آغا کے علاوہ کچھ اور بھی اہم نام ہیں کہ جن کی تصنیفات و تالیفات کا مطالعہ کرنا میرے ادبی مشغلے میں شامل رہا ہے۔

یہ غالباً 1983ء کی بات ہے کہ جب میں گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ (ضلع ڈوڈہ) میں بی اے سال اوّل کا طالب علم تھا تو میں نے حامدی صاحب کے نام ایک خط لکھا جس میں، میں نے اُن سے فنِ تحریر کے بارے میں مکمل واقفیت بہم پہنچانے کی استدعا کی تھی۔ کوئی بیس دن کے بعد مجھے اُن کی جانب سے بذریعہ ڈاک ایک خط موصول ہوا جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ

> ''لکھنا انسان کا ایک فطری عمل ہے۔ میں آپ کے شوق اور جذبے کی قدر کرتا ہوں اور یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ زیادہ سے زیادہ بڑے ادیبوں کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے''

اُن کے ذرّیں جملوں کو میں نے اپنے ذہن و دل میں نہ صرف جگہ دی بلکہ اُن پہ عمل پیرا بھی ہوا۔ خوب سے خوب تر کی جستجو نے مجھے غائبانہ طور پر پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب کے قریب کر دیا۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وہ میرے خطوط کا جواب دیتے۔ اُن خطوط میں اُن کا خلوص، محبت و اپنائیت اور علم و ادب کی دنیا میں مجھے آگے بڑھنے کے مشورے ہوتے۔ بھدرواہ کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد بھی حامدی صاحب کے ساتھ میری خط و کتابت جاری رہی۔ اُسی دوران آنجہانی

ڈاکٹر برج پریمی کے افسانے جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی سے شائع ہونے والے موقر ومعیاری رسالہ ''شیرازہ'' میں پڑھنے کا موقع ملا تو اُن سے بھی خطوط کے ذریعے آدھی ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔

1987ء میں جب میں اسکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ٹیچر بھرتی ہوا اور میری ڈیوٹی اپنے آبائی گاؤں بہوتہ (ضلع ڈوڈہ) کے مڈل اسکول میں لگائی گئی تو میں نے اسی دوران حامدی صاحب کی تنقیدی کتاب ''غالب کے تخلیقی سرچشمے'' چند دنوں میں پڑھ ڈالی۔ کتاب پڑھنے کے بعد میں نے حامدی صاحب کے نام خط لکھا جس میں اُن کے عالمانہ انداز بیاں کا خصوصی ذکر تھا۔ اُنھوں نے ایک پوسٹ کارڈ کی صورت میں میرے خط کا جواب دیا تھا۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہوئی تھی کہ اُنھوں نے مجھ جیسے معمولی آدمی کے خط کا جواب دیا۔ اُس زمانے میں موبائل فون تو دُور کی بات، لینڈ لائن فون بھی نہیں ہوا کرتے تھے سوائے بڑے پوسٹ آفسوں یا کسی بڑے آفیسر کے دفتر کے۔ 1989ء میں جب میں گورنمنٹ مڈل اسکول بہوتہ سے گورنمنٹ ہائی اسکول بلند پُور آیا تو دو ماہ کے بعد ڈسٹرکٹ لائبریری اُدھم پور میں مجھے حامدی کاشمیری صاحب کی کتاب ''جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات'' دستیاب ہوئی یہ اُن کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ تھا جو کتابی صورت میں تھا۔ میں نے اس کتاب کو بڑے شوق اور ذہنی یکسوئی سے پڑھا۔ پڑھنے کے بعد میں نے اپنے گھر ماتلائی، تحصیل چھنینی سے اُنھیں خط لکھا جس میں کتاب کی پسندیدگی کا اظہار تھا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے اُن کا خط موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے مجھے کشمیر یونیورسٹی میں آکر ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بہرحال میں نے اس بات کو اپنی سعادت مندی سمجھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں ستمبر 1989ء میں بلند پور ہائی اسکول سے اُن سے ملاقات کے لیے سرینگر چلا گیا۔ سرینگر پہنچ کر میں سیدھا یونیورسٹی گیا وہ اُن دنوں شعبۂ اُردو کے صدر تھے۔ میں اُن کے آفس میں گیا تو وہ اُس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ اُن کے چپراسی

نے مجھے کہا کہ حامدی صاحب کسی کام سے یونیورسٹی کے انتظامیہ بلاک میں گئے ہیں۔آپ بیٹھے رہیے وہ آتے ہی ہوں گے۔کوئی آدھے گھنٹے کے بعد پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب آگئے۔ دراز قد، نُورانی آنکھیں، سڈول جسم، لمبے ہاتھ اور رفتار وگفتار میں وہی ادیبانہ طمطراق۔یہ میری حامدی صاحب سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔ اجنبیت کا پردہ لمحہ بھر کے لیے میرے اور اُن کے درمیان حائل رہا۔دُعاوسلام کے بعد جب میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ میں تحصیل چھنی ،ضلع ادھم پور کا باشندہ ہوں آپ سے ملاقات کرنے آیا ہوں تو کہنے لگے

''چھنی میں میرا ایک قلمی دوست ہے،اس کا نام مشتاق احمد وانی ہے''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا

''وہ معمولی آدمی میں ہی ہوں۔آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں''

حامدی صاحب فوراً اپنی کرسی سے کھڑے ہوگئے۔ مجھے گلے لگایا۔ بہت خوش ہوئے۔چائے منگوائی پھر کہنے لگے

''اب میں زیادہ تر تنقید لکھتا ہوں اور شاعری کرتا ہوں''

میں نے اپنی معلومات کے لیےاُن سے کچھ سوالات بھی کیے۔اُنھوں نے خندہ پیشانی سے تسلی بخش جوابات دیے۔میں جب اُن سے رخصت ہونے لگا تو کہنے لگے

''ٹھہر جائیے''

اُنھوں نے ''انجمن آرزو'' نام کی ایک کتاب الماری سے نکالی اور مجھے دی۔ جناب حامدی کاشمیری کچھ ہی دن پہلے ہندوستانی ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ پاکستان سے لوٹے تھے۔مذکورہ کتاب کاتعلق رُوداد سے تھا۔

شب وروز کے بھنور میں الجھنے اور 1992ء تک ماہانہ تنخواہ 1700 روپے کے باوجود میں نے جہاں اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ہندوستان کے پبلشروں سے اردو کے معتبر ومعیاری ادیبوں کی کتابیں خرید کر پڑھیں،وہیں پروفیسر حامدی کاشمیری

کی بھی بہت سی کتابیں خرید کر پڑھتا رہا۔ میری خوشی کی اُس وقت کوئی انتہا نہ رہتی جب میرا کوئی افسانہ یا تحقیقی وتنقیدی مضمون اردو کے کسی موقر ومعیاری رسالے میں شائع ہوتا اور مجھے حامدی صاحب کا فون آتا کہ اُنھیں میری ادبی نگارشات نے متاثر کیا۔ وہ اکتشافی تنقید کے موجد اور علمبردار تھے۔ روایتی تنقید سے وہ بہت حد تک نالاں تھے۔ تخلیق اور تخلیقیت میں تخلیق کار کے تجربے کا عمل دخل اور لفظ ومعنی کے تفاعل پر اُن کا تنقیدی نظریہ ادبی حلقوں میں کافی موضوع بحث رہا لیکن اُنھوں نے اپنے نظریے کی حمایت میں اپنی تھیوری بھی پیش کی۔

حامدی کاشمیری ایک مرنجان مرنج شخصیت تھے۔ لکھنے پڑھنے والوں کو وہ بہت چاہتے تھے۔ اردو کے تمام معیاری رسائل وجرائد میں اُن کے مضامین اور غزلیں تادم آخر شائع ہوتی رہیں۔ لکھنے پڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور اُن کے روشن مستقبل کی خاطر وہ اپنی استعداد کے مطابق کوشش کرتے۔ مجھے وہ اکثر بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔ میری حق تلفیوں پہ وہ کافی رنجیدہ ہوتے رہے۔ جموں، نجواں میں میرے مکان سے اُن کا مکان تقریباً ڈیڑھ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ سردیوں میں جب حامدی کاشمیری صاحب جموں اپنے مکان میں آتے تو میں اُن کے پاس جاتا۔ بہت خوش ہوتے۔ غالباً 2013ء میں، میں نے اُنھیں نجواں اپنے مکان میں لایا۔ بیوی بچّوں سے ملے، مکان دیکھا بہت خوش ہوئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ میرے گھر پہ رہے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے نشیب وفراز مجھے سنائے۔

2015ء میں جب میں کسی ضروری کام کے سلسلے میں سرینگر گیا تو حامدی صاحب سے میری فون پہ بات ہوئی۔ اُنھوں نے مجھے اپنے گھر پہ آنے کا اصرار کیا۔ شالیمار میں کوہ سبز نام کے ایک دلکش علاقے میں اُن کا عالیشان مکان ہے۔ میں اُن کے پاس چلا گیا۔ پُرتپاک انداز میں مجھ سے ملے۔ چائے پلائی، بہت سی ادبی باتیں ہوئیں۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اُن سے رخصت چاہی تو خفا ہونے لگے بولے

''آج میرے پاس ٹھہریے''

میرے ہاتھ سے میرا بیگ چھڑایا اندر لے جا کر ایک طرف رکھا اور کہنے لگے

''شام ہونے جا رہی ہے بیٹھیے، یہ کشمیر ہے یہاں کب کیا ہو حالات کیا رُخ اختیار کریں گے کچھ کہا نہیں جا سکتا''

میں نے اپنی کئی مجبوریاں اُن کے سامنے رکھیں لیکن اُنھوں نے میری کوئی بھی بات نہیں مانی۔ مجھے مجبوراً اُن کے ہاں رُکنا پڑا۔

رات کو مجھے اپنی لائبریری کی سیر کرائی۔ قدیم و جدید کتابوں اور رسائل و جرائد کی ایک دُنیا میرے سامنے تھی۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کے حیرت میں پڑ گیا۔ پھر بولے

''پڑھنا اور لکھنا میری روحانی غذا ہے۔ میں ہر روز کچھ نہ کچھ لکھتا اور پڑھتا ہوں''

دوسرے دن جب میں اُن سے رخصت ہونے لگا تو میرے ساتھ اپنے گھر کے لان سے باہر ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے

''اب میں عمر کی حدیں پھلانگتے ہوئے کافی دُور آگے نکل آیا ہوں۔ میں نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی ہے کہ میری آخری آرام گاہ اُس جگہ بنائیں''

مجھے حامدی صاحب کی یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اُن کی سنجیدگی اور جہاندہ ذہنیت کا ایک نیا ورق سمجھنے کا موقع ملا تھا۔

دسمبر 2016ء میں، جب میں نے پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب کو فون پہ یہ خوشخبری سنائی کہ میں نے ہائی کورٹ جموں سے کیس جیت لیا ہے اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر اردو جوائن کر لیا ہے تو وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سمائے۔ کہنے لگے

''آج کا دن میرے لیے خوشی کا دن ہے۔ اللہ نے آپ کی مدد کی۔
وہ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا''

حالانکہ ضعف اور رعشہ کی وجہ سے اُنھیں بات کرنے میں دقت آتی تھی لیکن اس کے باوجود باہوش انداز میں باتیں کرتے رہے۔ 2017ء میں میری فون پہ اُن سے دو تین بار باتیں ہوئیں لیکن وہ اچھی طرح باتیں نہیں کر پائے۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والی بات کہ بالآخر وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے اس دار فانی سے رخصت ہو گئے! میں ہر ممکن کوشش کے باوجود اُن کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا! مجھے اُن کے آخری دیدار نصیب نہیں ہو سکے۔ اس بات کا مجھے افسوس ہے! کبھی کبھی اس سوچ میں پڑھ جاتا ہوں کہ ہم کہاں سے اِس دنیا میں آتے ہیں؟ یہاں کیا کیا کرتے ہیں اور پھر آخر کار کہاں چلے جاتے ہیں! میرا یقین یہ چیخ چیخ کے کہہ رہا ہے کہ جس طرح دوسرا میر تقی میر، غالب واقبال پیدا نہیں ہوگا اُسی طرح اُردو میں دوسرا پروفیسر حامدی کاشمیری پیدا نہیں ہوگا۔ میری یہ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر حامدی کاشمیری کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اُن کے لواحقین کو صبر جمیل!

....

فروری 2019ء کی صبح کو میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں وکشمیر) کے مولانا آزاد ہوسٹل کے کمرہ نمبر 105 میں بیٹھا لکھنے پڑھنے میں مصروف تھا اور کچھ ہی وقت کے بعد مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ چلے جانا تھا کہ اسی دوران جناب پروفیسر قدوس جاوید نے مجھے یہ مایوس کُن خبر سُنائی کہ پروفیسر ظہورالدّین صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے! مجھ پہ لمحہ بھر کے لیے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ دل میں غم کی اک ہوک سی اُٹھی۔ یہ احساس رگ رگ میں اُتر گیا کہ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف سے آئے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے۔ میں نے اپنے بہت سے دوست واحباب کو یہ مایوس کُن خبر سُنائی۔ میں تیار ہوا، اپنی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا جموں کی طرف روانہ

ہوگیا۔نوشہرہ کے قریب پہنچا تو دہلی سے جناب ڈاکٹر مشتاق قادری کا فون آیا، اُنھوں نے بھی استادمحترم پروفیسر ظہورالدّین کے گزرجانے کا دُکھ ظاہر کیا۔سندربنی کے نزدیک پہنچا تو میری اہلیہ نے مجھےفون پہ یہ اطلاع دی کہ جنازہ پانچ بجے ریہاڑی قبرستان (جموں) میں رکھا گیا ہے۔میرے دوست ڈاکٹر عبدالحق نعیمی سے بھی اس بات کی تصدیق ہوئی کہ جنازہ پانچ بجے ہوگا۔ میں نے گاڑی کی رفتار تیز کردی اور پورے چار بج کر دس منٹ پر ریہاڑی قبرستان پہنچ گیا۔وہاں لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ نمازعصر پڑھنے کے بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور پھر دیکھتے دیکھتے میرے استادمحترم کو سُپرد خاک کیا گیا!۔وہ ہم سب کی نظروں سےدُور چلے گئے، نہ ختم ہونے والی جدائی کے ساتھ!

میں نے اپنے استادمحترم پروفیسر ظہورالدّین کے ساتھ اٹھائیس سال کا زمانہ گزارا ہے۔ وہ ایک قابل ترین، محنتی، اصول پرست اور خوش مزاج انسان تھے۔ گذشتہ اٹھائیس برسوں پر جب دھیان دیتا ہوں تو کئی یادیں مجھے بے چین کردیتی ہیں۔ 1985ء میں جب میں گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ میں بی اے فائنل کا امتحان دے رہا تھا تو میں نے پروفیسر ظہورالدّین صاحب کو پہلی بار دیکھا تھا۔اُن کے ساتھ پروفیسر وی پی سُوری شعبۂ تعلیم جموں یونیورسٹی کو بھی بحیثیت معائنہ کار بھیجا گیا تھا۔ امتحان میں نقل کی روک تھام کے لیے اُنھیں جموں یونیورسٹی کی طرف سے بھدرواہ بھیجا گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے بی اے فائنل کے پہلے پرچے سے لے کر آخری پرچے تک تقریباً ایک سو کے قریب نقل کرنے والے طالب علموں کو تین سال کے لیے امتحان سے برطرف کیا گیا تھا۔

1986ء میں، میں نے جموں یونیورسٹی کے تحت اردو میں ایم اے کرنے کا پروگرام بنایا، فارم بھرا تو سیٹ مل گئی۔اُس زمانے میں زیادہ تر شعبہ جات اور یونیورسٹی انتظامیہ کی عمارت کنال روڈ کے قریب ہوا کرتی تھی، اُسے اولڈ کیمپس کہا جاتا تھا۔

میرے بہنوئی پروفیسر محمد اسداللہ وانی صاحب مجھے اردو شعبے میں لے گئے تھے۔ ظہورالدّین صاحب سے میری ملاقات کروائی تھی۔ پروفیسر منظر اعظمی صاحب، پروفیسر ظہورالدّین صاحب، پروفیسر خورشید حمرا صدیقی صاحبہ اور پروفیسر نصرت آراء چودھری صاحبہ ایک ہی کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔ پروفیسر شیام لعل کالرا المعروف عابد پیشاوری صدرِ شعبہ ہوا کرتے تھے اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا اپنا ایک مخصوص کمرہ تھا۔ شعبے کے یہ تمام اساتذہ بہت اچھے تھے۔ خاص کر پروفیسر ظہورالدّین صاحب کا طریقہء درس وتدریس بالکل منفرد تھا۔ اُن کی پُر وقار اور بارعب شخصیت میں یہ بات شامل تھی کہ جونہی وہ کلاس میں داخل ہوتے تو طلبہ وطالبات بالکل خاموش ہوجاتے۔ بڑی روانی کے ساتھ زبانی لیکچر دیتے تھے اور آخر پر طلبہ کی تشفی کے لیے اُنھیں اس بات کا موقع دیتے تھے کہ وہ اُن سے سوالات پوچھیں۔ اردو ہی کی طرح اُنھیں انگریزی پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ پہلے سمیسٹر ہی میں اُنھوں نے مجھے اپنے افسانوں کا مجموعہ ''کینی بلز'' دیا تھا۔ جسے میں نے چند دنوں میں پڑھ ڈالا تھا۔ سنسکرت شعریات سے متاثر ہوکر اُنھوں نے ''تفکرات'' کے نام سے ایک کتابچہ تیار کیا تھا جو میں نے اُن سے مانگ کے لیا تھا۔ اُس کتابچے میں انسانی جذبات کی قسمیں بیان کی گئی تھیں۔

1987ء میں جب میں اسکول ٹیچر بھرتی ہوا تو بادل ناخواستہ اردو شعبے سے دُور ہوگیا۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق بہت زیادہ تھا اس لیے 1988ء میں اردو میں ایم اے کرنے کے فوراً بعد میں نے پی ایچ ڈی کرنے کا پروگرام بنایا لیکن ملازمت کی مدت تین سال نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اپنے محکمے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا اجازت نامہ نہیں مل سکا۔ 1990ء میں، میں نے پی ایچ ڈی کا فارم بھرا اور ساتھ ہی اسکول ایجوکیشن ڈائریکٹر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا اجازت نامہ کی خاطر فارم بھر دیا۔ تقریباً چھ ماہ سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد مجھے اجازت نامہ موصول ہوا اور

پروفیسر شیام لعل کالرا صاحب کی نگرانی میں ''تلوک چند محروم: حیات اور ادبی خدمات'' کے موضوع پر تحقیق کرنا طے پایا۔ یہ موضوع چودہ ابواب پر مشتمل تھا۔ 1991ء میں میری شادی ہوگئی اور اسی سال یہ موضوع کسی اور امیدوار کو دیا گیا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ 1993ء میں، میں نے دوبارہ پی ایچ ڈی کا فارم بھرا اور اب کی بار میں نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ پروفیسر ظہورالدّین صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کروں گا۔ میں اُن کے پاس آیا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ اُس زمانے میں صدر شعبہ تھے۔ میں نے اُنھیں کہا

''سر...... میں آپ کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں''

اُنھوں نے کہا

''اچھی بات ہے لیکن یہ بتائیے کہ آپ کا ذہنی میلان ادب کی کس صنف کی طرف ہے؟''

میں نے کہا

''فکشن'' پھر بولے

''ہاں اگر یہ بات ہے تو دو آدمی اب تک ایک موضوع چھوڑ چکے ہیں، میں اُس پہ کام کروانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں؟''

میں نے کہا ''ہاں سر میں تیار ہوں۔ موضوع بتائیے''

اُنھوں نے کہا

''موضوع ہے ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' کل میرے پاس آیئے اور اس موضوع کا خاکہ مجھ سے لے جایئے''

میں نے کسی حد تک خوشی محسوس کی۔ دوسرے دن جب اُنھوں نے مجھے مذکورہ موضوع کا خاکہ دکھایا تو میں پریشان ہوگیا۔ موضوع واقعی بہت زیادہ مشکل تھا۔ میں

نے ڈرتے ڈرتے اُن سے پوچھا

''سر! یہ لفظ 'بحران' میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ یہ بحران کیا ہوتا ہے؟''

ظہور صاحب تھوڑا سا مسکرائے، پھر کہنے لگے

''ایک ایسی اُتھل پُتھل اور تشویشناک ماحول کا پیدا ہونا کہ اُس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئے اُسے بحران کہتے ہیں اور انگریزی میں اسے Cricis کہتے ہیں یا یوں سمجھ لیجیے کہ اگر کوئی کشتی سمندر میں کسی طوفان کی زد میں آجائے تو اُس میں سوار لوگوں کی جو ذہنی کیفیت رہے گی اُسے بحران سے تعبیر کیا جائے گا۔ آپ کو اردو ناولوں میں تہذیبی بحران کی نشاندہی کرنی ہے''

میرے اس موضوع کو پانچ ابواب میں منقسم کیا گیا تھا۔ پہلے باب کا تعلق جدید تہذیبی بحران سے تھا۔ دوسرے باب میں اقوام عالم میں تہذیبی بحران کو شامل کیا گیا تھا۔ تیسرے باب میں یہ ثابت کرنا تھا کہ اردو ناول میں جدید تہذیبی بحران کی عکاسی ذہنی، سیاسی، سماجی، سائنسی، تعلیمی، اقتصادی، مذہبی اور ازدواجی اعتبار سے کس حد تک نظر آرہی ہے۔ چوتھے باب کا تعلق موضوعاتی اور ہئیتی اعتبار سے تہذیبی بحران کا اردو ناول پر اثر سے تھا اور پانچویں باب میں محاکمہ رکھا گیا تھا۔ ان چاروں ابواب میں بہت سے ذیلی عنوانات رکھے گئے تھے۔ جن تک میری ذہنی رسائی اور مواد کی فراہمی مجھے مشکل نظر آرہی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے اللہ کا نام لے کر اس موضوع سے متعلق مضامین اور کتابیں خرید کر پڑھنا شروع کیا۔ پارٹ ٹائم ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے مجھے یہ کام اور بھی مشکل نظر آرہا تھا۔ اُن دنوں میں ایک پرائمری اسکول کا ٹیچر تھا۔ مجھے پری پی ایچ ڈی کا کورس کرنے کے لیے چھٹی لے کر جموں آنا پڑا۔ غالباً اپریل 1994ء میں میرا نام پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹرڈ ہوا۔ پہلا باب لکھنے سے پہلے میں ایک روز ظہور صاحب کے پاس آیا اور اُن سے کہا

''سر...... میں چاہتا ہوں آپ مجھے اُن ناولوں کے نام بتائیں جو
تہذیبی بحران کے زُمرے میں آتے ہیں''

وہ اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے

''دیکھیے جب ہم اردو ناول میں تہذیبی بحران کی بات کرتے ہیں تو اس کے ابتدائی نقوش ہمیں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانہ آزاد'' میں نظر آنے لگتے ہیں۔ گویا تقسیم ہند سے قبل بھی کچھ ناول ایسے ضرور ہیں جن میں تہذیبی بحران کی جھلکیاں موجود ہیں۔ آپ کچھ ناولوں کے نام نوٹ کیجیے''

اُنھوں نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانہ آزاد'' سے سفر شروع کیا اور الیاس احمد گدی کے ناول ''فائر ایریا'' تک 19 ناول لکھا لیے۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ظہور صاحب کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اُنھوں نے بھی میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا پھر کہنے لگے

''مجھے امید ہے آپ اس موضوع پہ کام کریں گے''

پہلے باب سے متعلق جب میں نے بہت سی کتابیں خرید کر پڑھیں اور نوٹس لیے تو ذہن لکھنے پر آمادہ ہوا۔ تقریباً دو ماہ کے بعد جب میرا پہلا باب مکمل ہوا تو میں اپنے گاؤں مانتلائی سے چھنی آیا۔ ایس ٹی ڈی سے ظہور صاحب کو فون کیا۔ جموں اُن کے گھر میں لینڈ لائن فون ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں آج کی طرح موبائل فون اور انٹر نیٹ کی کوئی بھی سہولت نہیں تھی۔ میں نے اپنا پہلا باب چیک کروانے کے بارے میں اُن سے بات کی تو اُنھوں نے فوراً ہامی بھری اور مجھے اتوار کے دن شعبہء اردو میں آنے کو کہا۔ وہ اکثر اتوار کے دن بھی چند گھنٹوں کے لیے شعبے میں آتے تھے۔ مقررہ تاریخ پر جب میں اپنا کام لے کر شعبہء اردو میں پہنچا تو ظہور صاحب اپنے کمرے میں بیٹھ چکے تھے۔ علیک سلیک کے بعد جب میں نے اپنی فائل اُن کے سامنے رکھی تو کام

چیک کرنے سے پہلے کہنے لگے

''میں ریسرچ اسکالر کو محنت سے کام کروانے کا عادی ہوں۔ تحقیق کا کام نہایت صبر آزما اور دقت طلب کام ہوتا ہے۔ مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہونا چاہیے۔ آپ ڈگری کے لیے کام نہ کیجیے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کام سے ادب میں آپ کی ایک شناخت قائم ہو''

میں نے دھیان سے اُن کی باتیں سُنیں اور اُن پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔ بہ فضل اللہ میرے تحقیقی کام میں اُنھیں بہت کم غلطیاں نظر آتی تھیں جن کی وہ سُرخ پین سے نشاندہی کرتے تھے۔ تقریباً پچاسوں صفحے وہ ایک ہی نشست میں پڑھ لیتے تھے۔ زبان کی باریکیوں پر خاص دھیان دیتے تھے۔ تحقیق کے اصولوں پر سختی سے پابندی کراتے تھے۔ عالمانہ زبان و بیان کو بہت پسند کرتے تھے۔ ساڑھے تین سال میں، میں نے تین باب مکمل کر دیے اور جب چوتھے باب پر آیا تو اُس پر اٹک گیا۔ اس باب میں مجھے تہذیبی بحران کا اردو ناول پر موضوعاتی، ہیئتی اور زبان و بیان کے اعتبار سے اثرات کی نشاندہی کرنی تھی۔ پہلی بار چوتھا باب لکھنے کے بعد جب میں نے اُسے ظہور صاحب کو دیکھایا تو آدھا گھنٹہ پڑھنے کے بعد اُنھوں نے کہا

''اس میں تو وہ بات نہیں آئی جو میں چاہتا ہوں۔ اسے دوبارہ لکھ کے لے آیئے۔ پہلے اس موضوع کے بارے میں پڑھیے، پھر سوچیے اور اُس کے بعد لکھیے''

میں مایوس ہوا۔ وہ ریسرچ اسکالر سے یہ اُمید رکھتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے ذہن کا استعمال کرے۔ کاتا اور لے دوڑی والی بات اُنھیں ناپسند تھی۔ تقریباً بیس دن کے بعد جب میں دوبارہ اُن کے پاس لکھ کے لے گیا تو اُنھوں نے پھر وہی بات دوہرائی کہنے لگے

''وہ بات نہیں بن پا رہی ہے جو میں چاہتا ہوں۔ اسے دوبارہ لکھ کے

لے آئیے''

میری مایوسی میں حیرت شامل ہوگئی۔ میں اٹھا اور بوجھل قدموں سے ظہور صاحب سے رخصت لے لی۔ تیسری بار پھر اس امید کے ساتھ لکھ کے لے گیا کہ اب یہ قابل قبول ہوگا لیکن اُنھوں نے جونہی کوئی دو صفحے پڑھے تو اُن کے چہرے پہ ناگواری کے آثار اُبھر آئے اور کہنے لگے

''آپ موضوع سے باہر جارہے ہیں۔ ہمیں موضوعاتی اور ہیئتی اعتبار سے اردو ناول میں تہذیبی بحران تلاش کرنا ہے۔ بیان بازی سے کام نہیں چلے گا۔ معتبر حوالے دیجیے''

میرے ماتھے پہ پسینے کے قطرے اُبھر آئے۔ اب کی بار میں کافی مایوس ہوا۔ اُنھوں نے فائل میرے حوالے کی۔ میں اُن کے کمرے سے باہر نکل آیا اور ذہنی کوفتوں سے مغلوب ہوکر دل نے یہ چاہا کہ میں پی ایچ ڈی نہیں کروں گا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اس احمقانہ خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ گھر میں ڈاکیہ نے لکھنو کے پبلشر کی ارسال کردہ میرے نام ایک فہرست کُتب ڈال دی تھی۔ میں نے اُس فہرست کُتب پہ نظریں دوڑائیں تو جدید ناول کے فن پر چند کتابیں نظر آئیں۔ میں نے فوراً بذریعہ ڈاک وہ کتابیں منگوالیں۔ کوئی دس دن کے اندر مجھے یہ کتابیں موصول ہوئیں۔ میں نے اُنھیں ذہنی یکسوئی کے ساتھ لفظ لفظ پڑھا۔ بہت سی نئی معلومات حاصل ہوئی۔ جب مجھے اس بات کا اطمینان ہوا کہ اب مجھے کیا لکھنا ہے اور کیا نہیں لکھنا ہے تو میں نے ذہن میں پھر سے ایک خاکہ تیار کیا۔ معتبر حوالوں کا انتخاب کیا اور لکھنے سے پہلے دو رکعت صلوٰۃ الحاجت پڑھی اور اللہ کا نام لے کر لکھنے بیٹھ گیا تقریباً اٹھارہ دن میں، میں نے چوتھا باب مکمل طور پر لکھ ڈالا۔ میں نے ظہور صاحب سے فون پہ رابطہ قائم کیا۔ اُنھوں نے اتوار کے دن شعبے میں آنے کی اجازت دے دی۔ اُس روز میں ظہور صاحب کے آنے سے پہلے ہی شعبے میں پہنچ گیا۔ کچھ ہی

وقت کے بعد مجھے اُن کی گاڑی آتی نظر آئی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ گاڑی سے اُترے تو میں نے سلام کیا۔ ڈرتے ڈرتے اُن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کرسی پہ بیٹھے۔ اُنھوں نے چپراسی سے پانی منگوایا۔ پانی پینے کے بعد مجھ سے فائل مانگی اُدھر وہ میرا کام چیک کرنے لگے اور ادھر میں ذکرِ الٰہی میں لگ گیا۔ کوئی دو گھنٹے گزر جانے کے بعد اُنھوں نے کہا

''اب آپ راہ راست پر آ گئے ہیں''

اس کے بعد وہ مسلسل باقی کام دیکھتے رہے۔ پورا باب چیک کرنے کے بعد اُنھوں نے مجھے فائل پکڑاتے ہوئے کہا

''بہت اچھا یہ لیجیے''

مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے آج میرے سر سے منوں بوجھ اُتر گیا ہو۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے بعد میں نے اُس کی کتابت خود کی تھی۔ اس طرح پورے ساڑھے چار سال کے بعد مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔ میرے اس تحقیقی مقالے میں میری محنت ولگن، ذوق وشوق اور صبر آزمائی کے علاوہ میرے شفیق استادِ محترم پروفیسر ظہور الدّین کی دیانتدارانہ رہنمائی شامل تھی اس لیے یہ مقالہ محنت شاقہ اور ادبی معیار کا حامل قرار پایا۔ یہی وجہ رہی کہ 2002ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی جیسے اردو کے ایک بڑے ادارے نے مجھ سے یہ فرمائش کی کہ ہم اسے کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ 452 صفحات پہ مشتمل میرے اس تحقیقی مقالے کو اردو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ مجھ جیسے معمولی آدمی کی یہ کتاب یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں حوالہ جاتی کُتب میں شامل ہے۔

میرا یہ ماننا ہے کہ والدین اپنی اولاد کے روشن مستقبل کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے لیکن جہاں تک ایک بہترین استاد کی استادی کا تعلق ہے وہ مینارہء نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر ظہور الدّین صاحب ایک اچھے انسان تو تھے ہی ایک

بہترین استاد بھی تھے۔ بہت زیادہ نفاست پسند، سلیقہ شعار، اردو زبان وادب کے ماہر اور خیر خواہ، تہذیب وشائستگی کے دلدادہ، متانت وسنجیدگی کی ایک مجسم صورت تھے۔ وہ 27 مئی 1942ء کو ایک دُور دراز گاؤں کھنیڈ، تحصیل رام نگر، ضلع ادھم پور، صوبہ جموں میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد صاحب خواجہ خضر دین پولیس میں تھانیدار تھے اور والدہ کا نام تاج بیگم تھا۔ ظہورالدّین صاحب کی ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے آبائی گاؤں کھنیڈ کے پرائمری اسکول سے ہوا لیکن دوسری جماعت کے بعد اُن کے والد صاحب کا تبادلہ بسوہلی ضلع کٹھوعہ ہو گیا۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم جموں میں حاصل کی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پروفیسر ظہورالدّین صاحب پولیس میں سب انسپکٹر کی ملازمت چھوڑ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں لگ گئے تھے۔ پروفیسر گیان چند جین اُن کے استاد رہ چکے تھے۔ جن کی علمی وادبی صلاحیتوں سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔ کتابیں پروفیسر ظہورالدّین صاحب کی زندگی کا اہم سرمایہ تھیں۔ کئی علمی، ادبی اور لسانی مباحث پر اُن کی کتابیں اُن کی قد آور علمی وادبی شخصیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے، ماہر عروض بھی، افسانہ نگار بھی، اعلیٰ پایہ کے محقّق وناقد بھی اور ایک قابل اعتماد مترجم بھی۔ اُن کی یادگار تصنیفات سے اردو کی نئی نسلیں مستفید ہوتی رہیں گی۔ حق پرستی، خودداری، بے باکی اور غیر مصلحت پسندی یہ تمام خوبیاں اُن کی شخصیت میں موجود تھیں۔ آیئے اُن کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالتے چلیں:

1۔ تلافی (افسانوں کا مجموعہ) 2۔ تفکرات (تنقیدی مضامین) 3۔ محرؔوم کی شاعری (تلوک چند محرؔوم پر مقالہ) 4۔ اوڈی سوز (طویل افسانہ) 5۔ بیسویں صدی کے اردو ادب پر انگریزی کے ادبی رجحانات (پی ایچ ڈی کا مقالہ) ۔ کینی بلز (افسانوں کا مجموعہ) 7۔ حقیقت نگاری اور اردو ڈراما (تحقیق وتنقید) 8۔ Development of urdu Language and Literature in Jammu Region (ڈی لٹ کا مقالہ) 9۔ تعلیل وتاویل (تنقیدی مضامین)

10۔ ارمغان آزاد (جگن ناتھ آزاد کی شاعری اور اُن کے فکر وفن پر لکھے ہوئے مضامین کو انھوں نے مرتب کیا ہے) 11۔ کہانی کا ارتقا (تحقیق) 12۔ تنقیدی مباحث و تجزیے (تحقیقی و تنقیدی مضامین) ''جدید ادبی و تنقیدی نظریات'' فن ترجمہ نگاری'' ''فن صحافت'' ''پرانے اور نئے مضامین'' اور'' جدید اردو ڈراما'' اس کے علاوہ انھوں نے جے اینڈ کے بورڈ آف اسکول ایجوکیشن کے لیے مشترکہ طور پر پہلی سے بارہویں جماعت تک اردو کی نصابی کتابیں تیار کیں۔ اردو ادب کے حوالے سے ایک تاریخ ساز کام اُنھوں نے یہ بھی کیا کہ شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی سے ایک ششماہی رسالہ ''تسلسل'' کے نام سے جاری کروایا۔ ان ادبی سرگرمیوں کے علاوہ پرفیسر ظہورالدّین صاحب جموں یونیورسٹی کے رجسٹرار، کنٹرولر اور دو بار صدر شعبہ بھی رہے۔ اپنی صدارت شپ میں کئی قومی اور بین الاقوامی سیمی نار، کانفرنسیں اور ورکشاپس منعقد کروائیں۔ ہر ممکنہ حد تک ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں کوشاں رہے۔ کئی مقامی انجمنوں اور بالخصوص یوپی اردو اکیڈمی نے اُن کی کتابوں پر چھ انعامات دیے۔ ایک سنجیدہ اور دیانتدار انسان ہونے کے ناطے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں نے بحیثیت ایک فعال رُکن کے اُن کی خدمات حاصل کیں۔ مثلاً وہ جموں یونیورسٹی کونسل کے سیکرٹری، سیکریٹری جموں یونیورسٹی سنڈیکیٹ، کنوینر بورڈ آف اسٹڈیز ان اردو لینگویجز، جموں یونیورسٹی فنانس کمیٹی، سیکریٹری یونیورسٹی پبلیکیشن بورڈ، ایڈیٹر ان چیف یونیورسٹی نیوز بلیٹن، جنرل سیکریٹری انجمن اساتذہ ءاردو جامعات ہند، سیکریٹری انجمن ترقی اردو ہند جموں شاخ، ممبر سب کمیٹی جے اینڈ کے اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز اور چیرمین مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی جموں قابل ذکر ہیں۔

جنوری 2004ء میں مجھے دعوت حق (قرآن وحدیث) کے سلسلے میں ایک جماعت کے ساتھ تحصیل رام نگر میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جماعت کا رُخ بیریاں بلہوتہ اور بسنت گڑھ کے مضافاتی علاقوں کی طرف تھا۔ چالیس دن کے اس دعوتی سفر

میں میرے دل میں ایک روز یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنے استادِ محترم پروفیسر ظہورالدین کا علاقہ اور اُن کی جائے پیدائش دیکھ آؤں۔ میں نے امیر جماعت جناب عبدالحمید بٹ المعروف مصروف گلاب گڑھی سے اس بات کا اصرار کیا کہ وہ جماعت کو کھنیڈ لے چلیں۔ وہ تیار ہوئے۔ برف پوش پہاڑوں کا ایک سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ تیسرے دن ہماری جماعت کھنیڈ کے لیے روانہ ہوگئی۔ میں خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ پہلی بار اپنے استادِ محترم کا آبائی گاؤں دیکھنے جا رہا تھا۔ بیریاں بلھوتہ سے سیدھی چڑھائی تقریباً 11 کیلومیٹر چڑھنے کے بعد جب ہم چوچروگلا پہنچے تو برفیلے راستے پہ چلتے ہوئے ہمارے پیر پھسلنے لگے۔ عبدالحمید بٹ صاحب نے باآوازِ بلند نعت گانا شروع کردی۔ جماعت کے تمام ساتھیوں نے بھی اُن کا ساتھ دینا شروع کیا۔ دیودار، توس، چیڑ اور دوسرے قسم کے سایہ دار درختوں سے گزرنے کے بعد یہ دعوتِ حق کا قافلہ شام کو چار بجے کے قریب کھنیڈ پہنچا۔ جامع مسجد کے بالکل قریب ظہور صاحب کا مکان دیکھا۔ دوسرے دن اُن کے خاندان کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ کدواہ، لودرہ، پنارہ اور سنگ نام کے یہ گاؤں علاقہ کھنیڈ کو تشکیل دیتے ہیں۔ فطری مناظر سے آراستہ یہ علاقہ دل کو موہ لینے والا ہے لیکن ابھی تک گاڑیوں کی آمد و رفت سے محروم ہے کیونکہ سڑک ابھی زیرِ تعمیر ہے۔ اس علاقے کے وسط میں ایک دریا بہتا ہے جس کا نام دریائے اُجھ ہے۔

1998ء میں جموں یونیورسٹی نے مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تو میرے دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ میں اردو میں ڈی لٹ کروں گا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے جب پروفیسر ظہورالدین صاحب کے ساتھ مشورہ کیا تو اُنھوں نے خندہ پیشانی سے میری حوصلہ افزائی کی۔ موضوع کے انتخاب میں بھی اُنھوں نے میری مدد کی۔ ''اردو ادب میں تانیثیت'' کا خاکہ تیار کرنے میں ظہور صاحب نے کوئی بھی کسر اُٹھائے نہیں رکھی۔ میرا یہ خواب بھی اللہ تعالیٰ نے شرمندۂ تعبیر کردیا۔ پورے دس

سال کے بعد 2012ء میں جب ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی (یوپی) نے مجھے ایک کنووکیشن میں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ میں نے جب یہ خوشخبری ظہور صاحب کو سُنائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اُنھوں نے مجھے مبارک بادی۔ جب 2013ء میں میرا یہ مقالہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے کتابی صورت میں شائع کیا جو 780 صفحات پہ مشتمل ہے تو ظہور صاحب اُسے دیکھ کے بہت خوش ہوئے بے ساختہ کہہ اُٹھے

''میں آپ کی ہمت اور حوصلے کو داد دیتا ہوں۔ آپ کی محنت رنگ لائی''

بلاشُبہ ظہورالدّین صاحب علم وادب کے ہیرو تھے لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے غرور وتکبر اور نانیت کو کبھی بھی اپنے مزاج کا حصہ بننے نہیں دیا۔ اپنی عاجزی وانکساری اور احساس کمتری کا اظہار وہ کئی موقعوں پہ کر چکے ہیں۔ بہ فضل اللہ یہ احساس کمتری کی صفت شروع ہی سے میری سرشت میں بھی موجود ہے۔ میرا اس بات پہ یقین ہے کہ جس طرح ہر کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا اُسی طرح کوئی بھی آدمی اپنے آپ میں مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ احساس کمتری ہی ہے جو ہمارے سیکھنے کے دروازے کھلے رکھتا ہے۔ میں نے زندگی کے کئی مسائل ومعاملات میں ظہور صاحب سے مشورے کیے ہیں، اُن کی رائے کا احترام کیا ہے۔ میں کئی بار پنج تیرتھی جموں میں اُن کے کوارٹر میں گیا ہوں۔ اُن سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ ملک مارکیٹ جموں میں اُن کے مکان میں گیا ہوں۔ بہت قریب سے میں نے اپنے استاد محترم کو دیکھا ہے، سُنا ہے، سمجھا ہے۔ موبائل فون پہ کئی بار باتیں کی ہیں۔

2 جنوری 2017ء کو میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ پہ جوائین کرنے کے بعد جب ظہور صاحب کے گھر پر اُن سے ملاقات کرنے گیا تو بڑے پُرتپاک انداز میں مجھ سے ملے۔ مجھے مبارک باد دی۔ خوشی کا اظہار کیا لیکن بعد میں حسرت آمیز لہجے میں کہنے لگے

''مشتاق کو آج سے 20 سال پہلے ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں
اردو کا اسسٹنٹ پروفیسر بن جانا چاہیے تھا!''
میں نے اُن کی خیریت پوچھی تو کہنے لگے
''میں اب بیمار رہتا ہوں۔ بیٹوں نے مجھے گاڑی ڈرائیو کرنے سے
منع کر دیا ہے۔ لکھنا پڑھنا بھی بہت حد تک چھوٹ گیا ہے''
میں اُن کی باتیں سُن کر کسی حد تک مایوس ہوا۔

2018ء میں پروفیسر ظہور صاحب کے دن زیادہ تر بیماری میں گزرے۔ ستمبر کے مہینے میں ایک روز میں اُن کی خیریت معلوم کرنے اُن کے گھر چلا گیا۔ وہ برآمدے میں کرسی پہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو خوش ہوئے۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ کوئی ایک گھنٹہ ملاقات رہی ہوگی۔ اُن کے چہرے سے تھکان کے سے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ میں اُن سے رخصت ہوا۔ اپنے گھر منجواں چلا آیا اور دوسرے دن بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری چلا گیا۔ تقریباً چوبیس دن کے بعد میں اور میری اہلیہ جب ظہور صاحب کی خیر پُرسی کے لیے اُن کے گھر چلے گئے تو وہ اور اُن کی اہلیہ محترمہ برآمدے میں کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ ظہور صاحب کے ہاتھ میں پین اور چند سفید کاغذ تھے۔ وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے پہلے ایک آزاد نظم اُن کاغذوں پہ لکھ چکے تھے۔ اُن کی یہ آزاد نظم جس کا عنوان ''اُس سے'' ہے اردو کے ایک معیاری اور موقر رسالہ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی، اکتوبر 2018ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ اتفاق کی بات یہ کہ اسی شمارے میں مجھ جیسے معمولی آدمی کی ایک کہانی ''ریٹ لسٹ'' بھی شائع ہوئی ہے جس میں ایک ادیب کی زندگی کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم ظہور صاحب کی آخری تحریر ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائے ۔

''صبح ہی تو کہا تھا اُس نے مجھے
تُو دریا ہے مگر پانی نہیں ہے

عجب انداز تھا اُس کے بیاں کا
ذکر تو تھا کسی دردِ نہاں کا
سوچتا رہ گیا میں دیر تلک
کھوجتا رہ گیا میں دیر تلک
اُس نے کیوں مجھ سے یوں خطاب کیا
بولو بولو یہ کیا جناب کیا
اُس کی باتوں نے کر دیا مجھے بیتاب
نیند میری اُڑی اُسے سُن کر
جان نکلی مری اُسے سُن کر
ایسا بھی وہ یاد اکثر آتا ہے
اُس کا کہنا ہے اب بھی یاد مجھے
لوگ اب بھی پکارتے ہیں اُسے
صبح صبح نہارتے ہیں اُسے
لوگ کہتے ہیں آئے گا وہ اک دن
بیتی اپنی سُنائے گا وہ اک دن
رات کا درد گُزر جائے گا
کوئی ہمدرد مل ہی جائے گا
چاند اُترے گا چاندنی بن کر
راگ کوئی یا راگنی بن کر
آؤ مل کر اُسے بلاتے ہیں
گیت کوئی اُسے سُناتے ہیں
زندگی ایک ٹیڑھا آنگن ہے

سنگ ریزوں پہ ناچنا ہوگا
خون ٹپکے گا جب بھی تلووں سے
اک ہتھیلی پہ ناچنا ہوگا
میرا محبوب ہے وہ برسوں سے
آج کل سے نہیں نہ نرسوں سے
اُس کے پہلو میں جب بھی ہوتا ہوں
اپنے سارے گناہ دھوتا ہوں
اُس نے دی ہے جو زندگی مجھ کو
کس نے دی ہے وہ زندگی مجھ کو
اُس کی محبتوں کے طفیل
آج بھی جی رہا ہوں مثل غلیل''

دسمبر 2018ء کے دوسرے ہفتے میں جب میں راجوری سے گھر آیا تو دوسرے دن ظہور صاحب کی خیریت معلوم کرنے اُن کے گھر چلا گیا۔ وہ بستر پہ لیٹے ہوئے تھے۔ ایک خدمتگار اُن کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ ظہور صاحب کو دوائی کھلانے کا وقت ہو چکا تھا۔ خدمتگار نے اُنھیں جگایا اور بار بار اُنھیں میرے بارے میں کہنے لگا

''صاحب جی! یہ دیکھو جی یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ان سے بات کرو جی''

ظہور صاحب جاگ گئے۔ میں نے نزدیک جا کر اُنھیں سلام کیا۔ اُنھوں نے سلام کا جواب دیا لیکن جسمانی ضعف اور تکلیف کے باعث وہ مجھ سے صحیح طرح باتیں نہیں کر پائے۔ میں اُنھیں دیکھ کے مایوس ہوا!۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں، میں اور میری اہلیہ اُن کی خیریت معلوم کرنے اُن کے گھر گئے۔ وہ سوئے ہوئے تھے۔ اُن سے کوئی بھی بات نہیں ہو سکی اور نہ ہی اُنھیں جگانا مناسب سمجھا۔ یہ ہماری ظہور صاحب کے ساتھ آخری ملاقات تھی۔ میرے شعور، تحت الشعور اور لاشعور میں اُن کی

یادوں کی پرچھائیاں رچ بس گئی ہیں۔اُن کی حسین شبیہہ اور اُن کی باغ و بہار شخصیت میری آنکھوں میں منڈلاتی رہتی ہے۔اُن سے جُڑی یادیں مجھے آنسو بہانے پر مجبور کررہی ہیں۔دراصل ہم سب وقت کے دریا میں بہہ رہے ہیں۔اس بات کا یقین کسی شاعر کے اس شعر سے بھی ہو جاتا ہے ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی

....

اور پھر حیرتؔ الہ آبادی کا یہ شعر کہ

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

....

پروفیسر ظہور الدّین صاحب کی اہلیہ محترمہ دُرشہوار انتہائی نیک، جہاں دیدہ اور وفادار خاتون ہیں کہ جو اُن کی زندگی میں بہار بن کر آئیں۔اللہ اُن کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ بُزرگوں کا قول ہے کہ اچھے انسان کی اچھی اولاد ہوتی ہے۔ پروفیسر ظہور الدّین صاحب کے دو پیارے وفادار بیٹے سُہیل ظہور اور اسیر ظہور نے اپنے والد کی بہت خدمت کی ہے۔ بڑا بیٹا سُہیل ظہور ڈاکٹر ہے اور چھوٹا بیٹا انجینئر ہے۔دونوں شادی شدہ ہیں۔اللہ تعالیٰ پروفیسر ظہور الدّین صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین! میں نے اُن کی وصیت کے مطابق اُن کے گزر جانے کے بعد اُن کے گھر سے کتابیں اپنی گاڑی میں لوڈ کر کے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کی سینٹرل لائبریری کے ملازمین کو سونپیں۔

....

اللہ تعالیٰ کا سایۂ رحمت ہر دور میں میرے ساتھ رہا ہے۔بابا غلام

شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے چھوٹے ملازمین سے لے کر بڑے ملازمین تک کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے میری محبت ڈال دی۔ مجھے یہاں لکھنے پڑھنے کا بہترین ماحول ملا۔ میری ادبی سرگرمیوں کی رفتار یہاں تیز تر ہوگئی۔ مجھے یونیورسٹی کے اُردو سیل کا پریس رپورٹر بنایا گیا۔ اللہ کے فضل سے ابھی تک میرے ہاتھوں درجنوں یونیورسٹی میں منعقدہ پروگراموں کی پریس رپورٹنگ ہوئی ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ ''آپ بھلے تو جگ بھلا'' میں نے زندگی کے میدان میں آج تک پھونک پھونک کے قدم رکھا ہے۔ اخلاقی اور روحانی قدروں کو لے کر جیا ہوں۔ زندگی کو خوب صورت بنانے کی للک مجھ میں کل بھی تھی، آج بھی ہے۔ سکون قلب کو میں دُنیا کی عظیم نعمت سمجھتا ہوں۔ سکون ایک ایسی نعمت ہے جو کسی دُکان سے خریدی نہیں جاسکتی ہے بلکہ یہ تو اعمال صالح کے باعث آدمی کو حاصل ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے، دُنیا کا وہ آدمی اکثر پریشان رہتا ہے جو رب چاہی زندگی کے بدلے من چاہی زندگی گزارتا ہے۔ مجھے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں جو عزت اور پیار ملا میں اُسے بھول نہیں پاؤں گا۔ اللہ کا فضل یہ کہ باعزت طریقے سے مجھے یہاں آنا نصیب ہوا۔ سب سے پہلے مجھے جس باغ و بہار، محنتی، علم وادب کے رسیا، شاعر، محقق، نقاد اور مترجم سے واسطہ پڑا، وہ اسم بامسمیٰ شخص ڈاکٹر شمس کمال انجم ہیں، اُن کے ہاتھوں میری جوائنگ ہوئی۔ میں ڈاکٹر شمس کمال انجم صاحب کی ادبی نگارشات خاص کر اُن کے بصیرت افروز مضامین اور غزلیں ماہنامہ 'شاعر' (بمبئی) کے علاوہ مختلف اخبارات ورسائل میں ایک زمانے سے پڑھتا آرہا تھا۔ یہ 2 جنوری 2017ء کی بات ہے۔ اپنے عزیز دوست اور ہم پیشہ ساتھی ڈاکٹر لیاقت حسین نیر نے مجھے اپنا بڑا بھائی کہتے ہوئے گلے لگایا۔ شعبہء عربی کے تمام اساتذہ جناب ڈاکٹر محمد عفان، ڈاکٹر منظر عالم، ڈاکٹر محمد اعظم اور ڈاکٹر عقیلہ سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ شعبۂ عربی کے جونیر اسسٹنٹ سجاد احمد کو دیکھا، جی ڈی ایچ تنویر احمد کو بار بار دیکھنے کا موقع

ملا۔ یہ سب اجنبی ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنے معلوم ہوئے۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم صاحب نے شعبہء اردو کا نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری مجھے اور ڈاکٹر لیاقت حسین نیر کو سونپی۔ ہم دونوں نے اپنی استطاعت کے مطابق تقریباً تین ہفتوں میں نصاب تیار کر کے صدر شعبہء عربی، اردو اور اسلامک اسٹڈیز جناب ڈاکٹر شمس کمال انجم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انھوں نے کانٹ چھانٹ کرنے کے بعد اُسے حتمی شکل دے کر ڈین آف اکیڈمک افیئرس کے آفس میں بھیج دیا۔ غالباً مارچ 2017ء میں سابق وائس چانسلر محترم پروفیسر جاوید مسرت نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے اُن تمام نئے اور پُرانے شعبہ جات میں خالی پڑی آسامیوں کی تشہیر کروائی اور دو ماہ کے بعد انٹرویو کے ذریعے قابل، محنتی اور باذوق امیدواروں کی سلیکشن ہوئی۔ شعبہء اردو کے لئے ڈاکٹر لیاقت حسین نیرؔ، ڈاکٹر محمد آصف ملک اور ڈاکٹر رضوانہ شمسی کی سلیکشن ہوگئی۔ یہ وہ خوش نصیب ہیں جنھیں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے مشتاق احمد وانی کی طرح کسی ہائی کورٹ میں نہیں جانا پڑا۔ اُن کی سلیکشن سے پہلے ہی اگست 2017ء میں ایم اے اردو کی پہلی کلاس بٹھا دی گئی تھی۔ ڈاکٹر لیاقت حسین نیرؔ سات سال سے عارضی طور پر بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے شعبہء عربی کے بی اے طلبہ کو اردو پڑھا رہے تھے۔ 2017ء ہی میں پروفیسر جاوید مسرت صاحب کی سرپرستی میں ایک تقریری مقابلے کا انعقاد ہوا جس میں شعبۂ عربی کے ایک ایم اے کے طالب علم مختیار احمد علیمی نے پہلا انعام جناب گورنر این این وہرا صاحب کے ہاتھوں حاصل کیا۔ ایم اے اردو اور اسلامک اسٹڈیز کی کلاسیں تقریباً ایک سال تک پالیٹکنک کالج کی دوسری منزل میں چلتی رہیں۔ میں اور ڈاکٹر لیاقت حسین نیرؔ کے علاوہ ڈاکٹر محمد ایوب اور ڈاکٹر روزینہ ایم اے اردو کے پہلے سمسٹر کے طلبہ کو پڑھاتے رہے۔ میرے علاوہ یہ تینوں مستقل طور پر اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ پہ تعینات نہیں تھے۔ ستمبر 2017ء کے آخری ہفتے میں ڈاکٹر لیاقت حسین نیرؔ، ڈاکٹر محمد آصف ملک اور

رضوانہ شمسی مستقل طور پر شعبہء اردو میں آ گئے۔ 2017ء ہی میں شعبہء اسلامک اسٹڈیز میں ڈاکٹر نسیم گل اور ڈاکٹر رفیق انجم مستقل طور پر اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ پہ تعینات ہو گئے۔ اُن کے علاوہ گلزار احمد اور سجاد احمد عارضی طور پر ایم اے اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کو پڑھانے لگے۔ 2017ء ہی میں پروفیسر جاوید مسرت صاحب نے شعبہء اردو اور اسلامک اسٹڈیز کی عمارت کا کام شروع کروایا۔ اُنھوں نے مجھے اور ڈاکٹر رفیق انجم کو یہ ذمے داری سونپی کہ ہم دونوں اس عمارت کی تعمیر میں دیکھ ریکھ کرتے رہیں۔ تقریباً ایک سال کے بعد 2018ء میں اردو اور اسلامک اسٹڈیز کی عمارت تیار ہوگئی اور یہ دونوں شعبے اُس میں منتقل ہو گئے۔ نچلی منزل اردو شعبے کے حصے میں آئی اور بالائی منزل اسلامک اسٹڈیز کے حصے میں آئی۔

یہ بات بھی میری خوش نصیبی میں شامل ہے کہ مجھے ڈاکٹر لیاقت حسین نیرؔ اور ڈاکٹر محمد آصف ملک جیسے دیندار، شریف، ملنسار، خوش مزاج، وقت کے پابند اور درس وتدریس میں ماہر ہم خیال وہم مزاج ساتھیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر رضوانہ شمسی بھی خوش مزاج ہیں۔ چھوٹی عمر میں بہت کچھ سیکھ گئی ہیں۔ اِن کے علاوہ پوری یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات اور انتظامیہ کے ملازمین کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات نے مجھے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ میں گھر سے باہر ہوں۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم صاحب تقریباً ساڑھے چار سال تک شعبہء اردو اور اسلامک اسٹڈیز کے صدر رہے۔ اس دوران انھوں نے شعبہء عربی کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اردو اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں کی بھی ذمہ داریاں نبھائیں۔ پروفیسر جاوید مسرت صاحب کی وائس چانسلر شپ میں انھوں نے کئی ادبی پروگرام منعقد کرائے۔ میں اور میرے ساتھی اس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ NAAC کی تیاری کے دوران تقریباً ایک سال تک ڈاکٹر شمس کمال انجم صاحب نے تینوں شعبوں کا فائل سسٹم اور Data Templet کے اندراج میں بہت محنت ولگن سے کام کیا ہے۔

2018ء میں ریاستی سطح کا ایک سیمینار بعنوان ''عربی اور اردو افسانہ: فن اور تکنیک'' کا انعقاد کیا گیا جس میں کشمیر کے تین اہم افسانہ نگار ڈاکٹر ریاض توحیدی، راجہ یوسف اور طارق شبنم نے شرکت کی اور اپنے اپنے افسانے سامعین کی خدمت میں پیش کئے۔ اس سیمینار کی خصوصیت یہ رہی کہ عربی اور اردو کے تمام اساتذہ نے افسانے کے فن اور تکنیک پر اپنے مقالے پیش کئے۔ میں نے اس سیمینار میں اپنا تحریر کردہ افسانہ ''سب کی ماں'' پڑھ کر سنایا تھا جسے بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس سیمینار کی نظامت ڈاکٹر محمد آصف ملک نے کی تھی۔ 14 دسمبر 2017ء کو قومی سطح کا ایک اردو مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں خطہء پیر پنچال کے نمائندہ شعرا کے علاوہ دہلی سے تشریف لائے حبیب سیفی اور ڈاکٹر حنیف ترین نے شرکت کی تھی (ڈاکٹر حنیف ترین اب اس جہاں میں نہیں ہیں) یہ مشاعرہ بھی کافی کامیاب رہا تھا۔ غرضیکہ پروفیسر جاوید مسرت صاحب کی وائس چانسلر شپ میں جہاں عمومی طور پر تمام شعبہ جات میں متعدد سیمینار، کانفرنس اور ورکشاپس منعقد کی گئیں تو وہیں شعبہء اردو، عربی اور اسلامک اسٹڈیز میں بھی کئی علمی وادبی پروگرام منعقد کئے گئے۔ 2017ء ہی میں پروفیسر جاوید مسرت صاحب نے اردو اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں پی ایچ ڈی پروگرام شروع کرایا۔ (Secreening Test) مسابقتی ٹیسٹ اور زبانی امتحان کے ذریعے اردو میں تین امیدوار پی ایچ ڈی کے لئے سلیکٹ ہوئے۔ پہلے نمبر پر محمد عرفان ٹھوکر، دوسرے نمبر پر ظفر اقبال نحوی اور تیسرے نمبر پر سائمہ قیوم میر۔ محمد عرفان ٹھوکر، ڈاکٹر محمد آصف ملک کی نگرانی میں آ گیا۔ ظفر اقبال نحوی میری نگرانی میں اور سائمہ قیوم میر، ڈاکٹر لیاقت حسین نیرؔ کی نگرانی میں۔ ظفر اقبال نحوی نے ''علامہ اقبالؔ کے نظام فکر میں عہد ساز شخصیات'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا۔

....

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کی مخلص اور کرم فرما شخصیات میں محترم پروفیسر

جاوید مسرت سابق وائس چانسلر، ڈاکٹر اشفاق احمد زرّی صاحب سابق رجسٹرار، پروفیسر اقبال پرویز صاحب ڈین آف اکیڈمک افیئرس، پرفیسر جی ایم ملک صاحب ڈین آف اسٹوڈینٹس ویلفئر، محمد اسحاق صاحب کنٹرولر، ڈاکٹر نسیم احمد صاحب سابق ڈین آف سوشل سائینسس، پروفیسر شجاع الدّین صاحب سابق ڈائریکٹر شعبۂ حیوانات ونباتات، جناب اسرار غوث ڈائریکٹر ٹوریزم اور ڈاکٹر شمس کمال انجم صاحب صدر شعبۂ عربی اور چیف وارڈن کے علاوہ میرے چاہنے والوں اور خیر خواہوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ میں یہاں ہر ایک کا نام لینے کی پوری کوشش کروں گا لیکن اگر کہیں میرے حافظے نے ساتھ چھوڑ دیا تو مجھے اُمید ہے کہ مجھے معاف کیا جائے گا۔

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں جوائن کرنے کے بعد میرا واسطہ جن انتظامیہ آفیسران کے ساتھ رہا وہ نہایت مخلص، محنتی اور شریف آفیسر تھے۔ 2017ء سے اکتوبر 2020ء تک میں نے گاہے بگاہے پروفیسر جاوید مسرت صاحب سے ملاقاتیں کیں۔ اُن کو نہایت فعال و باکمال پایا اُن کے اوصاف حمیدہ سے میں نے ذاتی طور پر بہت کچھ سیکھا۔ جناب پروفیسر اقبال پرویز تقریباً دو سال تک رجسٹرار کی پوسٹ پہ تعینات رہے اور اُس کے بعد اب تک ڈین آف اکیڈمک افیئرس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اُن کے مزاج میں مزاح اور ادبی چاشنی کا جو جذبہ کار فرما رہتا ہے وہ سب کو اُن کا گرویدہ بنالیتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد زری صاحب 2018ء میں کشمیر یونیورسٹی سے یہاں رجسٹرار کی پوسٹ پہ آئے۔ اُن کی ذہانت، پلاننگ اور کام کرنے کی لگن بے مثال تھی۔ محمد اسحٰق صاحب کنٹرولر۔ جناب پروفیسر جی ایم ملک سابق ڈین اسکول آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ لینگویجز اور ڈین اسکول آف ایجوکیشن کے ساتھ جب بھی اور جہاں کہیں بھی میں ملا ہوں میری طبعیت خوش ہوئی ہے۔ انتہائی خوش مزاج، انسان دوست اور باغ و بہار شخصیت ہیں۔ میں جب بھی اُن سے ملتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے بڑے بھائی کے سامنے آ گیا

ہوں۔اُن کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتوں نے مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں اپنے گھر سے دُور ہوں۔ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کو دیکھ کے طبعیت خوش ہو جائے۔ان شخصیات کے علاوہ جناب سُنیت گپتا، میرے عزیز دوست ڈاکٹر ذاکر ملک بھلیسی، ماجد، ہریش تھاپا، ساحل، ویر سنگھ، میری منہ بولی دو بہنیں محترمہ نبیلہ نازنین، محترمہ شبینہ نظیر، امتحانات سیکشن میں کام کرنے والے جناب محمد نصیر قریشی، محمد شفیق، صادق اقبال، محترمہ نگینہ کوثر، صغیر احمد، امت ناگر، سریش شرما، شکیل احمد، محمد ایوب، قمر زماں، امن فیمال، جاوید نذیر، سمیرا انجم اور تبسیم شامل ہیں۔

استحکامی ادارہ (Establishment Section) میں کام کرنے والے جن لوگوں کے ساتھ میری علیک سلیک رہی۔اُن میں منٹے شرما، تنویر احمد، ریاض احمد، شہزاد احمد، اویناش شرما اور علی مرتضٰی شامل ہیں۔ان کے ساتھ کبھی میری ہنسی مذاق کی باتیں ہوئی ہیں تو کبھی دُنیا کی ناپائیداری کا ذکر چھڑا ہے۔

اسٹیٹ سیکشن میں جناب محمد قاسم کوہلوی، برج موہن سلگوترہ، بھوپندر سنگھ، افتخار حسین شاہ اور محمد شہباز کے ساتھ میرے تعلقات رہے ہیں۔ان میں محمد قاسم کوہلوی جوائنٹ رجسٹرار نے 2014ء میں میری مظلومیت پر ٹھنڈی آہیں بھری ہیں۔ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔اللہ اُنھیں خوش وخرم رکھے۔

اسکول آف مینجمنٹ اسٹڈیز (School of Management Studies) میں جن لوگوں کو میں نے ہنستے مسکراتے ہوئے بات کرتے دیکھا، اُن میں ممتا چودھری، ڈاکٹر پرویز عبداللہ، ڈاکٹر رادھا گپتا، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر درخشاں انجم، ڈاکٹر گورو سہگل، ڈاکٹر کفیل احمد، ڈاکٹر جتندر کمار، ڈاکٹر عاصم میر، ڈاکٹر دانش اقبال رعنا (میرے اس دوست نے مجھے ہر حال میں ہنسانے کی کوشش کی ہے) ، ڈاکٹر ونے کمار، ڈاکٹر دل پذیر، ڈاکٹر شوکت احمد، ڈاکٹر سجاد احمد اور مس تعظیم اختر شامل ہیں۔

شعبہء کمپیوٹر سائنس میں ڈاکٹر ماجد بشیر ملک، ڈاکٹر اصغر غازی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر سنجے جموال، ڈاکٹر محمد نسیم، ڈکٹر گلفام احمد، ڈاکٹر عادل احمد لاوے اور محترمہ پروین رانا کو میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ اسی طرح شعبۂ اطلاعات یعنی انفارمیشن میں ڈاکٹر تسلیم عارف جان، مسٹر ستیش کمار اور مسٹر ای ڈی گوہروانی کے ساتھ میرا اُٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔

شعبہء حیوانات ونباتات کی خوبصورت عمارتوں کو میں نے متعدد بار دیکھا ہے۔ میرے دوست ڈاکٹر اصغر علی شاہ ایسوسی ایٹ ڈین آف اسٹوڈنٹس، ڈاکٹر محمد حنان، ڈاکٹر سجاد پرے، ڈاکٹر سجاد خان اور ڈاکٹر محمد سلیم ریشی شعبہء حیوانات سے تعلق رکھتے ہیں جن کی محنت اور کوششوں سے یہ شعبہ ترقی کی راہ پہ گامزن ہے۔ اسی طرح شعبہء نباتات میں ڈاکٹر سُشیل ورما، ڈاکٹر محمد اصغر، ڈاکٹر عارف تسلیم جان اور ڈاکٹر محمد حنیف اپنی پوری شرافت اور دیانتداری کے ساتھ کام کرتے نظر آئے ہیں۔ بائیو ڈائیورسٹی اسٹڈیز سینٹر میں ڈاکٹر شریکھر پنت، ڈاکٹر ممتا بھٹ اوڈاکٹر طاہر محمود ہیں جب کہ ڈاکٹر تنویر الحسن ڈار، ڈاکٹر راجہ عامر حسین، ڈاکٹر سائمہ اسلم اور ڈاکٹر شہیب احمد بائیوٹکنالوجی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے اپنے تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شعبہء فزیکس کی ابھی اپنی کوئی بلڈنگ نہیں ہے یہ شعبہ پالیٹکنک کالج کی پہلی منزل میں ہی ہے جس میں ڈاکٹر فیروز احمد میر اور مسٹر مجاہد الاسلام ہیں۔ مجھے انتہائی دُکھ ہے کہ 2017ء میں پروفیسر جاوید مسرت صاحب نے اردو، اسلامک اسٹڈیز کے علاوہ فزیکس کا شعبہ بھی قائم کیا تو مستقل اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ پہ ڈاکٹر عاشق حسین شاہ کی سلیکشن ہوگئی۔ لیکن 2018ء کے وسط میں وہ گُردوں کی بیماری میں مبتلا ہوگئے۔ آخر کار آپریشن سے وہ کسی حد تک ٹھیک ہوگئے، یونیورسٹی میں تقریباً دو سال تک آتے رہے لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ وہ دسمبر 2021ء میں اللہ کو

پیارے ہو گئے! اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے آمین!

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کا اسکول آف انجینئر نگ بالائی سطح پر واقع ہے۔ چاروں طرف سے ڈھلوان پہاڑ ہیں۔ یہ اسکول چھ شعبہ جات پر مشتمل ہے۔اس اسکول کے ڈین تا حال ڈاکٹر آصف حسین صاحب ہیں جو انتہائی شریف، باصلاحیت اور محنتی ہیں۔سیول انجیئر نگ میں جو لوگ درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اُن میں وسیم شہناز، ذیشان اسلم، پرویز عالم، ناصر راتھر، عامر اللہ گنائی اور ڈاکٹر شاہد ہیں۔آئی ٹی انجینئر نگ میں ملک مبشر حسن، نکھل گپتا، راکیش سنگھ سنبیال، ڈاکٹر من میت سنگھ، راشد قیوم شال اور وشال شرما کی محنتیں رنگ لا رہی ہیں۔الیکٹریکل انجینئر نگ کے اسٹاف ممبران میں شفقت مُغل، تصدق حسین، احمد ریاض، ڈاکٹر ونود پوری، مس انکیتا، مسٹر نوتن شرما، مسٹر یاصر عرفات اور مسٹر مدثر حسین شامل ہیں۔بجلی اور مواصلاتی (Elecrtical and Communication) شعبے کے تدریسی عملے میں مسٹر وشال پوری، محمود الحسن، ڈاکٹر فرخندہ انا، حیدر معراج، جنید وار، مسٹر عباس، مسٹر مانک گروچ، مس شویتا اور مس نشا گپتا کے نام شامل ہیں۔کمپیوٹر سائنس انجینئر نگ کے شعبے میں خلیل احمد، امت ڈوگرہ اور مس رخسانہ ٹھکرا اپنی اپنی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ اپلائڈ سائنسس میں ڈاکٹر رام سنگھ، مسٹر انل مینی، مسٹر وشال شرما پہاڑی، مسٹر نوین شرما، مسٹر تنویر احمد، مسٹر محمد عارف اور ساجد رشید اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

شعبہء ریاضیات، شعبہء تعلیم اور شعبہء انگریزی کی ایک ہی عمارت ہے جو تین منزلوں پہ مشتمل ہے پہلی منزل میں شعبہء ریاضیات ہے جس میں ڈاکٹر ظہیر عباس، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر مدثر رشید لون اور مسز شروتی گپتا علم ریاضی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ شعبہء تعلیم میں پروفیسر جی ایم ملک صدر اور ڈین کے فرائض انجام دے رہے تھے لیکن مئی 2022ء سے وہ واپس کشمیر چلے گئے

کیونکہ اُنھیں پانچ سال کے لئے اس شعبے کی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت ہیں، جن کی نگرانی میں ڈاکٹر نیرؔ جبیں، ڈاکٹر نسیم قیصر اور ڈاکٹر آزاد احمد اندرابی بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر اپنے تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ میں پانچ سال سے اس شعبے میں بی ایڈ کے طلبہ کو تدریس اردو پڑھا رہا ہوں۔ شعبۂ انگریزی میں محترمہ ڈاکٹر روبینہ رشید، ڈاکٹر ماریہ اسلم، ڈاکٹر سچی سُود، مسٹر تنویر احمد اور ڈاکٹر شاہ سجاد حیدر ہیں۔ یہاں بھی ایک دُکھ کی بات لکھ رہا ہوں وہ یہ کہ ڈاکٹر سجاد شاہ حیدر 2017ء سے بیمار چل رہے ہیں وہ تقریباً ایک سال تک بیماری کی حالت میں ہی خود گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے یونیورسٹی آتے رہے لیکن اُس کے بعد اُن کی بیماری نے اُنھیں اُٹھنے نہ دیا۔ اب ایک ہی جگہ پہ ہیں اور بیوی بچّے کے سہارے اندر باہر آتے ہیں! اردو میں اچھی شاعری کرتے ہیں لیکن کیا کہیے تندرستی کے بغیر زندگی بارگراں بن جاتی ہے۔ اللہ اُنھیں صحت کاملہ عطا فرمائے آمین!

پالیٹکنک کالج کے پرنسپل جناب ملک مبشر ہیں اس کالج کے تدریسی عملے میں جو اساتذہ پڑھاتے ہیں اُن کے نام ہیں شوکت مقبول بٹ، محمد رفیق چودھری، شویندر سنگھ مہتہ، شکور احمد، محترمہ رافعیہ خاتون، امت دسگوترہ اور فاروق احمد۔ یہاں یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ اس کالج کے پرنسپل جناب ملک مبشر نے مجھ سے آف لائن اور آن لائن تین بار انسانی اقدار اور اخلاقیات پر طلبہ کو لیکچر دلائے ہیں۔ اس کے علاوہ انجینئرنگ کالج کے ڈاکٹر من میت سنگھ نے بھی مجھ سے کورونا وائرس کے دوران 2021ء میں اسی طرح کا لیکچر دلایا جسے انجینئرنگ کالج کے ڈین جناب ڈاکٹر آصف حسین نے بہت زیادہ پسند کیا تھا۔

سینٹرل لائبریری میں، میں اکثر جاتا رہا ہوں۔ ڈاکٹر رمیش پنڈتا سینئر اسسٹنٹ لائبریرین ہیں۔ اُن کے علاوہ ذاکر حسین ملک، رمیش دھر، محترمہ رابعہ کوثر، آسیہ کوثر، محمود شاہ، ممتاز احمد، حسن دین اور اورنگ زیب خان اس لائبریری کے

اسٹاف ممبران ہیں۔ پروفیسر جاوید مسرت کے دور میں ایک نئی جگہ سینٹرل لائبریری کی عمارت تیار ہوچکی ہے جو جدید ٹکنالوجی کے ڈیزائن پر تیار کی گئی ہے۔ان شااللہ ایک دوسال کے اندر اس لائبریری میں تمام کتابیں منتقل کی جائیں گی۔ اس طرح یہ لائبریری جموں کشمیر میں اپنی نوعیت کی پہلی لائبریری ہوگی۔

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے طبی مرکز کے اندر اور باہر سے میں اکثر گزرتا رہا ہوں۔اس مرکز میں ڈاکٹر جاوید احمد ریشی، طلعت محمود، مجیب الرحمٰن راحیل ورما۔ نرسنگ کالج کی پرنسپل میڈم ٹی ٹی سوئیر نے بھی اپنے کالج میں کافی محنت سے کام کیا ہے۔جس کے باعث وہ کالج اچھے نتائج کے ساتھ جانا جاتا ہے۔

کم وبیش پونے چار سال تک میں نے مولانا آزاد ہوسٹل میں بحیثیت ہوسٹل وارڈن کام کیا۔ اس دوران میرا واسطہ جن اشخاص کے ساتھ رہا اُن میں تمام بوئز ہوسٹلوں کے ہیڈ اسسٹنٹ میرے دوست آصف رشید، بجلی شعبے میں کام کرنے والے (Electration) دلشاد نقوی اور شان علی جعفری کے علاوہ جمیل، شبیر اور طالب شامل ہیں۔علامہ اقبال ہوسٹل کے وارڈن یاسر عرفات، اسسٹنٹ وارڈن ڈاکٹر غلام سرور۔ ذاکر حسین ہوسٹل کے وارڈن مجاہد الاسلام اور میرے اپنے ہوسٹل کے اسسٹنٹ وارڈن ڈاکٹر رئیس میری یادوں میں ہیں۔میرے ہوسٹل کا ایک خاک روب راحیل کے ساتھ بھی میرا واسطہ رہا ہے۔گیسٹ ہاوس کے عبدالباسط اور محمد صادق کے ہاتھوں کا پکایا ہوا کھانا میں نے کھایا ہے۔اُن کے ساتھ جڑی یادیں میرے ذہن میں تازہ ہیں۔

شعبہء عربی کے ریسرچ اسکالرس جن کو میں نے بار بار دیکھا ہے اُن میں اشتیاق بخاری، عبدلوحید، گلشن رشید، عمر اور مفتی ابراہیم مصباحی شامل ہیں۔ شعبہء اسلامک اسٹڈیز میں ڈاکٹر خالد حسین میر کو میں نے بہت محنتی، شریف اور نیک پایا، ڈاکٹر محبّ احد، اجالا امین، سجاد احمد کمار اور محمد اعظم شامل ہیں۔میری زیرِ نگرانی کشمیر کی ایک ریسرچ اسکالر جاسی اختر اور سرنکوٹ کی نعیم خانم پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ جاسی

اختر، پروفیسر ظہور الدّین کی ادبی شخصیت پر تحقیق کر رہی ہے جب کہ نعیم خانم جمیل جالبی کی حیات وادبی خدمات پر مقالہ لکھ رہی ہے۔

....

راجوری شہر کی جس علمی، ادبی اور سماجی شخصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ فاروق مضطؔر صاحب ہیں۔ اللہ تعالیٰ دراصل اُسی شخص کو اپنی گونا گوں نعمتوں سے نوازتا ہے جس کے دل میں محنت ولگن، دیانت داری، خلوص اور سب کا بھلا چاہنے کا جذبہ موجزن ہو۔ پورے خطۂ پیر پنچال میں اُن کے تعلیمی ادارے 'ہمالین مشن آف ایجوکیشن' نے علمی، ادبی، سائنسی اور تکنیکی اعتبار سے ایک دُھوم سی مچادی ہے۔ آج تک ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں اس ادارے سے فارغ ہوکر بڑے اونچے اُونچے عہدوں پر فائز ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو تا قیامت اسی طرح قائم ودائم رکھے اور فاروق مضطر صاحب اور اُن کے اہل خانہ کو خوشیوں اور کامیابیوں سے نوازتا رہے! آمین۔ فاروق مضطر صاحب کی اولاد بھی صبح کے نام کے لائق ہے۔ جناب ڈاکٹر سلیم صاحب، مسلم صاحب اور شہر یار صاحب کا کیا کہنا معصومیت اور ذہنی وجسمانی نفاست کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ اللہ سلامت رکھے ہر بلا سے۔ اس گھرانے کے علاوہ خطۂ پیر پنچال کے جن مخلص لوگوں کے ساتھ میرا دوستانہ میری سعادت مندی میں شامل ہے اُن میں جناب خورشید احمد بسمؔل، جناب چودھری قمر حسین، عبدالسّلام بہار، جناب احمد شناس، جناب خوشید جانم جناب عبدالقیوم نائک، جناب ذولفقار نقوؔی جناب نثار راہی، جناب شکیل احمد رعنا، جناب اقبال احمد رعنا، جناب پروفیسر بشیر احمد ماگرے، جناب نذیر احمد قریشی، جناب محمد نذیر قریشی، جناب پروفیسر جاوید احمد مغل، میرے دوست جناب ڈاکٹر محمد لطیف میر، ڈاکٹر عبدالحق نعیمی جناب ڈاکٹر محمد اعظم، جناب ڈاکٹر محمد مرزا وقار اور میری دومنہ بولی بہنیں جو اُردو شعر وادب کی خدمت کر رہی ہیں، اُن میں ایک کا نام محترمہ زنفر کھوکھر ہے اور دوسری کا نام

محترمہ روبینہ میر ہے۔ ان کے علاوہ پورے خطۂ پیر پنچال کے لوگوں کو میں اپنے خاندان کے لوگ سمجھتا ہوں۔ خطۂ پیر پنچال کی دو اہم علمی وادبی شخصیات کہ جن کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات رہے ہیں اُنھیں اب مرحوم لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اُن میں ایک شاہباز راجوروی صاحب ہیں اور دوسرے اُن کے چھوٹے بھائی فدا راجوروی صاحب ہیں!

....

19 ،نومبر، 2018ء کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے آڈی ٹوریم میں ایک شاندار محفل موسیقی کا انعقاد کیا گیا جس میں جموں، کشمیر اور راجوری کے سنگیت کاروں اور گلوکاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے دن یعنی 20 نومبر 2018ء کو لداخ کے ایک باکمال اور ذہین شخص سونم وانگ چک سے لیکچر دلایا گیا۔ اسی طرح 2018ء میں متعدد قومی سطح کے سیمینار، کانفرنسیں اور ورکشاپس منعقد کی گئیں۔ اسی سال اکتوبر کے مہینے میں پروفیسر جاوید مسرت صاحب نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کو ہندوستان کی اہم یونیورسٹیوں کے گریڈ میں لانے کے لئے NAAC سے متعلق تمام شعبہ جات اور دیگر انتظامیہ امور میں بہترین کارکردگی سے متعلق فائل سسٹم کا سلسلہ شروع کروایا۔ پورے ایک سال تین مہینے کے بعد جب دسمبر 2019ء میں دہلی سے NAAC کی ایک معائنہ کار ٹیم بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی میں آئی تو پوری یونیورسٹی کے ماحول کو بہت زیادہ دلکش بنانے کی کوشش کی گئی اور اس طرح یونیورسٹی کو B گریڈ ملا۔ افسوس کی بات یہ کہ مارچ 2020ء کو تمام ہندوستان کی یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور دوسرے تمام تعلیمی و صنعتی ادارے کورونا وائرس جیسی عالمی وبا کے باعث بند کردیے گئے جس کی وجہ سے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کی تعمیر وترقی کا کام رک گیا اور محترم پروفیسر جاوید مسرت کے نیک ترقیاتی منصوبے ادھورے رہ گئے۔ البتہ اُنھوں نے اپنے دور میں تعمیر شدہ

عمارتوں مثلاً سینٹرل لائبریری کی عمارت، علم ریاضیات، مائکروبیالوجی کی عمارت کے علاوہ ریسرچ اسکالرس کی عمارت کا افتتاح اپنے مبارک ہاتھوں سے کیا۔

....

محترمہ محبوبہ مفتی کی سرکار جب ایک طرح کے تعطل اور بحران کی شکار ہوگئ تو ریاست میں گورنری راج نافذ کیا گیا۔ 5، اگست 2019ء کو مرکزی سرکار نے جموں وکشمیر کا دفعہ 370 (جو ریاست جموں وکشمیر کے لئے خصوصی درجے اور شناخت کا ضامن تھا) ختم کرکے ریاست کو یو۔ ٹی میں بدل دیا جس کے باعث جموں وکشمیر کی عوام رنج والم میں مبتلا ہوگئ۔ یہاں کے تمام پارٹی لیڈران کو قید وبند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ جموں وکشمیر کی سیاسی تاریخ کا یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس کے گہرے اثرات یہاں کی نسلوں پر پڑتے رہیں گے۔ کاش! دفعہ 370 کی منسوخی اور ریاستی درجہ ختم کرنے سے پہلے یہاں کے سیاسی رہنماؤں نے سیاسی ذہنیت کے نشے سے دُور رہ کر آپسی محبت اور امن واتفاق کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ نہ تو دفعہ 370 منسوخ کیا جاتا اور نہ ہی ہماری ریاست کو ختم کرکے یوٹی بنائی جاتی! گویا سیاست کے بدترین کھیل نے ہم کو اور ہماری نسلوں کو مایوس کردیا ہے۔

....

15، اکتوبر 2020ء کو پروفیسر جاوید مسرت صاحب کی الوداعی تقریب تھی میں جموں سے اپنی اہلیہ اور بچّوں کے ہمراہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری پہنچا۔ اہلیہ اور بچّے یونیورسٹی کے گیسٹ ہاوس میں ٹھہرے۔ میں کانفرنس ہال میں پہنچا۔ یونیورسٹی کے تقریباً تمام ملازمین وہاں موجود تھے۔ پروفیسر جاوید مسرت صاحب کی تقریر میں ایک درد اور سوز تھا۔ اُن کے ساتھ گزارے چار سال کا زمانہ مجھے ایک ایک پل یاد آنے لگا۔ دو بجے کے بعد میں اپنی اہلیہ اور بچّوں کو لے کر اُن کے آفس میں پہنچا۔ بچّوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ کچھ دیر تک ملاقات رہی پھر میں نے اُن سے یہ

خواہش ظاہر کی کہ میری اہلیہ اور بچّے آپ کے ساتھ ایک تصویر کھینچوانا چاہتے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بشاشت سے میرے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ تصویر کھینچوانے کے بعد ہم اُن سے رخصت ہوگئے۔ دوسرے دن میں نے پوری یونیورسٹی اپنی اہلیہ اور بچّوں کو دکھائی۔تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ہم یونیورسٹی کے احاطے میں ادھر اُدھر گھومتے پھرتے رہے۔اُس کے بعد ہم جموں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

....

مارچ 2020ء میں کورونا وائرس جیسی عالمی وبا جموں وکشمیر میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی جس کے باعث یہاں کے تمام تعلیمی، صنعتی اور تکنیکی ادارے بند کردیے گئے۔ میں راجوری سے گھر پہنچا تو ایک ہفتے کے بعد ہندوستان کے وزیر اعظم شری نریندر مودی نے پورے ملک میں لاک ڈاؤن کے احکامات جاری کردیے جس کے باعث تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں محصور ہو کے رہ گئے۔ ماسک پہننا، بار بار صابن سے ہاتھ دھونا، سماجی دُوری بنائے رکھنے کے علاوہ ہاتھوں پہ سینیٹائزر (Sanitizer ایک رقیق مادہ) کا چھڑکاؤ کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔زندگی کی تمام خوشیاں خواب وخیال ہوکے رہ گئیں۔ ہر شخص کو زندہ رہنے کی تمنا بار بار یہ احساس دلاتی رہی کہ نامعلوم کب موت آکے گلے ملے گی۔قربتیں دُوریوں میں بدل گئیں۔ غیر تو غیر اپنوں کے گھر جانے میں بھی ڈر محسوس ہونے لگا۔ یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں زیر تعلیم طلبہ وطالبات کی کلاسیں آن لائن لی جانے لگیں اور امتحانات بھی اسی طرح لیے جانے لگے۔ستم پہ ستم یہ کہ جموں وکشمیر میں دفعہ 370 کی منسوخی کے بعد تقریباً پانچ ماہ تک انٹرنیٹ کی سروس ختم کردی گئی۔ پھر بڑی خوشامد کے بعد ٹو جی(2G)انٹرنیٹ سروس رکھی گئی۔ بچّوں کی پڑھائی بہت زیادہ متاثر ہوئی۔نیٹ ورک اچانک ساتھ چھوڑ دیتا اور ہر شخص دُکھی ہو کے رہ جاتا۔ ہفتے میں ایک دو بار اشیائے خوردنی کی دکانیں مخصوص وقت پر کھول دی جاتیں۔ اسپتالوں میں

کورونا وائرس سے متاثرہ لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ بازار سے خریدی ہوئی ہر چیز کو ایک دو دن تک گھر کے برآمدے میں رکھا جاتا۔ پھل اور سبزیوں کو اچھی طرح دھو کے استعمال میں لایا جانے لگا۔ تمام عبادت گاہیں اور خانقاہیں بند کر دی گئیں۔ تمام شہروں، قصبوں یہاں تک کہ دیہاتوں میں بھی سناٹا چھا گیا۔ بڑے بڑے ارب پتی لوگوں کی تجارت اور کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ اسپتالوں سے مثبت اور منفی رپورٹوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کورونا وائرس سے مرنے والوں کی تعداد اخبارات اور سوشل میڈیا کے ذریعے لوگوں تک پہنچائی جانے لگی۔ غرضیکہ یہ احساس اندر ہی اندر نوچنے لگا کہ اب نامعلوم کورونا وائرس کب ہمارے جسم و جاں میں آ کے ڈیرا ڈال دے گا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عنایت فرمائی کہ میں نے اپنے مکان کی دوسری منزل میں لاک ڈاؤن کے دوران تین بار قرآن پاک اوّل سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ اسی دوران میں نے کورونا وائرس کو موضوع بناتے ہوئے ایک کہانی لکھی جس کا عنوان ہے ''وہ قربتیں یہ دُوریاں'' اس کے علاوہ ''ترستے ہاتھ'' ''بے ادب'' اور ''خطا کار'' جیسے افسانچے لکھے۔ مسلسل لاک ڈاؤن کے باعث گھر کے اندر رہتے ہوئے میں نے اپنے آپ میں سستی اور بوجھل پن محسوس کیا۔ بہر حال جب حالات میں معمولی سی خوشگواری پیدا ہوئی تو میں ایک روز کسی ضروری کام کے لئے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں دو دن کے لئے آ گیا۔ پوری یونیورسٹی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ہوسٹل مولانا آزاد کے کمرہ نمبر 105 میں قدم رکھا تو ڈر و خوف سا محسوس کرنے لگا۔ میں رات کو وہاں نہیں ٹھہرا گیسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ عبدالباسط نے مجھے کھانا کھلایا اور وہیں رہنے کے لئے کہا۔ دو دن یونیورسٹی میں رہنے کے بعد میں واپس گھر جموں چلا آیا۔ رفتار حیات تھمتی سی معلوم ہو رہی تھی۔ ہر روز کورونا وائرس سے مرنے والوں کی خبریں سُننے کو ملتیں۔ میں گھر میں بیٹھے بیٹھے بہت تنگ آ گیا تھا کہ ایک روز مجھے میرے دوست عرفان عارف کا فون آیا۔ اُس نے کہا ''وانی صاحب! میں نے آپ کا اشتہار بنا دیا ہے۔

آپ ''تحریک بقائے اردو'' کے فیس بک لائیو پروگرام میں آ کر اپنے آپ کو متعارف کرائیے''میں نے پہلی فرصت میں انکار کیا لیکن عرفان عارف نے میرے انکار کو اقرار میں بدلنے پر اصرار کیا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی مقررہ تاریخ پر لائیو آ گیا۔ پہلی بار مجھے سوشل میڈیا پر ایک نئے طریقے سے عوام کے سامنے آنے کا موقع ملا۔ میرے ناظرین نے میری باتیں اور ادبی سرگرمیوں پر مجھے داد تحسین سے نوازا۔ کئی ادب نواز دوستوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ایک بار پھر فیس بک لائیو پراگرام میں آ کر اپنی زندگی میں پیش آمدہ حالات و واقعات بیان کروں۔ تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ تک تحریک بقائے اردو پر جو بھی مہمان آتا وہ وہاں اکیلا اپنا تعارف کرانے کے بعد اردو کے تئیں اپنی دلچسپی اور کچھ مفید باتیں ناظرین و سامعین کے گوش گزار کرتا۔ پھر اللہ نے ہمارے لئے ایک آسانی یہ پیدا کر دی کہ بنارس کی ایک خاتون محترمہ پر یتما سنہا نے عرفان عارف کو اسٹریم یارڈ (streemyard) لینک کے ذریعے تحریک بقائے اردو کا پروگرام چلانے کی خوشخبری سنائی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ پریتما جی نے ہوسٹ کی حیثیت سے اردو کے اس پروگرام میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ہر روز شام کو پانچ بجے سے چھ بجے تک تحریک بقائے اردو کا پروگرام چلتا۔ عرفان عارف نے مجھے بھی اس پروگرام میں میزبانی کی ذمہ داری سونپی۔ میں نہایت پابندی اور دلچسپی کے ساتھ میزبانی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ بہت کچھ سیکھنے اور سوچنے کا موقع ملا۔ چند دنوں میں ہی یہ پروگرام اتنا مقبول اور مشہور ہوا کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک کے ادبا اور شعرا کے ساتھ بھی ہماری ادبی گفتگو ہونے لگی۔ البتہ جموں و کشمیر میں 4 جی نیٹ ورک نہ ہونے کی وجہ سے سلسلۂ گفتگو اچانک منقطع ہو جاتا جس کی وجہ سے کافی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ تحریک بقائے اردو کے فیس بک لائیو پروگرام کے تحت میں نے جن علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ گفتگو کی اُن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

جناب ایم۔ اے حق (رانچی) جناب مشتاق کریمی (جلگاؤں مہاراشٹر)

جناب پیارے ہتاش (جموں) جناب عبداللہ کہر(پاکستان) جناب خورشید اکرم(کلکتہ) جناب ناصر عزیز(دہلی) جناب رئیس انور(کلکتہ) جناب ڈاکٹر حمید اللہ خان(مہاراشٹر) جناب اقبال نیازی (ممبئی) جناب پرویز اعظمی (سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر) جناب حلیم صابر (کلکتہ)محترمہ ڈاکٹر بیگم ریحانہ(ممبئی) جناب سید احمد نظامی(برطانیہ) جناب الدوست ابراہیمو(آذربائجان) جناب پروفیسر آفتاب اشرف(دربھنگہ بہار) جناب فرید خان (ممبئی) جناب انصاری مبشر احمد(ممبئی)محترمہ نیل احمد(پاکستان) جناب شاہد اقبال(کلکتہ) جناب پروفیسر غلام ربانی(بنگلہ دیش) جناب احمد کمال ہاشمی (مغربی بنگال) ڈاکٹر احمد علی جوہر(بہار) اور جناب عشاق کشتواڑی(جموں) کا نام شامل ہے۔

غالباً نومبر 2020ء کے آخری ہفتے میں میرے دوست جناب ڈاکٹر ذاکر ملک بھلیسی ''تحریک بقائے اردو'' سے الگ ہوگئے اور اُنھوں نے جموں کشمیر کے چند ادبی لوگوں سے مشاورت کے بعد ''عالمی تحریک اردو'' قائم کی۔ جس کے سرپرست اعلیٰ خطہء پیر پنچال کی ایک اہم علمی، ادبی اور سماجی شخصیت جناب فاروق مضطرؔ کو بنایا گیا۔اُن کے علاوہ ذاکر ملک بھلیسی کو صدر اور مجھے مشیر بنایا گیا۔ ہمارے علاوہ تقریباً دس افراد کو الگ الگ ممبر شپ میں رکھا گیا۔اس تحریک کو عالمی سطح پر متعارف کرانے کے لئے انٹرنیٹ کی دنیا کا سہارا لیا گیا جس کی وجہ سے بہ فضل اللہ یہ تحریک تقریباً آٹھ ماہ کے اندر اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ دُنیا کے مختلف مما لک کے ادبا و شعرا نے یہ چاہا کہ ہم بھی اس تحریک میں بطور مہمان مدعو کیے جائیں۔ ہر اتوار کو شام آٹھ بجے سے نو بجے تک عالمی تحریک اردو کا فیس بک لائیو پروگرام چلایا جاتا ہے۔جس کے لئے ایک ہفتہ قبل کسی اہم علمی وادبی شخصیت کا اشتہار اُس کی ،میری اور ذاکر ملک بھلیسی کی تصویر کے ساتھ فیس بک، واٹس ایپ اور عالمی تحریک اردو کے اپنے پیج پر اپ لوڈ کیا جاتا ہے تاکہ نظرین کو آگاہی ہو اور وہ نہایت دلچسپی سے ہمارے مہمان کی علمی وادبی سرگرمیوں

سے مستفید ہوں۔ اس تحریک میں جہاں میں ایک مشیر کی حیثیت سے کام کرتا رہا تو وہیں میں ہر ہفتے میزبانی کے فرائض انجام دیتا۔ میرا طریقہء میزبانی یہ رہتا کہ میں ذاکر ملک بھلیسی سے متعلقہ مہمان کا فون نمبر حاصل کر کے واٹس ایپ پر اُس کا سوانحی خاکہ اور کتابوں کے سرورق منگوا لیتا۔ اُسی کے تناظر میں ایک سوال نامہ تیار کر کے اُسے بھیج دیتا تاکہ وہ پہلے سے ہی تیاری کر کے رکھے اور ملاقات کے وقت اُسے کسی بھی طرح کی کوفت یا ہچکچاہٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بعض اوقات جب میں اپنی ذاتی مصروفیات میں مشغول رہتا تو اپنے دوست ذاکر ملک بھلیسی کو آگاہ کرتا کہ فلاں تاریخ کو میں میزبانی نہیں کر پاؤں گا۔ بہ فضل اللہ میں نے عالمی تحریک اردو کے فیس بک لائیو پروگرام ''اردو ہے جس کا نام'' کے تحت جن اہم ادبی شخصیات سے ملاقات کی ہے اُن کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

جناب پروفیسر مولا بخش (علی گڑھ) محترمہ سمیرہ عزیز (سعودی عرب) جناب رشی خان (جرمنی) جناب انور ظہیر رہبر (جرمنی) جناب مشتاق احمد نوری (بہار) جناب طارق مرزا (سڈنی، آسٹریلیا) جناب امتیاز گورکھپوری (ممبئی) محمد طفیل (عمان) محترمہ لُبنیٰ طاہر (پاکستان) محترمہ حمیرہ گل تشنہ (امریکہ) جناب شفیق مراد (جرمنی) محترمہ شگفتہ شفیق (پاکستان) محترمہ نورین طلعت عروبہ (امریکہ) جناب ڈاکٹر کرشنا کمار (انگلینڈ) جناب افضال عاقل (بنگال) محترمہ عشرت معین سیما (جرمنی) محترمہ سیدہ کوثر (انگلینڈ) محترمہ شاہین کاظمی (سوئزرلینڈ) جناب ڈاکٹر پرویز شہریار (دہلی) جناب ملکیت سنگھ مچھانا (پنجاب) محترمہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی (دہلی) محترمہ نجمہ منصور (پاکستان) جناب حلیم صابر (مغربی بنگال) جناب احمد مسعود (برطانیہ) جناب وسیم فرحت (امراوتی) جناب تنویر اختر رومانی (جھارکھنڈ) جناب ڈاکٹر اقبال حسین (جھارکھنڈ) جناب ڈاکٹر حمید اللہ خان (مہاراشٹر) جناب ولی محمد شاہین (کنیڈا) اور جناب ڈاکٹر مخمور کاکوروی (لکھنو) جناب مجید اختر (ہیوسٹن

امریکہ) محترمہ نسیم سید (کنیڈا) اور ڈاکٹر ثاقب ہارونی (نیپال) بہ فضل اللہ یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ دیکھئے اللہ کو آگے کیا منظور ہوگا۔

....

نومبر، دسمبر 2020 میں جموں وکشمیر کے دیہاتوں میں پنچایتی راج کے لئے الیکشن کروائے گئے۔ میں گھر میں اپنے کاموں میں مصروف تھا کہ ایک شام کو مجھے ڈی سی دفتر راجوری سے فون آیا کہ میرا الیکشن ڈیوٹی کے لئے لسٹ میں نام ہے، لہٰذا آنے والے کل آپ کو ڈی سی آفس میں الیکشن ڈیوٹی کی میٹنگ میں حاضر ہونا ہوگا۔ میں تشویش میں پڑ گیا یہ سوچ کر کہ ایک طرف کورونا وائرس جیسی عالمی وبا سے لوگ گھروں میں سہمے ہوئے ہیں اور دوسری طرف حکومت پنچایتی راج کے الیکشن کروا رہی ہے!۔ بہر حال دوسرے دن صبح میں نہ چاہتے ہوئے بھی جموں سے راجوری کے لئے روانہ ہو گیا۔ راجوری میں میٹنگ کی تو پتا چلا کہ مجھے راجوری سے تقریباً 18 کیلو میٹر دُور منجا کوٹ کی طرف دریا پار منگل ناڑ کے علاقے میں تین پولینگ اسٹیشنوں کا معائنہ کار (Observor) کے طور پر تعینات کیا گیا ہے۔ میں میٹنگ ختم ہونے کے فوراً بعد منگل ناڑ علاقے کی طرف اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑا۔ جب میں منجا کوٹ پہنچا اور پتا لگایا کہ منگل ناڑ کہاں ہے تو معلوم ہوا کہ دریا پار کر کے تقریباً چار کیلو میٹر اوپر پہاڑوں کے وسط اور پاکستان کی سرحد کے قریب یہ علاقہ واقع ہے۔ یہ سنتے ہی میں وقتی طور پر پریشان سا ہوا۔ بہر کیف میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سانپ کی طرح بل کھاتی تنگ سڑک پر چلنا شروع کیا۔ چڑھائی کی طرف گاڑی چلاتے ہوئے مجھے ڈر وخوف محسوس ہوا لیکن چونکہ اللہ کے نام سے سفر شروع کیا تھا۔ اس لئے کہیں کچّی اور کہیں پکّی سڑک پر سے گزرتے ہوئے آخر کار اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ سڑک کے کنارے ایک طرف محکمۂ جنگلات سے سبکدوش ہوئے ایک رینجر صاحب کے گھر رات کو رہنا نصیب ہوا۔ اُنھوں نے بڑی عزت واحترام

کے ساتھ اپنے گھر میں رکھا۔ اُن کے بیٹے سے میری دوستی ہوگئی۔ دوسرے دن پولنگ اسٹیشنوں کا معائنہ کیا۔ سب اچھا ہی چلتا رہا۔ پولنگ کا وقت پورا ہونے کے بعد میں واپس راجوری بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے مولانا آزاد ہوسٹل میں چلا آیا۔ نومبر 2020ء کے آخری ہفتے میں میری دوبارہ ڈیوٹی پنچایتی الیکشن میں معائنہ کار کی حیثیت سے لگائی گئی۔ اس بار مجھے درہال کے علاقے میں پہاڑوں کے دامن میں کافی اونچائی پر ڈیوٹی دینی پڑی۔ رات کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے ایک چوتھے درجے کے ملازم کے پاس ٹھہرا۔ دوسرے دن واپس راجوری چلا آیا۔ الیکشنوں میں پولیس کے سپاہیوں اور فوجیوں کے علاوہ لوگوں کا ایک ہجوم دیکھنے میں آتا ہے۔ کون ہارے گا کون جیتے گا۔ اس سیاسی کھیل کو دیکھنے، سننے کے لئے لوگ بے تاب رہتے ہیں۔ لیکن مجھے ایسے موقعوں پر اکثر جگر مرادآبادی کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ؎

اُن کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

....

میں نے اسکول ایجوکیشن محکمے میں رہتے ہوئے ریاستی اور پارلیمانی انتخابات میں متعدد بار پولنگ اور پرزائڈنگ آفیسر کی حیثیت سے ڈیوٹی دی ہے۔ علاوہ ازیں پنچایتی الیکشن میں بھی ڈیوٹی دے چکا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول موڑ، مڈل اسکول چلیہاڑ، ہائی اسکول سین ٹھکراں، بٹل بالیاں اور لاٹی دھونہ میں الیکشن ڈیوٹی دی ہے۔ 2010ء میں جب مرکزی سرکار نے جموں کشمیر میں مردم شماری کروائی تو میری ڈیوٹی چھنی (ضلع ادھم پور) کے علاقہ مادا میں بحیثیت نگران لگائی گئی۔ میری نگرانی میں پانچ ٹیچر تھے جن میں کچھ پرائمری اسکولوں میں اور کچھ مڈل اسکولوں میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ طرح طرح کے لوگوں سے میرا واسطہ رہا ہے لیکن میں نے کبھی غصہ نہیں کیا ہے نہ جوش میں ہوش کھویا ہے اور نہ ہی کسی

کو بلا وجہ پریشان کیا ہے۔ یادوں کا ایک سلسلہ دل و دماغ میں محفوظ ہے۔

....

15، اکتوبر 2020ء کو پروفیسر جاوید مسرت صاحب کی رخصتی کے بعد بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں ایک طرح کا سناٹا سا چھا گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد کٹرہ ماتا ویشنو دیوی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سریندر کمار سنہا کو وقتی طور پر چارج دیا گیا۔ اُن کے پاس یہ چارج 12 فروری 2021ء تک رہا۔ اُس کے بعد 17 فروری 2021ء کو پروفیسر اکبر مسعود صاحب نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں بحیثیت وائس چانسلر جوائن کیا۔ وہ ایک اصول پرست، خوش اخلاق اور اردو شعر وادب کے شیدائی ہیں۔ اعظم گڑھ سے اُن کا تعلق ہے۔ لکھنو میں اُن کا سسرال ہے، اسی لئے لکھنوی تہذیب اُن کے مزاج میں گھل مل گئی ہے۔ جس روز اُنھوں نے جوائن کیا اُن کے استقبال کے لئے یونیورسٹی کے تقریباً تمام شعبہ جات کے اساتذہ نے باری باری اُنھیں گلدستے پیش کر کے اُن کا استقبال کیا۔ شعبہء اردو کے صدر ڈاکٹر شمس کمال انجم، میں، ڈاکٹر لیاقت حسین نیرؔ، ڈاکٹر محمد آصف ملک اور ڈاکٹر رضوانہ شمسی ہم سب نے بھی پروفیسر اکبر مسعود صاحب کو گلدستہ پیش کر کے اُن کو مبارک باد دی۔ پروفیسر اکبر مسعود صاحب کے ایک گہرے دوست اور میرے بھی شفیق و رفیق محترم پروفیسر ارتضی کریم نے دہلی سے مجھے فون پہ یہ ذمہ داری سونپی کہ میں اُن کی جانب سے ایک شال اور گلدستہ مبارک باد کے طور پر پروفیسر اکبر مسعود صاحب کو پیش کروں۔ میں نے 18 فروری 2021ء کو ایک شال اور گلدستہ پیش کرنے کے علاوہ اپنی ایک تحقیقی وتنقیدی مضامین کی کتاب ''تناظر وتفکر'' بھی پروفیسر موصوف کو پیش کی۔ پروفیسر اکبر مسعود صاحب کشمیر یونیورسٹی میں تقریباً 32 سال کا طویل زمانہ گزار چکے ہیں۔ وہ سائنس کے پرفیسر کی حیثیت سے بہترین خدمات انجام دے چکے ہیں لیکن اردو شعر وادب کے شیدائی ہیں اسی لئے انھیں کچھ عرصے تک

کشمیر یونیورسٹی کے شعبہء اردو کا صدر بھی بنایا گیا۔اُن کی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی میں آمد کے ساتھ ہی انتظامیہ اور تدریسی شعبوں میں اک ہلچل سی شروع ہوگئی۔وقت کی پابندی کے ساتھ تمام ملازمین نے اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھانا شروع کر دیں۔ پروفیسر اکبر مسعود صاحب کی وائس چانسلر شپ کا ایک تاریخ ساز کارنامہ جو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے تمام شعبہ جات میں داخلے کی فیس پچاس فی صدی کم کروادی۔کورونا وائرس کے باعث تمام ہوسٹل بند پڑے تھے۔تمام احتیاطی تدابیر کو اپناتے ہوئے آخری سمسٹر کے طلبہ وطالبات کو یونیورسٹی میں آنے کا نوٹس جاری کیا گیا۔ہوسٹل میں رہائش پذیر طلبہ کے لئے کھانا پکانے والوں کو بھی ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ ماسک ودیگر ضروری احتیاطی تدابیر کا خیال رکھیں۔اس طرح سے یونیورسٹی میں کلاس کلچر قائم کیا گیا۔پروفیسر جاوید مسرت صاحب نے 2017ء میں ایم اے اردو پروگرام شروع کروایا تھا لیکن دسمبر 2020ء میں اُنھوں نے اُسے اکیڈمک کونسل میں اردو کا شعبہ منظور کروالیا۔البتہ وہ شعبہء اردو کا آڈر نہیں نکال پائے تھے۔پروفیسر اکبر مسعود صاحب نے اپنی وائس چانسلر شپ میں باضابطہ شعبے کا آرڈر جاری کیا اور مجھ جیسے معمولی آدمی کو شعبہء اردو کا رابطہ کار(Coordinator بنایا) بنا گیا۔میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے یہ ذمہ داری سونپی جائے لیکن اس کے باوجود میرے نام حکم نامہ جاری کیا گیا۔علاوہ ازیں اسلامک اسٹڈیز پروگرام کو بھی شعبے کی حیثیت دی گئی اور ڈاکٹر نسیم گل کو اُس کا رابطہ کار بنایا گیا۔پروفیسر اکبر مسعود صاحب کی وائس چانسلر شپ کا ایک اور تاریخ ساز کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہندی، فارسی، گوجری اور پہاڑی زبانوں میں ماسٹر ڈگری پروگرام کو منظوری دی۔

....

25، اپریل 2021 کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے آئی ٹی ہال میں اُردو کا ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔مشاعرے سے پہلے میری تحقیقی وتنقیدی کتاب ''ترسیل

وتفہیم'' کی رسم رونمائی محترم پروفیسر اکبر مسعود، جناب پروفیسر جی ایم ملک، جناب پروفیسر اقبال پرویز، جناب محمد اسحاق رجسٹرار اورڈاکٹر شمس کمال انجم کے ہاتھوں ہوئی۔ شعبۂ اردو کے ایک ریسرچ اسکالر ساجد منیر نے میری اس کتاب کا تعارف تحریری صورت میں پیش کیا تھا۔تقریباً مئی 2021 کے پہلے ہفتے میں کورونا وائرس کی دوسری لہر شروع ہوگئی۔ تمام ہندستان کی جامعات کی طرح بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری بھی بند کردی گئی۔ میں جموں اپنے گھر چلا آیا۔گھر میں رہتے ہوئے کچھ عرصے کے بعد ایم اے اردو کے چوتھے اور دوسرے سمسٹر کے امتحانات آن لائن شروع کئے گئے۔ تفصیلی سوالات کے بجائے 60 معروضی سوالات کے پرچے تیار کروائے گئے۔ امتحان کی تاریخ اور دوسرے ضروری امور کی ترسیل وآگہی سب آن لائن ہونے لگی۔ میں ذاتی طور پر اپنے عزیز ساتھی ڈاکٹر محمد آصف ملک اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو کا شکر گزار ہوں کہ اُس میرے ساتھی نے گھروں میں بیٹھے طلبہ کے لئے تیار کیا ہوا سوال نامہ بذریعہ لینک بھیجنے کی ذمہ داری نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی سے نبھائی۔ وہ مجھ سے طلبہ کا ارسال کردہ جوابی لینک Award Roll کی صورت میں بھیجتے اور میں تمام طلبہ کے رول نمبر اور اُن کے حاصل شدہ نمبرات کو چیک کرنے کے بعد رابطہ کار کی مہر ثبت کرکے محترمہ نبیلہ نازنین ڈپٹی کنٹرولر کی میل پر بھیج دیتا۔کورونا وائرس کی دوسری لہر کے لاک ڈاؤن میں، میں نے متعدد ادبی مضامین لکھے۔اُن کے علاوہ ''آج میں کل تُو''۔ ''زندہ ماتم''۔''لاٹھی پہ ٹکا وجود''۔ ''کاربے کاراں''۔ ''پندرہ سولہ'' اور ''کورونا کلچر'' جیسے افسانے لکھے۔کورونا وائرس کی دوسری لہر میں کئی لوگ دُنیا سے چل بسے۔خاص کر اردو کے بڑے ادیب وشاعر راحت اندوری، پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر مولا بخش، مشرف عالم ذوقی، شوکت حیات، ترنم ریاض، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر بیگ احساس اور مولانا وحید الدّین خان جیسے جید عالم دین وفات

پا گئے۔ میں نے مارچ 2021ء سے اگست 2021ء تک شعبہء اردو کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ میرے ہی دور میں تین ریسرچ اسکالروں عرفان احمد ٹھوکر، ظفر اقبال نحوی اور سائمہ قیوم میر نے اپنے تحقیقی مقالے یونیورسٹی میں جمع کرائے۔ اُس کے بعد ڈاکٹر شمس کمال انجم صاحب کو یہ اعزاز دوبارہ حاصل ہوا کہ اُنھیں شعبہ اُردو کا صدر منتخب کیا گیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی، میں نے شکرانے کے طور پر دو نفل پڑھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر سے ایک بھاری ذمہ داری اُٹھوا دی۔

....

2021 میں میرے نام لکھے گئے مشاہیر ادب کے خطوط کو کشمیر کے ایک نوجوان محمد یونس ٹھوکر طہٰ نے ''خوشبوؤں میں بسی یادیں'' کے نام سے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع کرایا۔ یہ کتاب 167 صفحات پر مشتمل ہے جو ادبی حلقوں میں اپنے نام و مواد کے لحاظ سے بہت پسند کی گئی ہے۔ غالباً جولائی 2021ء میں میزان پبلشرز سری نگر (کشمیر) نے بیک وقت میری تین کتابیں ''تنقیدی فکر و فن'' (تحقیقی و تنقیدی مضامین) ''کہکشان خیال'' (تحقیقی و تنقیدی مضامین) اور ''زبان و بیان'' (تحقیقی و تنقیدی مضامین) اپنے ادارے سے شائع کرائیں۔ ان کتابوں کی اشاعت سے مجھے بہت زیادہ خوشی اس لئے ہوئی کہ میزان پبلشرز نے انھیں اپنے خرچے پر شائع کیا تھا۔ یہ بات بھی میری خوشی میں شامل ہے کہ 2021ء ہی میں میری اہلیہ اردو کی سینئر لیکچرر گریڈ میں آئی۔

....

اگست 2021ء میں ایک اتوار کو میں نے تحصیل بدھل دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی سے اپنی گاڑی میں سوار ہوا۔ ایک خوب صورت پہاڑی سلسلے کی سیر کرتے ہوئے میں جب کوٹ رنکا پہنچا تو اسلامک اسٹڈیز کا ایک شریف ریسرچ اسکالر محمد اعظم میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ میری گاڑی میں بیٹھا۔ اونچے اونچے

پہاڑی سلسلے کو عبور کرتے ہوئے ہم نے بدھل اور کوٹ رنکا کے درمیان سڑک سے نیچے ایک جگہ مچھلی گھر دیکھا۔فوٹو کھینچے۔دُور دُور تک ہرے بھرے مکئی اور دھان کے کھیت دیکھے۔پھر جب ہم خاص بدھل پہنچے تو وہاں کا ڈگری کالج دیکھنے چلے گئے۔کالج کی جگہ اور عمارت بہت اچھی معلوم ہوئی۔ایک ہوٹل پہ میں نے اور اعظم نے دن کا کھانا کھایا۔اُس کے بعد نمازِ ظہر وہاں کی جامع مسجد میں پڑھی۔تقریباً دن کے چار بجے ہم واپس راجوری کی طرف چل پڑے۔اعظم، کوٹ رنکا کے پیٹرول پمپ پر اُتر گیا اور میں رات کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے مولانا آزاد ہوسٹل میں آ گیا۔

....

2، 3 نومبر 2021ء کو گڑہنگل (مرمت) میں میرے سگے بھانجے آزاد کی شادی ہوئی تو میں یکم نومبر کو ہی اپنی اہلیہ اور بچوں کے ساتھ مرمت اپنے آبائی علاقے میں چلا گیا۔میرے بڑے بھائی نذیر احمد وانی، بھابھی، اُن کا بیٹا، بہو اور پھول جیسے دو پوتے ساحر اور ذیشان بھیا کی گاڑی میں تھے اور ہم اپنی گاڑی میں۔عسر (ضلع ڈوڈہ) چیک پوسٹ پر جونہی پہنچے تو ایک پولیس سب انسپکٹر نے میرے بیٹے رضا الرحمٰن کی گاڑی کا کورٹ چالان کردیا۔ چالان اس بات پر کیا کہ ہماری گاڑی کے آلودگی سرٹیفکیٹ کی تاریخ ختم ہوچکی تھی۔اُس نے ہمیں جلد بازی کی وجہ سے خواہ مخواہ مصیبت میں ڈالا۔ہمیں ڈوڈہ کا چکر لگانا پڑا لیکن عدالت میں متعلقہ آفیسر نہ ہونے کی وجہ سے ہم گڑہنگل کی طرف چلے گئے۔ 3 نومبر 2021ء کو برات تھی۔ میں اور میرا بیٹا براتیوں میں شامل تھے۔ برات گوہا سے ہوتے ہوئے میری اپنی جائے پیدائش سروال، گاؤں بہوتہ جارہی تھی۔میری سب سے بڑی خالہ کی پوتی، محمد الطاف وانی کی بیٹی کے گھر یہ برات جارہی تھی۔ میں جب گوہا پہنچا تو اپنی پڑھائی کے دن یاد آئے وہ گلیاں، کھیت کھلیان اور اپنے اساتذہ یاد آنے لگے۔پھر جب ہم درنگا پہنچے تو اپنے وہ سارے دوست وساتھی یاد آنے لگے جن کے ساتھ میں جون، جولائی کے مہینے میں

درنگا نالے پر نہایا کرتا تھا۔ کچھ ہی وقت کے بعد برات گواڑی (بہوتہ) پہنچی۔ میرے خاندان کے چاچے، چاچیوں، چچیرے بھائیوں، بہنوں اور گاؤں کے کئی بزرگوں اور جان پہچان والوں سے ملاقات ہوئی۔ مجھے اپنا بچپن، لڑکپن، جوانی اور ملازمت کا زمانہ یاد آیا۔ علاقہ مرمت کے پہاڑوں، ندی نالوں، جنگلوں، بیابانوں، اوبڑ کھابڑ راستوں، مکئی اور دھان کے کھیتوں کو دیکھتے دیکھتے خیالوں ہی خیالوں میں میرے پورے وجود پہ مایوسی کی اک لہر دوڑ گئی۔ میری آنکھیں میرے گاؤں، خاندان اور علاقے کے بہت سے مرحومین کو دیکھنے کے لئے ترس رہی تھیں! یہ سوچ کے رہ گیا کہ آخر دُنیا سے جانے والے چلے جاتے ہیں کہاں!

....

15 دسمبر 2021ء کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے آڈی ٹوریم میں یوم تاسیس کی تقریب نہایت دھوم دھام سے منائی گئی۔ اسی پروگرام میں میرے افسانوں کا چھٹا مجموعہ ''آج میں کل تُو'' اور ڈاکٹر شمس کمال انجم کی تالیف کردہ کتاب ''بیاباں سے گلشن ہزار رنگ تک'' (بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی اور اُس کے بانی وائس چانسلر ڈاکٹر مسعود احمد چودھری پر مبنی) کو وائس چانسلر محترم پروفیسر اکبر مسعود، پروفیسر جی ایم ملک، پروفیسر اقبال پرویز اور رجسٹرار محمد اسحاق کے ہاتھوں اجرا کیا گیا۔ یوم تاسیس پروگرام کی شروعات ڈاکٹر ذاکر ملک بھلیسی کی تیار کردہ صدابند تصویری ویڈیو کے ساتھ کی گئی تھی اس ویڈیو میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کا مختصر تاریخی پس منظر بیان کیا گیا تھا۔

28، اکتوبر 2021ء تک جناب ڈاکٹر شمس کمال انجم شعبۂ اردو کے صدر رہے۔ اُس کے بعد جب اُنھیں ایسوسی ایٹ ڈین بنایا گیا تو اُنھوں نے وائس چانسلر محترم پروفیسر اکبر مسعود کی خدمت میں اپنی عرضی پیش کی کہ وہ اردو کے کسی اسسٹنٹ پروفیسر کو رابطہ کار (Coordinaror) بنائیں۔ بہر حال اُن کی عرضی کو شرف قبولیت

حاصل ہوگیا جس کے نتیجے میں ڈاکٹر لیاقت حسین نیّر اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو کو رابطہ کار (Coordinaror) کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اُن کے دور میں عرفان احمد ٹھوکر، ظفر اقبال نحوی اور سائمہ قیوم میر کا زبانی امتحان (Viva Voce) ہوا۔ 10 جنوری 2022ء کو عرفان احمد ٹھوکر کا آن لائن وائیوا ہوا، اُس کے ممتحن جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ اکرام الدّین تھے۔ 11 جنوری 2022ء کو ظفر اقبال نحوی کا آن لائن وائیوا ہوا، اُس کے ممتحن کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر جناب پروفیسر دبیر احمد تھے۔ 18 جنوری کو سائمہ قیوم میر کا آن لائن وائیوا ہوا، اُس کے ممتحن سابق صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے پروفیسر قدوس جاوید تھے۔ اس طرح بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے شعبۂ اردو کے یہ پہلے تین ریسرچ اسکالرس ہیں جنھیں 2022 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔

....

دسمبر 2021ء میں ڈاکٹر محمد حسین وانی کے تحقیقی مقالے ''مشتاق احمد وانی: حیات اور ادبی خدمات'' کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے اشاعت کے لئے 54000 روپے مالی تعاون کے طور پر منظور کئے۔ یہ بات میرے اور ڈاکٹر محمد حسین وانی کے لئے بہت بڑی خوشی کی بات ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر محمد حسین وانی کو دسمبر 2018ء میں اندور یونیورسٹی (مدھیہ پردیش) نے ''مشتاق احمد وانی: حیات اور ادبی خدمات'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کردی تھی۔ وہ اپنے اس تحقیقی مقالے کو کتابی صورت دینا چاہتا تھا جس کے لئے وہ مالی طور پر تیار نہیں تھا۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی) کو میں اور ڈاکٹر محمد حسین وانی تادم حیات نیک دُعاؤں میں یاد رکھیں گے کہ جس مخلص اور علم وادب کے شیدائی نے اس مقالے کو اس لائق سمجھا کہ اسے مالی معاونت دی جائے۔ بہر حال ڈاکٹر محمد حسین وانی کا تحقیقی مقالہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے

جنوری 2022ء میں دیدہ زیب کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ میرے نام و پتے پہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی نے 20 کاپیاں جموں بھیج دیں۔ کتاب کو دیکھ کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ مجھ جیسے معمولی آدمی کو اللہ نے کتنی عزت دی، شہرت دی اور کیا کیا نہ دیا۔ اس احساس نے مجھے یہ سوچنے پر آمادہ کیا کہ اگر میں زمین کے چپے چپے پر ناک رگڑتے ہوئے اللہ کا نام لے لے کر سجدہ کروں تب بھی میں اللہ کا شکر ادا نہیں کر پاؤں گا۔ دراصل یہ سب اللہ کی مجھ پہ نظر کرم ہے کہ میں نے جس بھی نیک کام کو کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد قدم قدم پہ میرے شامل حال رہی۔ 2022ء جنوری ہی میں میرے شاگرد ڈاکٹر ظفر اقبال نحوی نے میری ادبی تصانیف پر لکھے مشاہیر ادب کے مضامین کو ''مشتاق احمد وانی کی فنکارانہ صلاحیتیں'' کے نام سے ترتیب دیا اور اس کتاب کو بھی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ہی نے شائع کیا۔ اس کتاب میں 36 قلمکاروں کے مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کے اندرونی و بیرونی گیٹ اپ کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ میرے دل سے بے ساختہ طور پر اپنے عزیز شاگرد ڈاکٹر ظفر اقبال نحوی کے لئے نیک دُعائیں نکل گئیں۔ اللہ اُس محنتی اور شائستہ نوجوان کو کامیابیوں سے نوازے، آمین! اس کے علاوہ اپریل 2022ء میں ڈاکٹر ظفر اقبال نحوی نے میرے تبصرے، تجزیے اور انٹرویوز کو ''ہر لفظ سے خوشبو آئے'' کے نام سے مرتب کر کے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع کرایا۔ 2022ء ہی میں ڈاکٹر ظفر اقبال نحوی نے ''مشتاق احمد وانی کے بہترین افسانے'' اور ''مشتاق احمد وانی کی افسانوی کلیات'' شائع کی۔ میں نے 22-2021 میں جتنی بھی کتابیں شائع کروائیں وہ یکے بعد دیگرے محترم پروفیسر اکبر مسعود کو پیش کیں۔ اُنھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے مبارک باد دی۔ وائس چانسلر محترم اکبر مسعود شریف، محنتی اور اصول پرست آدمی کو بہت پسند کرتے ہیں۔

....

17 فروری 2022ء کو جب میں جموں سے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں آیا تو میں نے اُسی دن ڈاکٹر ظفر اقبال نحوی کی مرتب کردہ کتاب ''مشتاق احمد وانی کی فنکارانہ صلاحیتیں'' محترم پروفیسر اکبر مسعود وائس چانسلر کو پیش کی۔ اُن کے خوبصورت کشادہ کمرے میں جناب پروفیسر اقبال پرویز ڈین آف اکیڈمک افیئرس اور جناب محمد اسحاق رجسٹرار بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ محترم پروفیسر اکبر مسعود مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ کتاب دیکھ کر مجھے مبارک بادی۔ پھر میں نے اُن سے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ کے ساتھ ایک تصویر کھچوانے کی تمنّا ہے۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے، جناب اقبال پرویز اور جناب محمد اسحاق کو بھی اپنے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو کھچوانے کو کہا۔ میری یادوں کے البم میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ پھر اُنھوں نے قہوہ منگوایا ہم سب قہوہ پینے لگے۔ اُنھوں نے بہت مفید باتیں بتائیں۔ میرا دل خوش ہوا۔ اسی روز ایک بجے اُنہی کی فرمائش پر آئی ٹی کانفرنس ہال میں مشاعرہ رکھا گیا تھا۔ جس میں یونیورسٹی اور راجوری قصبے سے تعلق رکھنے والے شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔

....

21 فروری 2022ء کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے ایک کم گو، ذہین، خوش اخلاق، محنتی، انگریزی، اردو اور گوجری کے امام چالیس کتابوں کے مصنف جناب ڈاکٹر رفیق انجم کا ایک ایسا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا کہ جو اُنھوں نے جاگتی آنکھوں ایک طویل مدت سے دیکھا تھا اور اُن کا وہ خواب تھا کہ یونیورسٹی میں گوجری، پہاڑی اور کشمیری ان تینوں زبانوں کا ایک خاص مقام پہ ریسرچ سینٹر ہو۔ اللہ کے فضل سے جناب ڈاکٹر رفیق انجم کی انتھک محنت اور کوششیں رنگ لائیں کہ اُنھوں نے بڑے ذوق وشوق سے اس سینٹر کو یونیورسٹی کے احاطے ہی میں سب رنگ کے پاس محترم وائس چانسلر پروفیسر اکبر مسعود کے ہاتھوں افتتاح کرایا۔ 21 فروری چونکہ دُنیا میں یومِ مادری زبان کے طور پر منایا جاتا ہے، اس لئے

اُس روز ایک مخلوط مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں جناب ڈاکٹر شمس کمال انجم نے صدارت کی۔ ڈاکٹر رفیق انجم نے گوجری میں غزل سنائی، پرویز ملک نے پہاڑی میں، ڈاکٹر لیاقت حسین نیرؔ نے بھی پہاڑی میں اپنا کلام سنایا، ڈاکٹر نسیم گل نے کشمیری میں، میں نے اپنی رفیقۂ حیات کی مادری زبان ڈوگری میں نظم سنائی۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم نے عربی اور اردو میں غزل ترنم سے سُنائی۔ ڈاکٹر رفیق انجم کی ایک تمنا یہ بھی تھی کہ یونیورسٹی کے کوارٹروں میں رہائش پذیر ملازمین کے بچّوں کے کھیلنے کے لئے کوئی پارک ہو۔ دسمبر 2021ء کے آخری ہفتے ہیں اُنھوں نے وائس چانسلر محترم پروفیسر اکبر مسعود سے مشورہ کرکے سب رنگ کے قریب ایک خالی پڑی جگہ کو ''بازیچۂ اطفال'' کا نام دیا اور وہاں ایک پارک تعمیر کروائی۔

....

3/ مارچ 2022ء کو میں ان شا اللہ اس دُنیا میں 62 سال کی عمر کا ہو جاؤں گا۔ یعنی اس جہان فانی کے سرد و گرم موسم، یہ چاند، سوج اور ستارے، آگ، پانی اور ہوا، شہروں اور دیہاتوں کی زندگی، چرندے، پرندے اور درندے، دشت وصحرا، پہاڑ، دریا، ندی نالے اور سمندر غرضیکہ ان تمام مظاہر فطرت کو دیکھتے دیکھتے اور زندگی کے مسائل ومعاملات کو سلجھاتے سلجھاتے اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں بالکل اُسی پھلدار پودے کی مانند کہ جو گردش دوراں میں تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پھل دیتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اُس میں پھل دینے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اُس کی شاخیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں اور بالآخر وہ ایک ٹھونٹھ کی طرح رہ جاتا ہے۔ مجھے خوشیوں، تلخیوں، ناانصافیوں اور کامیابیوں کے شیریں وکڑوے گھونٹ پینے کا موقع ملا۔ لیکن بہ فضل اللہ میں نے ہمت وحوصلے سے کام لیا۔ میں اللہ کے رحم وکرم سے زندہ تھا، زندہ ہوں زندہ رہوں گا۔ یعنی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک حلال ختم نہیں ہوگا حرام نہیں کھاؤں گا اور جب تک سچ ختم نہیں ہوگا جھوٹ نہیں بولوں

گا۔اللہ رب العزت نے چاہا تو میں 31 مارچ 2022ء کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے شعبہء اردو سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر سبکدوش ہو جاؤں گا۔کل کیا ہوگا ؟یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ دنیا اُمید وں پہ قائم ہے۔ میں یہ سطور 18 فروری 2022 کو رات کے 9 بجے لکھ رہا ہوں۔

....

زندگی کے سفر میں مجھ سے کون کہاں ملا اور کہاں بچھڑ گیا۔ یہ ذکر کرنے بیٹھوں تو سینکڑوں صفحات کی ضرورت پڑے گی۔ میں نے دوستی کے نام پہ دشمنی کا زہر بہت پیا ہے۔ البتہ یہ بات میری خوشی اور خوش نصیبی میں شامل ہے کہ میری دوستی کا حلقہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند تک پھیلا ہوا ہے۔ادب کی دُنیا میں سانس لینے والوں میں جن کے ساتھ میرے ادبی تعلقات رہے ہیں اُن میں صوبہ جموں کے جناب نذیر قریشی، محمد نذیر قریشی، عبدالسّلام بہار، ولی محمد بٹ اسیر کشتواڑی (اسیر کشتواڑی صاحب انتہائی ذہین، محنتی، مخلص اور جموں کشمیر کے حوالے سے ایک اہم قلم کار کی حیثیت سے معروف ہیں)، جناب جگدیش راج رانا عشاقؔ کشتواڑی، خالد حسین، بلراج بخشی، آنند سروپ انجم، آنند لہر (مرحوم) محمد امین بنجارا (بنجارا صاحب کے بھی مجھ پر بہت سے احسانات ہیں) ٹی آر۔رینہ، محمد امین بانہالی، مشتاق فریدی، ڈاکٹر لیش پال شرما، ڈاکٹر کرن سنگھ، پیارے ہتاش، اوم پرکاش شاکر، شام طالب، ہریش کیلا، کے ڈی مینی، ذلفقار علی نقوی، ڈاکٹر دلجیت ورما، ڈاکٹر عاشق چودھری، ڈاکٹر مول راج، پروفیسر مشتاق قادری، ڈاکٹر جاوید راہی، ڈاکٹر شاہد رسول، ڈاکٹر امجد علی بابر، جہانگیر اصغر، سوتنتر دیو کوتوال، مہاراج کرشن، نواب دین کسانہ، ڈاکٹر طارق تمکین کشتواڑی، ڈاکٹر شاہ نواز، ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی، ڈاکٹر محمد اعظم، نثار راہی، خورشید احمد بسمل، پروفیسر بشیر ماگرے، پروفیسر جاوید مغل، ایم کے وقار، ڈاکٹر شکیل رعنا، اقبال رعنا، اقبال نازش، عبدالقیوم نائیک، عمر فرحت، علمدار عدم، ڈاکٹر

ریاض احمد پونچھی، الطاف حسین جنجوعہ، ارشد کسانہ (میرے اس عزیز نے میرے افسانوں کو یوٹیوب کے ذریعے عوام تک پہنچانے میں میرا ساتھ نبھایا ہے) محتشم احتشام، منشور بانہالی، جان محمد مدیر روزنامہ "لازوال"، طارق جنجوعہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کے پرفیسر محمد ریاض احمد (صدر شعبۂ اُردو)، ڈاکٹر چمن لعل بھگت، ڈاکٹر عبدالرشید منہاس اور محترمہ ڈاکٹر شمیم فرحت میرے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔ میں اپنے دو عزیز شکتی دیوی کہ جس نے پروفیسر محمد ریاض احمد کی نگرانی میں جموں یونیورسٹی سے 2011ء میں مشتاق احمد وانی "بحیثیت افسانہ نگار" کے موضوع پر ایم فل کی ڈگری حاصل کی اور محمد ارشد کو بھی کا نام درج کرنا اپنا فرض سمجھا ہوں کہ اس نے بھی حیدرآباد یونیورسٹی سے 2015ء میں محترمہ ڈاکٹر عرشیہ کی نگرانی میں "مشتاق احمد وانی بحیثیت افسانہ نگار" کے موضوع پر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔

....

میرے سسرالی قصبہ چھننی میں جن احباب کے ساتھ میرا وقت گزرا ہے یا جن کو میں نے اپنی طبعیت کے ہم آہنگ پایا ہے اُن میں جناب پرشوتم چند اتال، جناب راجندر چند اتال رٹائرڈ زونل ایجوکیشنل آفیسر چھننی، جناب اشوک کمار کھجوریہ، سریندر کمار رٹائرڈ لیکچرر اقتصادیات اور سدھ مہادیو کے کلدیپ کمار کساتہ کہ جن کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات برقرار ہیں۔ میں جناب پرشوتم چند اتال رٹائرڈ لکچرر انگریزی کا شکریہ ادا کرنا لازمی سمجھتا ہوں کہ جس زمانے میں، میں ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی سے اردو میں ڈی لٹ کر رہا تھا تو فارم بھرنے سے لے کر ڈگری تفویض ہونے تک بہت سے دفتری دستاویزات میں نے انگریزی میں اتال صاحب سے لکھوائے تھے۔ اُن کی شرافت اور سلیقہ شعاری نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اسی طرز فکر و طرز عمل کے جناب اشوک کمار کھجوریہ بھی ہیں وہ چھننی ہائر اسکنڈری

اسکول میں انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

....

جموں اور راجوری کے درمیان دریا کے کنارے ایک خوب صورت شہر بسا ہے جسے اکھنور کہتے ہیں یعنی آنکھ کا نُور۔اس شہر میں میرے ایک دوست جناب اوم پرکاش شاکر (او پی شاکر) رہتے ہیں۔ اردو کے افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے لوگ اُنھیں جانتے ہیں۔شرافت، سادگی اور سفید کاغذ جیسا دل و دماغ رکھنے والے اس شخص کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات میری یادوں کے البم میں محفوظ ہیں۔ ہماری فون پہ آپس میں باتیں ہوئی ہیں اور گاہے بگاہے ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں۔

....

جموں کے مقابلے میں کشمیر میں میرے ادب نواز و ادب شناس بزرگوں اور دوستوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کشمیر کے وہ ادبا و شعرا کہ جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی یا جن کی تحریریں پڑھ کر میں نے لکھنا سیکھا، اُن میں جناب نُور شاہ، غلام نبی خیال، محمد یوسف ٹینگ، فاروق نازکی ،ایاز رسول نازکی ،شبنم قیوم، شیخ بشیر احمد، وحشی سعید، پروفیسر محمد زماں آزردہ، رفیق راز، شفق سوپوری، نذیر آزاد، ڈاکٹر نذیر مشتاق، نذیر جوہر، راجہ نذر بونیاری، پریمی رومانی، دیپک کنول، ابن اسماعیل، اشرف آثاری، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی، ڈاکٹر تسکینہ فاضل، دیپک بُدکی، پروفیسر بشیر احمد نحوی، علی شیدا، رحیم رہبر، مقبول فیروزی، اشرف عادل، بشر بشیر، ستیش وِمل، ترنم ریاض، شبنم عشائی، رخسانہ جبیں، نسرین نقاش، زاہد مختار، جاوید آزر، ش م احمد، عرفان ترابی، کے علاوہ میرے ہم عمر و ہم عصر دوستوں میں ڈاکٹر پرویز اعظمی، ڈاکٹر راشد عزیز، ڈاکٹر نصرت جبیں اور ڈاکٹر الطاف نقش بندی، پرویز مانوس، ڈاکٹر ریاض توحیدی، ناصر ضمیر، راجہ یوسف، طارق شبنم، سلیم سالک، سلیم ساغر، ڈاکٹر مشتاق حیدر، ڈاکٹر عرفان عالم، ڈاکٹر الطاف انجم، ڈاکٹر منصور احمد منصور، ڈاکٹر گلزار احمد وانی، نیلوفر ناز نحوی، ڈاکٹر نگہت

فاروق نظر، ڈاکٹر فیض قاضی آبادی، ڈاکٹر محمد اقبال لون، خالد بشیر تلگامی، ڈاکٹر شاہ فیصل، مشتاق مہدی، ڈاکٹر محمد شفیع ایاز، ڈاکٹر فلک فیروز، ڈاکٹر فردوس احمد بٹ، سبزار احمد بٹ، سہیل سالم، زاہد ظفر اور بشیر اطہر خانپوری یہ وہ ادیب ہیں جن کو میں نے اخبارات ورسائل میں کہیں کہیں ضرور پڑھا ہے۔ نئی نسل میں بھی کچھ باصلاحیت نوجوان اردو ادب کی طرف بڑی شان وشوکت سے آرہے ہیں۔ اُن میں ڈاکٹر محمد حسین وانی، ڈاکٹر غلام نبی کمار، ارشد کسانہ، الیس معشوق احمد اور ڈاکٹر محمد یونس ٹھوکر شامل ہیں۔

صوبہ لداخ میں عبدالغنی شیخ لداخی اردو ادب کا ایک مینار ہے جن کی ادبی خدمات کا اعتراف ملک بھر کے اہم ناقدین ومحققین نے کیا ہے۔ میں نے ذاتی طور پر عبدالغنی شیخ لداخی کی بہت سی کہانیاں اور مضامین پڑھے ہیں۔ ایک اچھے ادیب کی تمام خوبیاں اُن میں موجود ہیں۔ عبدالرّشید راہگیر اور شبیر مصباحی بھی لداخ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نام سے میں واقف ہوں اور فون پر بھی اُن سے باتیں ہوئی ہیں۔

آیئے اب میں آپ کو جموں کشمیر سے باہر کے اُن ادیبوں، شاعروں اور میرے خیر خواہوں کے بارے میں بتاؤں کہ جو میرے حلقہء احباب میں شامل ہیں۔ میں یہاں اُن تمام دوست واحباب کے نام بھی درج کروں گا جو اب دُنیا میں نہیں ہیں اور اُن کے نام بھی جو حال حیات ہیں۔ مشرقی پنجاب (چندی گڑھ) کے مشہور فکشن نگار کشمیری لال ذاکر (آنجہانی)، شرون کمار ورما (آنجہانی) ڈاکٹر نریش، سلطان انجم، محترمہ رینو بہل، محمد بشیر ملیر کوٹلوی، سالک جمیل براڑ، روبینہ شبنم، ملکیت سنگھ مچھانا، اشرف محمود نندن، کیول دھیر، ایم انوار انجم کا تعلق ملیر کوٹلہ پنجاب سے ہے۔

دہلی، ہندوستان کا دل کہی جاتی ہے۔ اس بڑے شہر اور ہندوستان کے دارالخلافہ میں ادیبوں کی ایک بہت بڑی دُنیا آباد ہے۔ میرا جن ادیبوں سے واسطہ رہا ہے اُن میں بہت سے اب اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی (مرحوم) آنجہانی

محترم پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر خلیق انجم (مرحوم)، پروفیسر غضنفر علی، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر خالد اشرف، فاروق ارگلی، حقانی القاسمی، خان رضوان، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر محمد حسن (مرحوم)، پروفیسر انور پاشا، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، نگار عظیم، مخمور سعیدی (مرحوم)، مشتاق صدف، کوثر مظہری، انیس امروہوی، پریم گوپال متل، صدیق الرحمٰن قدوائی، شاہد حسین، جوگندر پال (آنجہانی)، پروفیسر محمد صادق، پروفیسر قمر رئیس (مرحوم)، اظہار اثر (مرحوم)، اقبال انصاری، پروفیسر عتیق اللہ، خواجہ اکرام الدّین، علی جاوید (مرحوم)، انجم عثمانی (مرحوم) رفعت سروش (مرحوم) اے۔آر۔رحمٰن، ڈاکٹر پرویز شہریار اور ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی۔

میرٹھ میں میرے دوست اور مشہور فکشن نگار پروفیسر اسلم جمشید پوری، بی ایس جین جوہر (آنجہانی)، ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور ڈاکٹر ابراہیم افسر کو میں بہتر جانتا ہوں۔اسی طرح علی گڑھ میں پروفیسر ابولکلام قاسمی (مرحوم) مجیب شہزر، رفیق شاہین، طارق چھتاری، احمد رشید، قاضی عبدالسّتار (مرحوم) صلاح الدین پرویز (مرحوم) شافع قدوائی، جبار راجن (مرحوم) پروفیسر محمد زاہد (مرحوم) پروفیسر شہاب الدّین ثاقب کو میں جانتا ہوں۔ رام پور میں میرے انتہائی شفیق، مخلص اور میرے خیر خواہ ڈاکٹر شریف احمد قریشی صاحب کے احسانات میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ ڈاکٹر اطہر مسعود کے ساتھ بھی میری رفاقت ہے۔ ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی کے آر۔کے۔ ناگر اور رتن لعل مجھے یاد ہیں۔اُن کے ساتھ میں نے موبائل فون پہ اور بالمشافہ بھی ملاقاتیں کی ہیں۔ ڈاکٹر محمد مستمر میرا دوست ہے۔الہ آباد میں پروفیسر علی احمد فاطمی، شائستہ فاخری، نظام صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی (مرحوم) اور اجے مالوی کو میں نے دیکھا ہے اُن سے باتیں ہوئی ہیں۔

بہار سے تعلق رکھنے والے اردو ادب کے جن ستاروں سے میں نے روشنی

حاصل کی ہے، اُن میں مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ اُن کے علاوہ عبدالصّمد ، مشتاق احمد نوری، اختر آزاد، شوکت حیات (مرحوم)، حسین الحق (مرحوم) امتیاز احمد کریمی، شموئل احمد، ڈاکٹر حسن رضا، منصور خوشتر، پروفیسر وہاب اشرفی (مرحوم)، محترمہ ذکیہ مشہدی، قمر جہاں، ولی اللہ ولی، ڈاکٹر مشتاق احمد، مراق مرزا، محمد کاظم، گوہر شیخ پوروی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، قاسم خورشید، عطا عابدی، فاروق راہب (مرحوم) الیاس احمد گدی (مرحوم)، علیم اللہ حالی، عبدالحی خان اور شاہد اختر، قسیم اختر، ڈاکٹر احمد علی جوہر، پٹنہ یونیورسٹی سے وابستہ ڈاکٹر اسلم آزاد، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پروفیسر جاوید حیات، ڈاکٹر زرنگار یاسمین محترمہ کہکشاں انجم، محترمہ کہکشاں پروین اور احمد صغیر۔ جھارکھنڈ میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ڈاکٹر اقبال حسین، شان بھارتی (مرحوم) ایم اے حق (مرحوم) مدراس میں علیم صبا نویدی اردو شعروادب کے ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی بہت سی کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔

لکھنو میں رام لعل (آنجہانی) انیس اشفاق، پروفیسر فضل امام (مرحوم) مخمور کاکوروی، عذرا پروین صاحبہ، غزال ضیغم، ریحانہ عاطف خیر آبادی، حیدر آباد میں میرے چاہنے والوں میں مجتبیٰ حسین (مرحوم) پروفیسر بیگ احساس (مرحوم) ڈاکٹر محمد انوار، پروفیسر مجید بیدار، پروفیسر ابوالکلام، محترمہ ڈاکٹر عرشیہ اور افروز سعیدہ۔ مہاراشٹر میں پروفیسر حمید اللہ خان، محترمہ صادقہ نواب سحر، نورالحسنین، معین الدّین عثمانی، پونے میں نذیر فتح پوری، ڈاکٹر محبوب راہی، خلیل انجم (مرحوم) مالیگاؤں میں ہارون اختر، ایم مبین، عتیق احمد عتیق، احمد عثمانی (مرحوم) ہارون بی اے (مرحوم)۔ بمبئی میں افتخار امام صدیقی (مرحوم) سلام بن رزاق، امتیاز گورکھپوری اور نور جہاں نور۔ بنگلور میں محترمہ فریدہ رحمت اللہ، راجستھان میں محمد شاہد پٹھان، ثروت خان صاحبہ اور عزیز اللہ شیرانی کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات ادبی بنیادوں پر قائم ہیں۔ آگرہ میں دل تاج محلی اور سید اختیار جعفری، محمد قیوم میئو (مرحوم)۔ کلکتہ میں نوشاد

مومن، شبیر احمد، حلیم صابر، محترمہ شہناز نبی اور پروفیسر دبیر احمد۔ وشاکھا پٹنم میں عثمان انجم (مرحوم)۔ مدھیہ پردیش کے عبدالوحید واحد اور رونق جمال۔ ہماچل پردیش میں ڈاکٹر شباب للت (آنجہانی) اور ڈاکٹر یوگ راج میرے چاہنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بنارس میں جاوید انور اور یعقوب تصور کو میں جانتا ہوں۔ پاکستان کے مشہور پبلشر ارسلان رضا میرے دوست ہیں۔فون پر کبھی کبھی ملاقات ہوجاتی ہے۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہورہی ہے کہ وہ میری کتاب ''اردو ادب میں تانیثیت'' کو اپنے اشاعتی ادارے سے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ بات یادرہے کہ بہت سے نام میری یاداشت میں نہیں رہے ہیں میں یقین سے کہتا ہوں کہ میرا واسطہ اور بھی بہت سے لوگوں کے ساتھ رہا ہے۔

....

میں نے آج تک جن سیمیناروں، کانفرنسوں، ورک شاپس اور مختلف کالجوں میں لیکچر دینے کے علاوہ آن لائن ادبی پروگراموں میں حصہ لیا ہے۔اس حوالے سے بھی میری یادوں کے البم میں کچھ اوراق محفوظ ہیں، چاہتا ہوں اُن کا بھی یہاں ذکر کردوں۔ 20 دسمبر 2002ء میں جب میں گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن جموں میں بی ایڈ کی ٹریننگ کررہا تھا تو میں نے 9 دن کا این ایس ایس کیمپ جوائن کیا تھا۔ 30، اکتوبر 2013ء کو میرے ایک دوست ڈاکٹر رشید خان نے مجھے اور ڈاکٹر طارق تمکین کشتواڑی کو اپنے کالج گورنمنٹ ڈگری کالج بیروہ (کشمیر) میں یک روزہ سیمینار میں مدعو کیا۔ یہ سیمینار قومی کونسل کے مالی اشتراک سے منعقد کیا گیا تھا جس کا موضوع تھا ''اردو افسانے میں قومی یکجہتی اور حبّ الوطنی'' میں نے اس سیمینار میں ''صوبہ جموں کے اردو افسانے میں قومی یکجہتی'' پر اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔ 16 جون 2014ء سے 21 جون 2014ء تک میں نے اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن جموں میں اساتذہ کو اردو تدریس پر لیکچر دیا۔ مارچ 2014ء سے مئی 2014ء تک میں نے جموں کے

ایک پرائیویٹ ادارے میں کمپیوٹر کورس کیا (اُن دنوں میری ڈیوٹی گورنمنٹ ہائی اسکول بجالتہ، زون گاندھی نگر (جموں) میں تھی، میں اسکول سے چھٹی کے بعد دو گھنٹے کچی چھاونی جموں میں کمپیوٹر سیکھنے جاتا تھا)۔ 15، 16 مارچ 2014ء کو میں نے افسانہ کلب ملیر کوٹلہ پنجاب کے زیر اہتمام دوروزہ قومی سیمینار میں شرکت کی جس میں میں نے پنجاب کے ایک گمشدہ افسانہ نگار پر مقالہ پڑھا۔ 11 نومبر 2014ء کو میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج ادھم پور میں ''اردو ادب میں تانیثیت'' پر لیکچر دیا۔ 8 جون 2015ء سے 13 جون 2015ء یعنی پانچ دن تک میں نے اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن جموں میں اردو تدریس پر اساتذہ کو لیکچر دیا۔ 19 دسمبر سے 23 دسمبر 2015ء تک میں نے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT) نئی دہلی میں پانچ دن کی ایک ورک شاپ میں حصہ لیا۔ جموں سے ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی پہنچا۔ اس ورک شاپ میں ہندوستان کی چند ریاستوں کے اساتذہ نے شرکت کی تھی۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر شاہد حسین اور پروفیسر غضنفر علی کے لیکچرز سننے کا موقع ملا تھا۔ 9، 10 مئی 2015ء کو ملیر کوٹلہ پنجاب کے دوروزہ قومی سیمینار میں شرکت کا موقع ملا۔ محمد بشیر ملیر کوٹلوی اور سالک جمیل براڑ نے اس سیمینار کو منعقد کیا تھا۔ اس سیمینار کے ایک سیشن میں میں نے اپنا مقالہ پڑھا تھا اور دوسرے سیشن میں اپنا مختصر افسانہ ''سرگوشی'' پڑھا تھا۔ 23، 24 مارچ 2016ء کو کشمیر یونیورسٹی کے فاصلاتی نظام تعلیم کے زیر اہتمام ''اردو افسانہ: مزاج ومنہاج'' کے موضوع پر دوروزہ قومی سیمینار منعقد کیا گیا تھا، مجھے بھی اس سیمینار میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ میں اور میرے ساتھ پنجاب کے ایک سینئر فکشن نگار محمد بشیر ملیر کوٹلوی ایک ساتھ نجواں جموں سے کشمیر کے لئے روانہ ہوئے تھے بانہال تک میرے ہم زلف عبدالحق تانترے نے میری گاڑی چلائی تھی۔ وہ وہاں سے میری گاڑی چلا کر واپس جموں چلے آیا تھا اور ہم رات کو بانہال ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ دوسرے دن بانہال سے ریل میں سوار

ہوکر کشمیر یونیورسٹی میں پہنچ گئے تھے۔اس سیمینار میں پروفیسر غضنفر علی اور ترنم ریاض بطور خاص مہمان شریک ہوئے تھے۔ میں نے اس سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے دوسرے سیشن میں اپنا تحریر کردہ افسانہ ''ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی'' پڑھ کر سُنایا تھا اور دوسرے دن ڈاکٹر عرفان عالم ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کے لکھے افسانہ ''ستی'' پر ایک تجزیاتی مضمون پڑھا تھا۔اُسی روز میں نے گھر سے یہ مایوس کن خبر سُنی تھی کہ میرے چچا عزیز الدّین وانی دُنیا سے چل بسے! میں اُسی روز ایک ٹیمپو میں سوار ہوکر رات کو چھنی پہنچ گیا تھا۔ 13، نومبر 2016ء کو اپنے ایک دوست کی دعوت پر میں یک روزہ قومی سیمینار میں شرکت کے لئے دہلی چلا گیا تھا جہاں میں نے جموں وکشمیر کا اردو سے رشتہ'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا تھا۔اس سیمینار کا موضوع تھا ''اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کا لسانی اور تہذیبی رشتہ''۔ 14، فروری سے 17 فروری 2017ء تک میں نے جموں ستواری ہائی اسکول میں اردو تدریسی وتحقیقی مرکز سپرون سولن (ہماچل پردیش) کی جانب سے منعقدہ ایک ورک شاپ میں اساتذہ کو تدریس اردو پر لیکچر دیا تھا۔میرے دوست ڈاکٹر یوگ راج اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر نے مجھے اس ورک شاپ میں مدعو کیا تھا۔15 اور 16، مارچ 2017ء کو میں نے گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج راجوری میں دوروزہ قومی کانفرنس میں شرکت کی تھی جس میں، میں نے ''اکیسویں صدی میں اردو تنقید'' پر اپنا مقالہ پڑھا تھا۔اس قومی کانفرنس کا موضوع تھا مخلوط سائنسی اور انسانی علوم۔ 11، اپریل 2017ء کو میں نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے شعبۂ عربی کے یک روزہ سیمینار میں شرکت کی تھی جس کا موضوع تھا'' خطۂ پیر پنچال کی زبانوں پر عربی کے اثرات'' 25، اپریل 2017ء کو میں نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے شعبۂ عربی کے زیر اہتمام منعقدہ یک روزہ ریاستی سیمینار میں شرکت کی اور'' معاصر اردو افسانہ'' کے عنوان سے اپنا تحریر کردہ مقالہ پڑھا تھا۔ 9 مئی 2017ء کو میں نے

پوسٹ گریجویٹ کالج راجوری میں ڈاکٹر صابر مرزا کی حیات وادبی خدمات کے حوالے سے یک روزہ قومی سیمینار میں شرکت کی تھی۔ 11، مئی 2017ء کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے شعبۂ الیکٹریکل انجیئر نگ کے ایک پروگرام میں شرکت کی تھی۔ 24، اکتوبر 2017ء کو میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج مہنڈر (ضلع پونچھ) میں یک روزہ قومی سیمینار میں شرکت کی اور سرسید احمد خان پر مقالہ پڑھا تھا۔ 3، 4 فروری 2018ء کو میں نے ملیر کوٹلہ پنجاب میں دوروزہ قومی سیمینار میں شرکت کی اور ''مشرقی پنجاب میں معاصر اردو افسانہ'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ 3، 4، اکتوبر 2018ء کو جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نے ''جموں وکشمیر کا معاصر اردو ادب'' کے موضوع پر دوروزہ قومی سیمینار منعقد کرایا تھا۔ مجھے بھی اس میں مدعو کیا گیا تھا۔ میں بذریعہ ہوائی جہاز جموں سے سرینگر گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ دوسرے دن میں نے سیمینار میں شرکت کی تھی اور ''جموں وکشمیر میں اردو ناول'' پر مکالمہ کیا تھا۔ ٹیگور ہال میں یہ دوروزہ سیمینار ہوا تھا۔ اس سیمینار میں دو دو مقالہ نگاروں کو ایک ساتھ بٹھایا گیا تھا جن سے شرکاء اُن کے موضوع سے متعلق سوالات پوچھتے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر محی الدّین قادری زور کو بٹھایا گیا تھا۔ ناصر ضمیر نے ہم دونوں کا تعارف پیش کیا تھا۔ تیسرے دن میں واپس ہوائی جہاز میں جموں پہنچ گیا تھا۔ 19، 20 مارچ 2018ء کو میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج تھانہ منڈی کی (ضلع راجوری) یک روزہ قومی سائنس کانفرنس میں شرکت کی۔ 31، اکتوبر 2018ء کو میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج مہنڈر (ضلع پونچھ) میں اپنے گہرے دوست ڈاکٹر لطیف میر کی فرمائش پر یک روزہ قومی سیمینار میں شرکت کی تھی۔ اس سیمینار کا موضوع تھا ''ادب، انسانیت اور سماج'' میں نے اس سیمینار میں ''اردو افسانوں میں جمہوری اقدار'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔ 24 ستمبر تا 28 ستمبر 2018 کو میں نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے میڈیا سینٹر میں ایک ہفتے کا کورس مکمل کیا تھا۔

4 جنوری 2019ء کو میں جموں سے اپنی دو کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں دہلی چلا گیا تھا۔ دہلی سے میں نے اپنے گہرے دوست اور اردو فکشن نگار پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب کو فون پہ کہا کہ میں آپ کے پاس دن کو میرٹھ آنا چاہتا ہوں۔ وہ خوش ہوئے، میں کھڈا کالونی سے ایک آٹو رکشے پہ سوار ہوا اور آنند وہار پہنچ گیا۔ وہاں سے میرٹھ کی بس میں سوار ہوا اور تقریباً دو گھنٹے میں میرٹھ پہنچ گیا۔ اسلم صاحب نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کا ایک طالب علم مجھے لینے کے لئے بس اڈّے تک بھیجا تھا۔ یونیورسٹی پہنچ کر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بڑے پُرتپاک انداز میں مجھ سے گلے ملے۔ میرے عزیز ڈاکٹر ارشاد سیانوی بھی یونیورسٹی میں موجود تھے۔ اُنھوں نے میرے لئے چائے پانی کا انتظام کیا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ایک ادبی نشست رکھی گئی تھی۔ میں نے اس ادبی نشست میں اپنی ایک تحریر کردہ کہانی ''غشی'' پڑھ کر سنائی تھی جسے تمام سامعین نے بہت پسند کیا تھا۔ میرے علاوہ اسلم صاحب نے بھی ایک افسانہ سُنایا تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ میں، اسلم صاحب اور ارشاد سیانوی یونیورسٹی کے قریب ہی ایک مسجد میں جمعہ نماز پڑھنے گئے تھے۔ اُس کے بعد اسلم صاحب نے مجھے اپنے کوارٹر پر لیا تھا جہاں ہم نے میرٹھ کی لذیز بریانی کھائی تھی۔ اُس کے بعد انھوں نے مجھے رخصت کیا تھا۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی کو بس اڈّے تک میرے ساتھ بھیجا تھا۔ میں شام کو دہلی چلا آیا تھا۔ 19، 20 جنوری 2019ء کو میں نے پوسٹ گریجویٹ کالج راجوری میں دوروزہ کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس کا موضوع تھا ''سائنس، سماجی سائنس اور انسانیت میں حالیہ رجحانات''۔ میں نے تحقیق کے طریقۂ کار پر اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔ 29 جنوری 2019ء کو میں نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے آئی سی سی حال میں ایک ورک شاپ میں حصہ لیا تھا۔ 28 جنوری 2019 سے یکم جنوری 2019 تک میں نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے پالیٹکنک کالج میں ایک

ٹرینگ پروگرام میں شرکت کی تھی۔ 23 مارچ 2019ء کو میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج کٹھوعہ میں منعقدہ یک روزہ قومی سیمینار میں شرکت کی تھی۔ یہ سیمینار میرے دوست ڈاکٹر لیش پال شرما نے منعقد کیا تھا۔اس کا موضوع تھا ''عصر حاضر میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری کی اہمیت وافادیت'' میں نے اس سیمینار میں کرشن چندر کے افسانوں کے حوالے سے اپنا مقالہ پڑھا تھا۔ 11، 12 مارچ 2019ء کو میں نے ماتا ویشنو دیوی یونیورسٹی کٹرہ میں منعقدہ دوروزہ قومی کانفرنس میں شرکت کی تھی جس میں، میں نے ''ریٹ لسٹ'' نام کا افسانہ پڑھ کر سنایا تھا۔ جموں وکشمیر کلچرل اکادمی اور ماتا ویشنو دیوی یونیورسٹی کے اشتراک سے یہ دوروزہ قومی کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ میں اور پروفیسر جی ایم ملک صاحب نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کی جانب سے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ 31 مارچ 2019ء کو میں نے عبدالقیوم نائیک کے اسکول سرسید میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی بہروٹ کی یک روزہ کانفرنس میں شرکت کی تھی اور ''خطہ پیر پنچال کے معاصر اردو قلم کار'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا تھا۔ 22-4-2019 سے 6-5-2019 تک میں نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے تحت پندرہ دن کا عربی خوانی کا کورس کیا تھا۔ 26 جولائی 2020ء کو میں نے آسرا الہند ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی، دہلی کے زیر اہتمام یک روزہ آن لائن سیمینار میں شرکت کی اور ''افسانے کی تکنیک'' پر مقالہ پڑھا تھا۔ 29 تا 30، اگست 2020ء کو میں نے شعبۂ اردو للت نارائن متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ بہار کے دوروزہ قومی آن لائن سیمینار میں شرکت کی تھی اور ''لطف الرحمٰن کا دبی سرمایہ'' موضوع پر مقالہ پڑھا تھا۔ 16، اگست 2020 کو میں نے صوفی جمیل اختر لٹریری سوسائٹی کولکتہ (انڈیا) کے زیر اہتمام منعقدہ آن لائن اردو کے کہنہ مشق نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی کو خراج تحسین میں حصہ لیا تھا۔ 26 ستمبر 2020ء کو میں نے سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کے شعبۂ اردو کے یک روزہ آن لائن سیمینار میں شرکت

کی تھی اور اپنا تحریر کردہ مقالہ ''اردو افسانوں میں سماجی قدریں'' پڑھا تھا۔ 30 نومبر 2020ء کو میں نے پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ کے شعبۂ اردو میں یک روزہ آن لائن سیمینار میں شرکت کی تھی اور ساحر لدھیانوی پر اپنا مقالہ پڑھا تھا۔ 5 تا 17 دسمبر 2020ء کو میں نے بمبئی کی ایک ادبی تنظیم'' کاروان اردو'' کے ادبی پروگرام میں شرکت کی تھی۔20 فروری 2021ء کو میں نے شعبۂ اردو للت نارائن متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ بہار کے یک روزہ آن لائن سیمینار میں شرکت کی تھی اور'' جموں کشمیر میں اردو صحافت'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا تھا۔ 13 مارچ 2021ء کو ہمالین مشن آف ایجوکیشن راجوری کے سرپرست اعلیٰ جناب فاروق مضطر صاحب، اُن کے باصلاحیت، خوش اخلاق صاحبزادوں اور ہمالین مشن کے اسٹاف ممبران نے دبستان ہمالہ کے بینر تلے یک روزہ عظیم الشان ادبی وثقافتی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا جس میں انھوں نے 2019ء تا 2021ء کے دوران جموں وکشمیر کے مرحومین نامور ادباو شعرا اور سماجی کارکنان کو خراج عقیدت کے طور پر اُن کے نام پر لواحقین کو ایوارڈ اور توصیفی سند پیش کی تھی۔ میں، جموں سے پروفیسر قدوس جاوید صاحب اور جناب خالد حسین کے ہمراہ راجوری گیا تھا۔ فاروق مضطر صاحب نے ہمیں لینے کے لئے ایک گاڑی بھیجی تھی۔ ہم بارہ مارچ کو راجوری پہنچ گئے تھے۔ رات کو فاروق مضطر صاحب کے کالج ٹھنڈی کسّی کی بلڈنگ میں ٹھہرے تھے۔ دوسرے دن اسی بلڈنگ میں پروگرام ہوا تھا۔ اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں جن مرحومین ادباوشعرا کے نام پہ ایوارڈ اور توصیفی سند دی گئی تھی اُن میں پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر ظہورالدّین، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، جناب عرشؔ صہبائی، جناب ودیا رتن عاصیؔ، جناب ماسٹر عبدالعزیز وانی، جناب شہبازؔ راجوروی، جناب فداؔ راجوروی، جناب عبدالشکور ملک اور جناب فاروق مغل پروازؔ شامل ہیں۔ مرحوم پروفیسر ظہورالدّین صاحب کا ایوارڈ میں نے حاصل کیا تھا۔ میں نے ایوارڈ حاصل کرنے سے پہلے اپنے استاد محترم کے

بارے میں چند کلمات بھی ناظرین وسامعین کی سماعتوں کی نذر کئے تھے۔اس یک روزہ عظیم الشّان ادبی وثقافتی کانفرنس کا دوسرا اجلاس مخلوط حمدیہ ونعتیہ مشاعرے پر مبنی تھا۔اس طرح یہ ادبی تقریب ایک شاندار و یادگار تقریب کے طور پر اختتام پذیر ہوئی تھی۔ میں راجوری سے جموں اپنے گھر میں آکر دوسرے دن ملک مارکیٹ پروفیسر ظہورالدّین مرحوم کے گھر پر گیا تھا وہاں ایوارڈ اُن کے بڑے بیٹے سہیل ظہور کے حوالے کیا تھا۔ 2 مارچ تا29 مارچ 2021ء کو میں نے یو جی سی-ہیومین ریسورس ڈولپمنٹ سینٹر کشمیر یونیورسٹی کے تحت آن لائن فیکلٹی انڈکشن پروگرام کورس مکمل کیا تھا۔ 21، اگست تا4 ستمبر 2021 کو میں نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (ایچ آر ڈی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تحت آن لائن ریفریشر کورس مکمل کیا تھا(ڈاکٹر نسیم گل اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے مجھے یہ آن لائن کورسز کرنے کی تحریک دی تھی، میں ڈاکٹر نسیم گل کا اس سلسلے میں شکر گزار ہوں)۔15 ستمبر 2021ء کو میں نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے پالیٹکنک کالج میں ''انسانی اقدار'' پر آن لائن ایک لیکچر دیا تھا۔ 22 ستمبر 2021ء کو میں نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے اسکول آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی میں طلبہ کو'' عالمگیر انسانی قدریں'' پر لیکچر دیا تھا۔ 9 ستمبر 2021ء کو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے شعبہ حیوانات کے یک روزہ سیمینار میں شرکت کی اور سرٹیفکیٹ حاصل کیا تھا۔ 3دسمبر 2021ء کو میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج نوشہرہ میں ''ادب اور ادیب'' کے موضوع پر لیکچر دیا تھا۔ان تمام سیمیناروں، کانفرنسوں، ورک شاپس اور مختلف کورسز کے علاوہ جب 2020ء میں کورونا وائرس کے باعث ساری دنیا کے لوگ پریشان تھے تو میں نے اللہ کے فضل سے علمی وادبی کاموں کے ذریعے بہت سے اصلاحی افسانے اور مضامین لکھے جن کو لوگوں اور بالخصوص اردو صحافت سے تعلق رکھنے والوں نے بہت پسند کیا۔میری حوصلہ افزائی کے لئے مجھے ''لازوال'' اور ''نیا اتہاس'' جیسے مشہور و معروف روزناموں کے مدیران

نے سرٹیفکیٹ سے نوازا۔ 25 فروری 2022ء کو میرے دوست ڈاکٹر لیش پال شرما نے مجھے گورنمنٹ ڈگری کالج مڑھین (ضلع کٹھوعہ) میں مدعو کیا اور مجھ سے ''خواتین کی خود مختاری اور ادب'' کے موضوع پر لیکچر دلایا۔ اس کالج کی پرنسپل ڈاکٹر رومیلا مالا بھٹ اور اُن کے اسٹاف ممبران نے مجھے بہت عزت دی تھی۔ میں اپنے دوست ڈاکٹر لیش پال شرما کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس میرے دوست نے مجھے اس لائق سمجھا تھا کہ میرا گورنمنٹ ڈگری کالج مڑھین میں لیکچر کروایا۔

....

میرے افسانوں، تحقیقی وتنقیدی مضامین، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالات پڑھنے کے بعد جن اردو کے بلند پایہ ادیبوں نے اپنے اپنے تاثرات اور مضامین مجھے لکھ بھیجے۔ میں اُن کے اسمائے گرامی کے ساتھ یہاں اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود میری ادبی نگارشات کو لفظ لفظ پڑھا۔ 2001ء میں جب میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''ہزاروں غم'' چھپا تو اُس کا دیباچہ جموں وکشمیر اردو فورم کے صدر جناب محمد امین بنجارا نے لکھا۔ اُن کے علاوہ ڈاکٹر پریمی رومانی اور ڈاکٹر چمن لعل بھگت نے الگ سے مضامین لکھے۔ 2002ء میں جب میرا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' شائع ہوا تو اُس پر مرحوم پروفیسر شمیم حنفی اور قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی صاحب نے اپنے اپنے تاثرات لکھے۔ جناب حقانی القاسمی نے الگ سے ایک بھرپور تبصرہ لکھ کے شائع کروایا۔ 2004ء میں میرے تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''آئینہ در آئینہ'' شائع ہوئی جس میں آنجہانی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے تاثرات شامل ہیں۔ 2008ء میں میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''میٹھا زہر'' شائع ہوا۔ اُس میں آنجہانی پروفیسر گوپی چند نارنگ، مرحوم پروفیسر ظہور الدین، مرحوم پروفیسر وہاب اشرفی، مرحوم پروفیسر حامدی کاشمیری، مرحوم پروفیسر قمر رئیس، آنجہانی جوگندر

پال، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر علی احمد فاطمی، جناب انیس امروہوی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، جناب دیپک بدکی، جناب محمد شاہد پٹھان اور پروفیسر محمد ریاض احمد کے تاثرات شامل ہیں۔اُن کے علاوہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر سید اختیار جعفری نے الگ سے ''میٹھا زہر'' پر مضامین لکھے۔2011ء میں میری تحقیقی وتنقیدی مضامین پہ مشتمل کتاب ''اعتبار ومعیار'' شائع ہوئی جس میں مرحوم خلیق انجم اور پروفیسر قدوس جاوید کے تاثرات شامل ہیں ۔2013ء میں میرا ڈی لٹ کا مقالہ ''اردو ادب میں تانیثیت'' کتابی صورت میں شائع ہوا جس پر الگ سے پروفیسر بشیر احمد نحوی، پروفیسر مجید بیدار اور جناب رفیق شاہین نے اپنے تاثرات لکھے۔ 2014ء میں میری تحقیقی وتنقیدی مضامین کی کتاب ''شعورِبصیرت'' شائع ہوئی جس میں مرحوم علی جاوید اور جناب عطا عابدی کے تاثرات شامل ہیں ۔ 2015ء میں میرے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''اندر کی باتیں'' شائع ہوا جس میں آنجہانی کشمیری لال ذاکر، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، پروفیسر مجید بیدار، مرحوم پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر ابوالکلام ، مرحوم پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر شریف احمد قریشی، جناب رفیق شاہین ،ڈاکٹر خالد اشرف، جناب نورالحسنین ، جناب رونق جمال، ڈاکٹر عظیم راہی ، جناب ابوبکر عباد، جناب حقانی القاسمی، ڈاکٹر سید اختیار جعفری، جناب دیپک کنول ، جناب معین الدّین عثمانی، ڈاکٹر پرویز شہریار، ڈاکٹر الطاف انجم، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اور ڈاکٹر رغبت شمیم ملک کے تاثرات درج ہیں ۔ڈاکٹر ریاض توحیدی نے الگ سے ٹائٹل کہانی پر ایک مضمون لکھا۔2019ء میں میری چار کتابیں شائع ہوئیں جن میں دو تحقیقی وتنقیدی مضامین پہ مشتمل کتابیں اور دو افسانوں کے مجموعے۔ تحقیقی وتنقیدی مضامین کی کتاب ''ترسیل وتفہیم'' کا دیباچہ جناب غلام نبی خیال نے لکھا جو انگریزی، اردو اور کشمیری کے ایک قد

آور ادیب ہیں ۔افسانوں کا چوتھا مجموعہ ’’قبر میں زندہ آدمی‘‘ پر جن اہل نقد ونظر نے اپنے اپنے تاثرات لکھے ہیں اُن میں پروفیسر قدوس جاوید، مرحوم پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، مرحوم پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر شریف احمد قریشی، ڈاکٹر حمیداللہ خان، جناب احمد رشید، ڈاکٹر محمد مستمر اور جناب محمد غالب نشتر شامل ہیں ۔افسانوں کا پانچواں مجموعہ ’’کیا حال ہے جاناں!‘‘ پر پروفیسر شریف احمد قریشی نے ایک بصیرت افروز تجزیاتی نوعیت کا مضمون لکھا جو اس مجموعے کے ابتدائی صفحات میں شامل ہے۔2020ء میں میری تحقیقی وتنقیدی کتاب ’’نئی تنقیدی معنویت‘‘ شائع ہوئی ۔اس پر بھی پروفیسر شریف احمد قریشی کا ایک جامع مضمون شامل ہے۔2021ء میں میری تین تحقیقی وتنقیدی کتابیں شائع ہوئیں ۔’’تنقیدی فکر وفن‘‘۔’’زبان وبیان‘‘ اور’’کہکشان خیال‘‘ ڈاکٹر امام اعظم نے ’’تنقیدی فکر وفن‘‘ پر مضمون لکھا جو اس کتاب میں شامل ہے۔’’زبان وبیان‘‘ پر ڈاکٹر حسن رضا نے مضمون لکھا ہے جو مذکورہ کتاب میں شامل ہے۔2021ء ہی میں میرے افسانوں کا چھٹا مجموعہ ’’آج میں کل تُو‘‘ شائع ہوا۔میرے ان افسانوں کو جن اہل نقد ونظر نے موضوع بنا کر اپنے تاثرات اور مضامین لکھے اُن میں جناب شموئل احمد، جناب عبدالصّمد، پروفیسر شریف احمد قریشی، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر شمع افروز زیدی صاحبہ، جناب حلیم صابر، ڈاکٹر حمیداللہ خان، ڈاکٹر افضال عاقل، جناب تنویر اختر رومانی، جناب نثار انجم، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر ابراہیم افسر اور ڈاکٹر ارشاد شفق کے نام شامل ہیں ۔میری ان کتابوں میں شامل اہل علم وفن کے تاثرات ومضامین کے علاوہ جن بزرگ اور نوجوان قلمکاروں نے الگ سے مضامین لکھے اُن میں موقر ومعیاری رسالہ ’’شاعر‘‘ کے مدیر مرحوم افتخار امام صدیقی، ڈاکٹر مجیب شہزر، ڈاکٹر مول راج، ڈاکٹر گلزار احمد وانی، ڈاکٹر محمد اسلم، محمد ارشد کسانہ اور ایس معشوق شامل ہیں ۔میرے عزیز شاگرد ڈاکٹر ظفر اقبال نحوی نے میری جن کتابوں کو مرتّب کیا اُن پر جن

احباب نے اپنے تاثرات قلم بند کیے اُن میں ''مشتاق احمد وانی کی فنکارانہ صلاحیتیں'' پر پروفیسر عبدالحق نے اپنے تاثرات لکھے۔دوسری کتاب ''ہر لفظ سے خوشبو آئے'' پر پروفیسر دبیر احمد اور ڈاکٹر عرفان عالم کے تاثرات شامل ہیں۔تیسری کتاب ''مشتاق احمد وانی کے بہترین افسانے'' پر ڈاکٹر الطاف انجم نے اپنے زرّیں خیالات رقم کئے ہیں۔چوتھی کتاب ''مشتاق احمد وانی کی افسانوی کلیات'' پر پروفیسر دبیر احمد نے اپنے تاثرات لکھے ہیں۔

....

31، مارچ 2022ء کو میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے شعبۂ اردو سے سبکدوش ہوگیا۔یونیورسٹیوں میں کالجوں، اسکولوں یا دیگر محکمہ جات کی طرح ملازمین کی سبکدوشی پر الوداعی پارٹیاں منعقد کروانے کا رواج نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اُس وقت کے وائس چانسلر محترم پروفیسر اکبر مسعود نے مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے ہوئے یہ لازمی سمجھا کہ شعبۂ اردو ہی میں میرے مزاج، تدریسی کردار اور میری علمی وادبی خدمات پر ایک مجلس منعقد کی جائے۔چنانچہ انھوں نے اس کے لئے میرے عزیز دوست ڈاکٹر لیاقت حسین نیّر صدر شعبہء اردو کو فون کیا کہ وہ شعبے میں اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ حاضر رہیں۔دن کے تقریباً چار بجے شعبہء اردو کے ایک کمرے میں محترم پروفیسر اکبر مسعود وائس چانسلر، جناب پروفیسر اقبال پرویز ڈین آف اکیڈمک افیرس، جناب پروفیسر جی ایم ملک ڈین اسکول آف ایجوکیشن، جناب محمد اسحاق رجسٹرار وکنٹرولر، جناب پروفیسر آصف حسین ڈین اسکول آف انجینئرنگ، جناب ڈاکٹر شمس کمال انجم ایسوسی ایٹ ڈین آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ لینگویجز، جناب ڈاکٹر اصغر علی شاہ ایسوسی ایٹ ڈین آف اسٹوڈینٹس ویلفیر، جناب سنیت گپتا، جناب ڈاکٹر ذاکر ملک بھلیسی تشریف فرما ہوئے۔شعبہء اسلامک اسٹڈیز کے اساتذہ میں جناب ڈاکٹر نسیم گل صدرِ شعبہ، جناب ڈاکٹر رفیق انجم کے علاوہ شعبہء اردو کے

اساتذہ میرے ساتھی ڈاکٹر لیاقت حسین نیّرؔ، ڈاکٹر محمد آصف ملک اور ڈاکٹر رضوانہ شمسی کے علاوہ ریسرچ اسکالرس، شعبۂ عربی، اردو اور اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر لیاقت حسین نیّرؔ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جناب پروفیسر جی ایم ملک، ڈاکٹر شمس کمال انجم، ڈاکٹر اصغر علی شاہ، ڈاکٹر محمد آصف ملک، ڈاکٹر رضوانہ شمسی، ڈاکٹر نسیم گل اور ڈاکٹر رفیق انجم نے جب میری خوبیاں بیان کرنا شروع کر دیں تو میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے یہ سوچ کر کہ کیا واقعی میرے اندر یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ آنسوؤں تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اس حال میں محترم پروفیسر اکبر مسعود نے میرے لئے کرسی خالی کروائی مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ بڑی شفقت ومحبت سے میرے ساتھ پیش آئے۔ جناب پروفیسر اقبال پرویز نے بھی مجھے اپنے توصیفی کلمات سے نوازا۔ اُن کے بعد مجھے مائیک پہ بلایا گیا تا کہ میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کروں لیکن مجھ سے پہلے پروفیسر اکبر مسعود صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرنا مناسب سمجھا۔ اُنھوں نے اپنی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے ایک خوشگوار ماحول پیدا کر دیا۔ دراصل اُنھوں نے یہ سب کچھ مجھے ہمت وحوصلہ دینے کے لئے کیا تھا تا کہ میں اپنی باری پر کچھ بول سکوں۔ واقعی اُن کی کوشش کامیاب رہی۔ جب مجھے اپنے احساسات وجذبات کے اظہار کی دعوت دی گئی تو میں اس اثنا میں بہت حد تک پُرسکون ہو گیا تھا۔ میں نے کہا ہم سب وقت کے دریا میں بہہ رہے ہیں۔ آج مجھے یہ سمجھ آ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام (قرآن مجید) میں وقت کی قسم کیوں کھائی ہے۔ یہ وقت ہی ہے جو انسان کو بچپن سے لڑکپن میں، لڑکپن سے جوانی میں، جوانی سے بڑھاپے میں لے آتا ہے اور آخر کار ملک عدم کی طرف روانہ کر دیتا ہے! میں نے اس بات کا بھی اظہار کیا تھا کہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی میں مجھے بہت زیادہ پیار ملا۔ عزت، سکون اور شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ میں نے یہاں کے تمام ملازمین میں نہ کوئی سازش پائی اور نہ ہی حسد، بغض وعناد بلکہ میں نے

یوں محسوس کیا کہ جیسے میں اپنے گھر کے افراد کے ساتھ رہ رہا ہوں لیکن آج میری آنکھیں اس لئے آنسو بہار ہی ہیں کہ میں اس روح پرور ماحول سے آہستہ آہستہ جُدا ہورہا ہوں۔اس لئے کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا۔بات نکلی تو ہراک بات پہ رونا آیا۔ دوسرے دن یکم اپریل 2022ء کو مجھے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کی ٹیچرس ایسوسیشن نے ایک شال اور مومنٹو پیش کیا تھااور اُسی دن میں راجوری سے اپنے گھر جموں چلا آیا تھا۔

....

جیسا کہ پچھلے صفحات پر اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ میں ماسٹر گریڈ کے طور پر اسکول ایجوکیشن محکمے میں ایک مستقل گورنمنٹ ملازم کی حیثیت سے تھرو پراپر چینل ضابطے کے تحت بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں 10، اگست 2014ء کو بذریعہ انٹرویو اسسٹنٹ پروفیسر اردو کی پوسٹ پر سلیکٹ ہوگیا تھالیکن اُس وقت کے وائس چانسلر نے مجھے آرڈر نہیں دیا تھا جس کی وجہ سے مجھے اپنا حق حاصل کرنے کے لئے ہائی کورٹ جانا پڑااور جب فیصلہ میرے حق میں ہواتو تب تک تین سال بیت گئے تھے۔ بہرحال 2 جنوری 2017ء کو میں نے پروفیسر جاوید مسرت صاحب کی وائس چانسلرشپ میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں اسسٹنٹ پروفیسر اردو کی پوسٹ پہ جوائن کیا۔ جوائننگ کے کچھ ہی وقت کے بعد میرے مخلص بڑے بھائی نذیر احمد وانی صاحب نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں اپنی 29 سال 9 ماہ اور 4 دن اسکول ایجوکیشن محکمے میں انجام دی ہوئی سروس کو سروس رول کے مطابق یونیورسٹی میں درج کراؤں۔ بہرحال میں نے فائل تیار کر کے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے رجسٹرار آفس میں پیش کردی۔ اُس وقت جناب پروفیسر اقبال پرویز رجسٹرار تھے۔ اُنھوں نے بڑی محنت، شفقت اور پورے سروس رول کو پڑھنے سمجھنے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد میری 29 سال 9 ماہ اور 4 دن اسکول ایجوکیشن محکمے میں انجام دی

ہوئی سروس کو درج کرایا اور باضابطہ ایک آرڈر جاری کیا۔ اُس آرڈر میں یہ لکھا گیا کہ محکمہ اسکول ایجوکیشن میرا، 29 سال 9 ماہ اور 4 دن کا پورا روپیہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے رجسٹرار اکاونٹ میں بھیج دے۔ میں نے اس آرڈر کے مطابق ایک اور فائل ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن جموں کے نام تیار کر دی۔ اُسے ہاتھوں ہاتھ زونل ایجوکیشن آفیسر ڈنسال، چیف ایجوکیشن آفیسر جموں کے دفتر سے ہوتے ہوئے ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن آفس جموں میں پہنچادیا۔ وہاں میرے دو دوستوں اشوک ٹھکان چیف اکاونٹ آفیسر اور جگل شرما ہیڈ کلرک نے فوری طور پر میری فائل سیکریٹریٹ بھیج دی۔ کل کیا ہوگا؟ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا ہے۔ سیکریٹریٹ میں یہ فائل مختلف ہاتھوں میں گھوم رہی تھی کہ مارچ 2020ء میں کورونا وائرس جیسی عالمی وبا جموں و کشمیر میں بھی آ گئی، جس کی وجہ سے تقریباً دو سال تک میری فائل کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ پھر جب حالات کسی حد تک بہتر ہوئے تو میں نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اپنی فائل کا پتا لگایا تو معلوم یہ ہوا کہ سب متعلقہ آفیسران نے میرے حق میں فائل کو منظوری دے دی ہے۔ میں یہاں جناب افتخار چوہان ڈائریکٹر فائنانس کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جنھوں نے جنوری 2022ء میں ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن جموں کے نام یہ حکم نامہ جاری کیا کہ وہ میرا پیسہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے رجسٹرار اکاونٹ میں بھیج دیں۔ افتخار چوہان صاحب انتہائی خوب صورت اور خوب سیرت انسان ہیں۔ انتہائی نرم طبعیت، خوش اخلاق و خوش مزاج ہیں۔ میں نے اُن میں افسری ٹھاٹ باٹ بالکل نہیں دیکھی۔ افتخار چوہان صاحب کی مثال پھلدار پیڑ کی سی ہے جو ہمیشہ جھکا رہتا ہے۔ میں اس انتہائی مہذب اور خیر خواہ انسان کو تادم آخر نیک دُعاؤں میں یاد رکھوں گا۔ 31 مارچ 2022 کو جب میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری سے سبکدوش ہوا تو اُس کے بعد میں اپنے اس پیسے کو رجسٹرار کے اکاونٹ میں بھجوانے پر کمربستہ ہوا۔ اشوک

تُھکان اور جگل شرما دونوں کی اکاونٹ سیکشن سے تبدیلی ہوئے تقریباً دو سال ہو گئے ہیں۔ان دنوں میرے ایک اور جانے پہچانے دوست بابو رام ہیڈ کلرک کے طور پر کام کر رہے ہیں اور محترمہ مونیکا بھنڈاری چیف اکاونٹ آفیسر ہیں۔ مجھے امید ہے ان دونوں کے ہاتھوں بہت جلد میرا، 29 سال 9 ماہ اور 4 دن کا پورا پیسہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے رجسٹرار اکاونٹ میں پہنچ جائے گا۔ ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن دفتر جموں میں جن دو اشخاص نے میرا جی پی فنڈ کیس تیار کر کے میرے حوالے کیا اُن میں ایک کا نام گنیش شرما اور دوسرے کا نام نریش سنگھ ہے۔لیکن جب میں اپنا جی پی کیس لے کر جی پی فنڈ آفس پہنچا تو شکتی کمار نام کے ایک کلرک نے میری ضلع ادھم پور کی ٹی دیکھنے کے بعد اُس میں یہ غلطی نکالی کہ اس میں ضلع ڈوڈہ کی ٹی کا ذکر نہیں ہے۔ یہ سُن کر مجھے تشویش ہوئی۔ میں دوسرے ہی دن ادھم پور کے جی پی فنڈ آفس میں چلا گیا۔ وہاں بہت دیر تک ایک کلرک کے ساتھ اپنا ریکارڈ ڈھونڈتا رہا۔ مجھے چونکہ وہ سال یاد نہیں رہا تھا کہ جب میری ٹی ضلع ڈوڈہ سے ضلع ادھم پور بھیجی گئی تھی۔بہرحال اس سلسلے میں مجھے چنہنی سے ہوتے ہوئے دوسرے دن ڈوڈہ جانا پڑا۔ وہاں میرے بھانجے برکت اللہ نے میری مدد کی۔ہم جی پی فنڈ آفس میں گئے وہاں ایک خاتون کلرک نے میرا ریکارڈ ڈھونڈ نکالا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میرا ڈوڈہ کا سفر کامیاب رہا۔اس طرح میں نے بڑی مشکلوں کے بعد جموں جی پی فنڈ آفس میں اپنا کیس پہنچایا۔ یہ سب ماہ صیام میں ہوا۔خدا کرے کہ میرا جی پی بہت جلد میرے اپنے اکاونٹ میں چلا جائے۔

....

میں اپنی زندگی کے 62 سال پورے کر چکا ہوں۔اب 63 ویں سال میں داخل ہو چکا ہوں۔ اللہ کے مجھ پر بے شمار احسانات ہیں۔ میں بہ فضل اللہ صحت وتندرستی کے ساتھ جی رہا ہوں۔ جہاں بھی جاتا ہوں اپنا ماحول بنا لیتا ہوں۔میرے

لئے سارے جہاں کے لوگ اپنے خاندان کے لوگ ہیں۔ اپنے آپ کو گنہگارِ سراپا سمجھتا ہوں۔ حسد، بغض، عناد، چاپلوسی، خودغرضی، حرص و ہوس، منافقت اور سازشی دل و دماغ میرے پاس نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو کچھ بخشا ہے اُسے کافی سمجھتا ہوں۔ بس ہر وقت اللہ تعالیٰ سے سب کے لئے ایمان و تندرستی اور نیک ارادوں میں کامیابی کی دُعا کرتا ہوں۔ میری تڑپ اور آرزو یہ ہے کہ میں نیکی کے وہ تمام کام کر جاؤں جن کے کرنے کی تاکید قرآن و حدیث میں آئی ہے۔ میری رگ رگ میں یہ احساس اُتر چکا ہے کہ ایک دن میرا سفرِ آخرت شروع ہو جائے گا۔ قبر کی تاریکی اور تنہائی کا خوف میرے دل و دماغ پہ ہر وقت چھایا رہتا ہے۔ میں خانگی، ازدواجی، خاندانی، تعلیمی و تدریسی اور سماجی ذمہ داریوں کو نبھاتے نبھاتے اب بڑھاپے کی طرف جا چکا ہوں لیکن اس کے باوجود میں اپنے بیٹے رضا الرحمٰن اور بیٹی صبا کریم کی سرکاری ملازمت اور پھر اُن کی شادیوں کی فکر میں ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ ہے کہ جس اللہ نے مجھے زیرو سے سفر شروع کروایا اور لاکھوں میں پہنچایا۔ عزت، شہرت اور امن و سکون بخشا۔ ہنستے ہنستے مجھ سے آگ کے دریا پار کروائے، وہی اللہ میرے بچّوں کو ان شاءاللہ عزت و کامیابی والی زندگی بخشے گا۔ میں بڑے وثوق سے یہ بات کہتا ہوں کہ اگر تمام دُنیا کے لوگ ہر وقت اچھی نیت کے ساتھ ہر اچھا کام کرنے لگ جائیں تو دُنیا میں جتنی بھی بُرائیاں اور ناانصافیاں ہو رہی ہیں، وہ نہیں ہوں گی۔ کیونکہ تمام اچھے اور بُرے اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ اس لئے نیت اچھی تو اعمال اچھے اور نیت بُری تو اعمال بُرے۔

....

دانتوں اور داڑھوں کے درد نے مجھے اٹھارہ برس کی عمر میں ہی پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ شادی تک میری بہت سی داڑھیں نکل چکی تھیں۔ میرے نچلے دانتوں میں سامنے والے ایک لمبے دانت کا مسوڑھ نہ کے برابر تھا۔ ایک دن برش کر رہا تھا کہ

یہ دانت خود بخود اپنی جگہ سے نکل گیا۔ میں کافی مایوس ہوگیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے جموں میں ایک ڈاکٹر سے اُوپر، نیچے چند دانتوں کی پلیٹیں لگوائیں۔ جنہیں میں کھانا کھانے کے بعد نکال کے دھو لیتا تھا۔ لیکن جب وہ پلیٹیں بھی بیکار ہوگئیں تو میرے لئے کھانا کھانا مشکل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحم فرمایا کہ ایک دن جب مجھے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے مولانا آزاد ہوسٹل کے کمرہ نمبر 106 میں داڑھ میں سخت درد ہوا تو میں نے اپنے عزیز دوست ریاض احمد سے اس بات کا ذکر کیا کہ وہ مجھے راجوری کے کسی ماہر ڈاکٹر کے بارے میں بتائیں۔ انھوں نے مجھے ڈاکٹر اسرار کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اُن کے بغیر کسی کے پاس نہ جائیں۔ میں فوراً اپنی گاڑی میں بیٹھا اور نیچے راجوری شہر میں آگیا۔ یہ 8 مارچ 2022ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر اسرار اپنے کلینک میں تھے۔ اُن سے میری دُعا سلام ہوئی۔ اُس کے بعد انھوں نے میرے دانت چیک کیے اور یہ خوشخبری سنائی کہ آپ کے کچھ دانت اور داڑھیں ابھی باقی ہیں اس لئے ان شاءاللہ ہم آپ کو ایسے دانت لگوا سکتے ہیں جو تادم حیات آپ کا ساتھ نبھا سکیں گے۔ آپ ہر چیز بآسانی کھا سکیں گے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے ڈاکٹر اسرار سے پوچھا کہ اوپر، نیچے کل کتنے دانت لگیں گے تو انھوں نے کہا چوبیس دانت لگنے ہیں۔ میں نے جب قیمت پوچھی تو انھوں نے کہا ساٹھ ہزار روپے۔ میں مان گیا۔ انھوں نے کام شروع کیا۔ تقریباً سولہ دن کے اندر انھوں نے مجھے دانت لگادیے۔ یہ وہ دانت ہیں جن کو نکالا نہیں جاسکتا ہے۔ میں نے قسطوں میں ڈاکٹر اسرار صاحب کو پوری رقم دے دی۔ اب میں بہ فضل اللہ ہر سخت چیز بھی بآسانی کھالیتا ہوں۔ دانت لگوانے کے بعد ڈاکٹر اسرا صاحب نے مجھے کہا ''اللہ آپ کے ان دانتوں کو نظر بد سے بچائے۔ بہت خوب صورت لگ رہے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ میں نے ایک اچھے ڈاکٹر سے دانت لگوائے ہیں۔ بزرگوں کی ایک کہاوت ہے کہ دانت گئے تو سواد گیا، آنکھیں گئیں تو جہان گیا۔ اللہ کرے یہ مصنوعی

دانت تادم حیات میرا ساتھ نبھائیں۔

....

2، جنوری 2017ء سے 31 مارچ 2022ء تک یعنی پانچ سال تین ماہ میں نے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں بحیثیتِ اسسٹنٹ پروفیسر اردو کام کیا۔ اس دوران جب میں اپنے گھر سنجواں جموں سے گاڑی چلاتے ہوئے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے احاطے میں پہنچتا تو تقریباً ایک سو ستّر کیلومیٹر سفر طے کر چکا ہوتا۔ میری یادوں کے البم میں جموں سے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری تک وہ تمام مقامات تادم حیات محفوظ رہیں گے جن مقامات سے میں گزرا ہوں۔ میں اپنے گھر سنجواں سے ہوتے ہوئے مُٹھی، دومانہ، اکھنور، آرمی ایریا، ٹانڈا، کپا گلا، چھوہارا موڑ، چوکی چورا، کالی دھار مندر، کالی دھار، گودھر، بھاملا، راج سیوٹ، آرمی ایریا، سُندر بنی، سندر بنی مین چوک، تتا پانی پُل، ٹھنڈا پانی، بل شاما، باکھڑ، سیوٹ موڑ، سیوٹ پل، لمبیڑی، ڈنڈیسر، بگنوٹی، راجل ٹاپ، ہانزن پُل، درشن نگر، نوشہرہ پُل، ناریاں، پاتھی، ببلی، چینگس، چھتریڑی، دلوگڑا، بتھونی، کلر، مرادپور، پنج پیر، سیلانی برج، راجوری، یونیورسٹی موڑ سے اوپر انتہائی خستہ حالت میں راستے کو طے کرتے ہوئے دھنور اور اُس کے بعد بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے احاطے میں داخل ہوتا رہا ہوں۔ نعتیں، کلاسیکل گیت اور غزلیں سُنتے ہوئے میں نے گاڑی چلائی ہے۔ میری اللہ تعالیٰ نے ہر موڑ پر حفاظت فرمائی ہے۔ تقریباً ساڑھے تین سال سے زیادہ زمانے تک میں اپنے گھر سنجواں (جموں) سے مُٹھی، دومانہ کے راستے سے راجوری جاتا رہا لیکن پھر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ جانی پور کے راستے سے بھی راجوری پہنچا جا سکتا ہے تو میں نے اُسی راستے کو اختیار کیا واقعی یہ راستہ بہت آسان اور نزدیک ہے۔ سفر کے دوران بار بار یہ احساس میرے ذہن و دل پہ چھا جاتا کہ زندگی اک سفر

ہے سہانا، یہاں کل کیا ہو کس نے جانا۔ جیسا کہ میں نے اس بات کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ کے مجھ پر بے شمار احسانات ہیں۔ 2015ء اور 2017ء میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر خصوصی طور پر دو احسانات یہ کیے کہ میں نے 2015ء میں اپنے لئے آلٹو گاڑی خریدی اور اُسے چلانا سیکھا۔ 2017ء میں، میں نے کمپیوٹر کی دُنیا میں قدم رکھا، اپنا لیپ ٹاپ خریدا اور اُس پر اپنے مضامین اور کتابیں کمپوز کرنے لگا۔ بہ فضل اللہ ابھی تک میں اس لیپ ٹاپ پہ اپنی 13 کتابیں کمپوز کر چکا ہوں۔ میں اپنی گاڑی خود چلا کے پونچھ لے گیا ہوں۔ دسمبر 2019ء میں جب میرے خوب صورت اور خوب سیرت گہرے دوست ڈاکٹر طارق تمکین کشتواڑی نے مجھے ڈگری کالج کشتواڑ میں دوروزہ اردو کانفرنس میں مدعو کیا تھا تو میں خود جموں سے کشتواڑ تک گاڑی چلاتے ہوئے اُس کانفرنس میں شریک ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ دوسرے دن مہمان خصوصی کے طور پر اپنے خیالات پیش کئے تھے اور اپنی ایک تحریر کردہ کہانی پڑھ کر سنائی تھی۔

....

29، اپریل 2021ء کو جب میری چھوٹی ماں ہاجرہ بیگم میرے بڑے بھائی شوکت علی وانی کے گھر سدھ مہادیو میں اللہ کو پیاری ہوگئی تو میں راجوری میں تھا۔ میری اہلیہ نے مجھے صبح تقریباً ساڑھے آٹھ بجے جب یہ مایوس کن خبر سنائی تو میں راجوری سے اپنی گاڑی چلاتے ہوئے بھالملا سے ہوتے ہوئے یونی پارک، ریاسی، کٹرہ، ادھم پور، چھننی اور پھر وہاں سے سدھ مہادیو پہنچ گیا تھا لیکن میں اپنی چھوٹی ماں کے جنازے پہ نہیں پہنچ پایا تھا میری جانب سے اُنھیں مٹی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ میری چھوٹی ماں کے انتقال پر میرے شعبۂ اردو کے ساتھیوں نے ایک آن لائن تعزیتی نشست کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں ڈاکٹر محمد آصف ملک، ڈاکٹر لیاقت حسین نیر،

ڈاکٹر رضوانہ شمسی اور ڈاکٹر شمس کمال انجم کے علاوہ ریسرچ اسکالرس اور طلبہ وطالبات نے شرکت کی تھی۔ اس نشست کے دوران مجھے اپنی چھوٹی ماں کے ساتھ گزارے لمحات بہت زیادہ یاد آئے تھے۔ میری آنکھوں نے دیر تک آنسو بہائے تھے۔ یادیں اور باتیں آدمی کو زندگی میں بہت رُلاتی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں آج تک لوگ گاڑیوں کے حادثوں میں اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ جب جب میں نے گاڑی چلائی ہے اور جہاں کہیں بھی چلائی ہے، اللہ نے میری حفاظت فرمائی ہے۔ 29 دسمبر 2020ء کو چھنی کے ماسٹر محمد رفیق، سمرولی کے نزدیک قومی شاہراہ پہ گاڑی چلاتے ہوئے جاں بحق ہوئے۔ وہ گاڑی پہ کنٹرول نہ رہنے کی وجہ سے اپنی جان گنوا بیٹھے تھے۔ ماسٹر رفیق کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ اُس شخص کی صورت بار بار میری آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔ ابھی اُن پہ زندگی کی کئی ذمہ داریاں اور ارمان باقی تھے جنہیں وہ پورا کرنا چاہتے تھے لیکن یہ کسے پتا کہ کس کی زندگی کی شام کہاں ہو جائے!

....

2 جون 2022ء کو میری سگی چاچی حلیمہ اس جہان فانی سے رخصت ہوگئی۔ یہ میری وہ ہمدرد، سیدھی سادی، جفاکش اور نیک چاچی تھی جو مجھے اور میرے چھوٹے بھائی اشفاق احمد وانی کو بچپن میں بہت پیار کرتی تھی۔ جب ہم دونوں کو کسی شرارت پر امّاں پیٹنے لگتی تھی تو چاچی حلیمہ ہمیں فوراً اپنی پناہ میں لے لیتی۔ وہ تقریباً 92 سال اس دُنیا میں رہی۔ میں نے چاچی حلیمہ کی موت کی خبر اپنے بڑے بھائی شوکت علی وانی کی زبانی 3 جون 2022ء کو سُنی تو بہت مایوس ہوا۔ میں اُس دن راجوری شاہدرہ شریف میں تھا۔ اُسی دن میں شام کو جموں اپنے گھر پہنچا۔ دوسرے دن گھر پر ہی رہا۔ 5 جون 2022ء کو میں اپنی گاڑی میں تعزیت کے لئے اپنے آبائی وطن علاقہ مرمت (ضلع

ڈوڈہ) چلا گیا۔ میں صبح پانچ بج کر پندرہ منٹ پر اپنی گاڑی میں سوار ہوا اور تقریباً 9 بجے کھلینی اپنے چچا جناب غلام رسول کے گھر پہنچا۔ چچا گھر پر نہیں تھے۔ البتہ چاچی اور میرا چچیرا بھائی حفیظ اللہ وانی گھر پر ہی تھے۔ انھوں نے مجھے نمکین چائے پلائی۔ مجھے میری اہلیہ اور بیٹی نے مرمت گاڑی لینے سے منع کیا تھا۔ لیکن جب معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ مرمت کی سڑک بہتر ہے اور میری جائے پیدائش بہوتہ (سروال) تک گاڑی جاسکتی ہے تو میں نے اپنے چچازاد بھائی حفیظ اللہ وانی سے مشورہ کیا، اُس نے میرا حوصلہ بڑھایا لیکن میں نے چاچی سے اجازت لینا ضروری سمجھا۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ میں نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور مرمت کی طرف چل پڑا۔ کاہوتہ، حمبل، سلہوتہ، بھرگراں، موٹھی، پربل، لیڑ، بٹنگل، منگوتہ، اکندر، گدھوری سے ہوتے ہوئے میں بہ فضل اللہ کچی سڑک سے گزرتے ہوئے آخر کار سروال جا پہنچا۔ ایک طرف مجھے یہ خوشی ہو رہی تھی کہ میں اپنی جنم بھومی پہ آ گیا ہوں لیکن دوسری طرف میری آنکھوں میں یاد ماضی کے سائے گھوم رہے تھے۔ میں اپنے خاندان کے تمام بھائیوں، بہنوں اور خالاؤں سے گلے ملا۔ اپنے خالو محمد رمضان کو دیکھ کر خوش ہوا جن کے ساتھ میرا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا کچھ زمانہ گزرا ہے۔ اپنی سب سے چھوٹی خالہ فاطمہ اور اُن سے بڑی خالہ سکینہ سے ملا تو اپنی امّاں بہت یاد آئی۔ دل میں غم کی اک ہوک سی اُٹھی۔ میرے خالوزاد بھائی غلام حسن، جماعت علی، محمد سعید، شبیر احمد، عطااللہ، محمد حسین کے علاوہ باقی تمام چچازاد بھائیوں اور اُن کے بیٹوں اور بیٹیوں سے ملاقات ہوئی۔ چاچی حلیمہ کے بیٹے اظہار احمد وانی اور اُس کے اہل خانہ سے ملاقات ہوئی۔ میرا دل یہ سوچ کے تڑپ کر رہ گیا کہ کاش! میں چاچی حلیمہ کے جیتے جی اُن سے ملاقات کے لیے آیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ میرے گوناگوں مسائل حیات اور میری مجبوریاں مجھے خونی رشتوں کو نبھانے نہیں دیتی ہیں۔ چاچی حلیمہ کے ساتھ گزارے

دنوں کا ذکر ہوتا رہا۔ دوسرے دن صبح سویرے فجر نماز پڑھنے کے بعد میں اپنے خاندان کے بھائیوں کے ہمراہ قبرستان میں گیا، وہاں فاتحہ خوانی کی۔ میری نظریں دیر تک اپنے خاندان کے مرحومین کی قبروں پر گھومتی رہیں! موت کتنی بڑی صداقت ہے جسے ہم زندہ لوگ وقتی طور پر یاد رکھتے ہیں! میں دیر تک یہی سوچتا رہا۔ 6 جون 2022ء کو میں اپنی گاڑی میں اپنے خالو محمد رمضان کے ساتھ چاہوت چلا گیا۔ وہاں کا نقشہ بالکل بدلا ہوا دیکھا۔ چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں نظر آئیں۔ جامع مسجد کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ بہت خوب صورت بلکہ مثالی مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ اُس کے بعد میں بہوتہ کے گورنمنٹ ہائر اسکینڈری اسکول میں گیا، وہاں پرنسپل صاحب نے مجھ سے بچّوں کو لیکچر دلایا۔ تقریباً پانچ سو بچّے اس اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔ لیکچر دینے کے بعد میں شبیر احمد وانی کی گاڑی میں اپر بہوتہ چلا گیا۔ میرے ہمراہ خالو محمد رمضان، شبیر احمد وانی اور اُس کا بیٹا تھا۔ اپر بہوتہ پہنچ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سب کچھ بدلا بدلا سا نظر آیا۔ میں چالیس سال پیچھے سوچ کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا کہ جب یہاں دُور دُور لوگوں کے چند کچے مکان ہوا کرتے تھے۔ ایک غیر ہموار میدان ہوتا تھا۔ ایک تالاب تھا اُس تالاب کے ساتھ ایک سنہرا درخت جسے ہم اپنی زبان میں سُنگل کہا کرتے تھے۔ آج بھی موجود ہے لیکن اب کسی حد تک اُس کی شاخیں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔ اپر بہوتہ کا مڈل اسکول دیکھا، دیر تک میری نظریں چاروں طرف کے فلک بوس پہاڑوں پر گھومتی رہیں۔ اپنے موبائل فون سے فوٹو کھینچے۔ وہاں کی جامع مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی۔ میرے زمانۂ طالب علمی کے ایک دوست بشن داس سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے مجھے اپنے گھر پر چائے پلائی۔ اُس سے مل کے کچھ یادیں تازہ ہوگئیں۔ شام کو میں واپس سروال آ گیا۔ دوسرے دن میں تقریباً آٹھ بجے صبح اپنے خاندان کے بزرگوں، بھائیوں اور اپنی خالاؤں سے رخصت لے کر اپنی گاڑی میں

بیٹھا۔ آہستہ آہستہ سروال سے گدھوری تک کچی سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے منگوتہ، بٹنگل، لبڑ، پربل، موٹھی، بھرگراں سے ہوتے ہوئے تقریباً ایک بجے باڑی پہنچا۔ گاڑی سڑک کے کنارے ایک طرف لگا دی۔ دل نے چاہا کہ باڑی کا گورنمنٹ ہائی اسکول دیکھ آؤں۔ میں اسکول میں چلا گیا۔ وہاں مجھے اپنا ہم جماعت سعد اللہ ہیڈ ماسٹر کی کرسی پہ نظر آیا۔ اُسے دیکھا تو ایک زمانہ یاد آیا۔ کوئی آدھا گھنٹہ اسکول میں رہا۔ زیر تعلیم طلبہ و طالبات کو تعلیم کی اہمیت وافادیت کے بارے میں بتایا۔ اُس کے بعد اپنی بہنوں کے گھر گڑہنگل چلا آیا۔ دوسرے دن میں واپس جموں آ گیا۔ میرے ساتھ میرا بھانجھا آزاد اور اُس کی اہلیہ تھی۔

....

15 جون 2022ء کو میں اور میری اہلیہ کمرے میں بیٹھے تھے کہ اچانک اہلیہ نے کہا آپ دعوت حق کی محنت کے لئے تین دن لگا سکتے تھے۔ اللہ کی راہ میں رونے گڑگڑانے کا موقع ملے گا۔ مجھے اہلیہ کی بات بہت اچھی لگی۔ میں تین دن کے لئے دعوت حق کی جماعت میں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اپنے دوست جناب ماسٹر فرمان سے اس نیک ارادے کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا کہ میراں صاحب (جموں) کے علاقے میں جماعت کام کر رہی ہے۔ میں نے بیگ میں ضرورت کی چیزیں ڈال دیں اور تین دن کے لئے اللہ کے راستے میں جانے کے لئے گھر سے نکل گیا۔ باہر سڑک پر مجھے ایک آلٹو گاڑی والے نے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔ میں اُس میں بیٹھ گیا۔ ابھی میں نروال منڈی سے گزر رہا تھا کہ میری اہلیہ کا فون آیا، وہ کہنے لگی

"میری گورنمنٹ ہائر اسکنڈری اسکول رایا (ضلع سانبہ) سے ٹرانسفر ہوگئی ہے اور ہائر اسکنڈری اسکول ستواری (جموں) میں مجھے کل جوائن کرنا ہے۔ آپ کل گھر آ کر مجھے جوائن کروانے کے بعد واپس چلے جائیے"

میں نے حامی بھر لی۔ بکرم چوک پہنچ کر میں آر ایس پورہ کی بس میں سوار ہوا اور رات کو میراں صاحب کی ایک مسجد میں جماعت کے ساتھ جڑ گیا۔ اُس رات کو میں نے فیس بُک پہ یہ مایوس کر دینے والی خبر پڑھی کہ میرے انتہائی شفیق، ہمدرد، میرے معنوی استاد اور علم و ادب کے بحر بیکراں پروفیسر گوپی چند نارنگ امریکہ کے صوبے شمالی کیلیفورنیا میں اس جہان فانی سے چل بسے! میں انتہائی مایوس ہوا۔ دُکھ کی اک گھٹا میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔ اُن کے ساتھ جُڑی یادیں، اُن کی باتیں اور کتابیں یکے بعد دیگرے یاد آنے لگیں۔ آنجہانی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ساتھ میرے علمی و ادبی مراسم تقریباً تیس برس تک رہے ہیں۔ گوپی چند نارنگ 11 فروری 1931ء کو ضلع دُکی (پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ 1947ء میں ہندوستان آئے اور یہاں پر مختلف جامعات میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اُن کی مادری زبان سرائیکی تھی لیکن ساری زندگی اردو کے ساتھ گزاری۔ وہ اردو، ہندی، انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت بہتر طور پر جانتے تھے۔ اردو ادب میں اُن کی حیثیت ایک ممتاز ماہر لسانیات، نقاد، محقق، دانشور، مترجم، منتظم اور ایک قابل ترین استاد کی رہی ہے۔ انھوں نے ادب کی تمام اصناف پر بھرپور لکھا ہے اور بہت معیاری لکھا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کو خالق کائنات نے کتنا بڑا ذہن و دل دیا تھا کہ جنھوں نے ادبیات عالم کے تناظر میں اردو والوں کو مغربی تنقید، تحقیق، فکر و فلسفہ اور لسانیات سے واقف کرایا۔ انھوں نے اپنی سرپرستی میں کلاسیکی، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی تحریکوں اور رجحانات پر عالمی سطح کے سیمینار، ورک شاپس اور کانفرنسیں منعقد کروائیں کہ جو تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ ادب کے نئے نئے موضوعات پر سیمینار کرانا اُن کی ترجیحات میں شامل تھا۔ وہ سراپا اردو تہذیب تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں لفظ و معنی کی حرمت کا خیال رکھا

ہے۔ اردو، ہندی اور انگریزی کے قابل، ذہین اور عمدہ اخلاق و کردار کے حامل اسکالروں کی مدد کرنا، اُن کو مناسب مقام دلانا اُن کے اخلاقی مشن میں شامل تھا۔ وہ دُنیا کے جس بھی ملک میں گئے، اردو کی خوشبو اور مٹھاس لے کر گئے۔ گوپی چند نارنگ ہزار رنگ شخصیت کے مالک تھے لیکن وہ اپنے نام کے ساتھ آخر وقت تک نارنگ لکھتے رہے۔ میری آج ادبی دنیا میں جو معمولی سی شناخت بنی ہے یہ اُن کے مفید مشوروں پر عمل کا نتیجہ ہے۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ میں وثوق سے یہ بات کہتا ہوں کہ جب تک اردو ادب زندہ ہے تب تک آنجہانی پروفیسر گوپی چند نارنگ زندہ رہیں گے۔ میں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تعزیتی نشستوں میں آن لائن شرکت کی۔ میں نے 21 جون 2022ء کو ''کاروان اردو ممبئی'' کے صدر میرے دوست جناب فرید خان کے کہنے پر نارنگ صاحب سے متعلق تعزیتی نشست میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ 22 جون 2022ء کو شعبۂ اردو (سینٹر یونیورسٹی آف حیدرآباد) کے صدر میرے دوست پروفیسر سید فضل اللہ کی منعقدہ تعزیتی نشست بنام گوپی چند نارنگ میں بھی آن لائن شرکت کی۔

....

دوسرے دن یعنی 16 جون 2022ء کو مجھے صبح فجر نماز کے بعد جماعت کے ایک ساتھی نے موٹر سائیکل پر باہر جموں جانے والی سڑک پر چھوڑا۔ کوئی بیس منٹ تک میں جموں جانے والی بس یا منی بس کا انتظار کرتا رہا لیکن کوئی بھی گاڑی نہیں آئی البتہ مجھے دُور سے ایک موٹر سائیکل اپنی جانب آتا نظر آیا۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔ وہ فوراً رُک گیا۔ میں اُس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ کوئی ایک کیلومیٹر کے فاصلے پر وہ رُکنے لگا کیوں کہ اُس نے وہاں سے کسی دوسری طرف جانا تھا کہ اسی دوران میرے پیچھے موٹر سائیکل کے بالکل قریب ایک کُتا کھانے کو آیا۔ میں اُس سے ڈر گیا۔

میں نے اپنا بایاں پیر موٹر سائیکل اسٹینڈ سے اٹھا کر زمین پر رکھنے ہی والا تھا کہ تب تک اسٹینڈ سے مجھے ٹخنے کے ساتھ ہی اوپر ٹانگ پر ایک گہرا کٹ لگا، مجھے انتہائی تکلیف ہوئی۔ میں نے فوراً کٹ کی جگہ پہ اپنا دایاں ہاتھ زور سے دبا کر رکھا لیکن اس کے باوجود خون باہر نکل آیا۔ وہاں ایک دو آدمی کھڑے تھے۔ اُن کا مکان بھی سڑک کے بالکل کنارے پر تھا۔ موٹر سائیکل والے نے کہا ''اسی لئے میں کسی کو لفٹ نہیں دیتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے اُس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کیا اور چلا گیا۔ میرے سامنے کھڑے دو آدمیوں نے فوراً استعمال شدہ کپڑے سے میرے زخم کو باندھ دیا۔ کچھ ہی وقت کے بعد میرے سامنے ایک آٹو والا آ کے رُک گیا۔ میں اُس پر سوار ہوا۔ ڈھائی سو روپے میں اُس نے مجھے گاندھی نگر اسپتال پہنچایا۔ وہاں پہنچ کر ڈاکٹر اور دوسرے درجہ چہارم کے ملازمین نے میرے زخم کو دھویا۔ انجکشن لگایا۔ اُس کے بعد زخم پر پانچ ٹانکے لگائے۔ پٹی کی اور ڈاکٹر نے نسخہ لکھا۔ میں نے چھ سو روپے کی دوائی خریدی اور وہاں سے ایک اور آٹو والے کو تین سو روپے دے کر اپنے گھر فردوس آباد سنجواں (جموں) پہنچا۔ اہلیہ اور بچوں نے جب مجھے اس حال میں دیکھا تو پریشان ہوئے۔ زخم تازہ تھا اس لئے مجھے درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اُسی دن میرے بیٹے نے گاڑی چلائی۔ میں اہلیہ کے ساتھ اُس کے اسکول گیا۔ وہاں سے ستواری ہائر اسکنڈری اسکول جا کے اُسے جوائن کرایا۔ اُس کے بعد ہم گھر میں آئے۔ دوسرے دن میں پھر اپنی گاڑی چلاتے ہوئے اہلیہ کے ٹرانسفر آرڈر کی ایک اور کاپی لے کر ستواری ہائر اسکنڈری اسکول چلا گیا۔ تیسرے دن میں نے بھٹنڈی موڑ کے ساتھ نیچے مٹو میڈیکل شاپ پر جا کر پٹی کروائی لیکن دوسرے ہی دن مجھے اپنے پاؤں میں سوزش نظر آنے لگی۔ میں پریشان ہوا۔ میں نے چھنی جموں دربار کے ساتھ ہی پلس اسپتال میں جا کر ایک ڈاکٹر کو اپنا زخم دکھایا۔ اُس نے بھی پٹی کی، دوائی لکھی۔ میں نے گھر آ کر دوائی کھائی اور ہر تیسرے دن پٹی کروانے پلس اسپتال جاتا

رہا۔ دھیرے دھیرے میرے زخم میں انفیکشن ہونے لگی اور ڈاکٹر اوپر سے پٹیاں کرواتا رہا۔ بہر حال تقریباً ایک مہینہ یونہی بیت گیا۔ آخر کار جب میں نے یہ محسوس کیا کہ پلس اسپتال جانے سے میرا زخم ٹھیک ہونے کے بجائے خراب ہو رہا ہے تو میں سخت تشویش میں پڑ گیا۔ میں نے ایک دن جب اپنے گھر کے قریب سڑک کے کنارے مختیار دوائی فروش سے اس سلسلے میں بات کی تو اُس نے مجھے ڈاکٹر ظہور حسین سرجن کے پاس جانے کو کہا۔ میں نے اپنی بہن شمیم اختر اور بہنوئی جناب پروفیسر محمد اسداللہ وانی سے ڈاکٹر ظہور حسین کے بارے میں بتایا تو انھوں نے مجھے بھٹنڈی میں ڈاکٹر ظہور کے کلینک کے بارے میں بتایا کہ وہ فلاں جگہ پر بیٹھتا ہے۔ میں اور میری اہلیہ شام کو ڈاکٹر ظہور حسین کے کلینک میں چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا زخم دیکھا تو کہا ''میں آپ کو ایک ایسے شخص کے پاس بھیجتا ہوں جو بہ فضل اللہ اس طرح کے کئی زخم آج تک ٹھیک کر چکا ہے'' ڈاکٹر ظہور حسین صاحب نے فوری طور پر بھٹنڈی موڑ کے ساتھ پیچھے ایک پرائیوٹ اسپتال میں پٹی (Dressing) کرنے والے ایک شخص سے موبائل فون پہ بات کی میرے بارے میں بتایا، ساتھ میں میرے لئے دوائی بھی لکھی۔ ہم دونوں میاں بیوی رات کے تقریباً 9 بجے اُس پرائیوٹ اسپتال میں آئے۔ وہ پٹی کرنے والا کسی مریض کے زخم کو پٹی کر رہا تھا۔ ہم کوئی آدھا گھنٹہ اُس کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ باہر آیا تو میں نے اُسے اپنا زخم دکھایا۔ اُس نے مجھے اندر تھیٹر میں لیا۔ مجھے ایک بیڈ پہ لٹایا۔ میرے زخم پہ چیر لگایا۔ اُس سے گندہ مواد باہر نکالا۔ پھر دوائی ڈال کر اندر سے بالکل صاف کیا۔ اُس کے بعد پٹی کی۔ یہ سب کچھ کرتے تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ہم گھر چلے آئے۔ اُس پٹی کرنے والے نے مجھے میری مجبوری کا فائدہ اُٹھانے کے لئے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ میرے گھر میں آ کر میرے زخم کو دوائی لگا کر پٹی کرتا رہے گا۔ وہ تقریباً دس دن تک مسلسل میرے گھر پر آتا رہا۔ میں اُسے ہر روز پانچ سو روپے کا نوٹ

دیتا رہا۔ اُس کے بعد وہ تیسرے دن آنے لگا۔ وہ موٹر سائکل پر آتا میرے گھر تک آنے میں اُسے صرف دس منٹ لگتے۔ آدھے گھنٹے میں وہ میرے زخم کو پٹی کر کے فارغ ہو جاتا۔ اُس نے میری شرافت اور سادگی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ تقریباً اٹھارہ دن میں اُس نے ساڑھے سات ہزار روپے لیے۔ زخم میں پوری طرح گھاؤ پھر بھی نہیں آیا۔ اُس نے مجھے چلنے پھرنے اور گاڑی چلانے کی تاکید نہیں کی کیونکہ میں اُس کی آمدنی کا ذریعہ بن چکا تھا۔ جب میرے زخم میں مکئی کے دانے کے برابر سوراخ نہیں بھرا گیا تو اُس پٹی کرنے والے نے مجھے ایک دن بغیر بے ہوشی کا انجکشن لگائے ایک نوکدار گول سُوئی سے زخم پہ ٹانکا لگایا۔ اُس وقت میں نے یوں محسوس کیا کہ جیسے میری آدھی جان میرے جسم سے نکل چکی ہو۔ تقریباً دس دن کے بعد جب اُس نے وہ ٹانکا کھولا تو وہ ٹانکا صحیح طور پر لگا ہی نہیں تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ توفیق دی کہ میں اُس لُٹیرے کے چنگل سے نجات پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دُنیا میں ابھی کچھ سچّے، اچھے لوگ موجود ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ یہ کائنات چلا رہا ہے۔ مجھے اس زخم نے اتنا مایوس کر دیا تھا کہ میری بھوک پیاس بہت حد تک ختم ہو گئی تھی۔ اپنے خون کی جانچ کروانے کے بعد جب میری رپورٹ سے اس بات کا انکشاف ہوا کہ میرے جسم میں ذیابیطس کا دخول ابتدائی درجے میں ہے تو مجھے ڈاکٹر وپن گپتا نے دوائی تجویز کی۔ اُس کی دوائی سے مجھے بہت زیادہ خارش اور جلن شروع ہو گئی، خاص کر رات کو میں بالکل نہیں سو پاتا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد وپن گپتا نے مجھ سے وہ دوائی بند کرادی۔ اسی دوران میرے گہرے دوست اور داعیٔ اسلام جناب عبدالحمید بٹ المعروف مصروف گلاب گڑھی نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں بھٹنڈی کی موڑ (جموں) کے ساتھ نیچے مٹو میڈیکل شاپ پر جا کر جناب ڈاکٹر تسلیم عارف (ایم بی بی ایس۔ ایم ڈی) کو اپنی خارش اور جلن کے بارے میں بتاؤں، میں اُن کے پاس چلا گیا۔ اُنھوں نے میرے تمام استعمال شُدہ نسخے دیکھے اور زور سے ایک طرف رکھ دیے۔ مجھے

اُنھوں نے ایک ٹکیا صبح وشام اور ایک دوپہر کو کھانے کو دی۔ ساتھ میں خون کا ایک ٹیسٹ کروانے کو کہا۔ میں نے جونہی وہ دوائی استعمال کی تو اُسی رات مجھے آرام کی نیند آئی۔ خارش اور جلن میں کمی محسوس ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر تسلیم عارف کو فون کیا اور یہ خوش خبری سُنائی کہ مجھے بہ فضل اللہ آپ کی دوائی سے راحت ملی ہے۔ چند نوں کے بعد میری خارش اور جلن ختم ہوگئی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اُس کے بعد جب میں نے جناب ڈاکٹر تسلیم عارف ہی کو اپنا زخم دکھایا تو دیکھنے کے بعد اُنھوں نے مایوسی کا اظہار کیا یہ دیکھ کے کہ زخم ابھی زخم ہے۔ ساتھ ہی اُنھوں نے مجھے اس بات کی تسلّی بھی دی کہ ان شا اللہ میرا یہ زخم کچھ ہی دن کے بعد ٹھیک ہوجائے گا۔ اُنھوں نے کل چار بار پانچ پانچ دن کے بعد میرے زخم پر پٹی کی، جس دن اُنھوں نے پہلی پٹی کی تو دوائی میں بھگو کر چھوٹی سی ٹاکی زخم کے اندر ہی رکھ دی۔ میرے لئے اس بات کو ضروری قرار دیا کہ میں ہر روز تقریباً چھ کیلو میٹر پیدل چلوں اور گاڑی بھی چلاؤں۔ میرا زخم چونکہ بیٹھے بیٹھے اور اے سی کی ہوا کھا کھا کے پتھر کی سی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس لئے گھاؤ نہیں آرہا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق جب میں نے چلنا اور گاڑی چلانا شروع کی تو میرے زخم میں خارش اور جلن شروع ہوگئی۔ میں نے جناب ڈاکٹر تسلیم عارف کو اپنے زخم کی کیفیت بتائی تو وہ خوش ہوئے۔ اُنھوں نے مجھے مبارک باد دی کہ زخم ٹھیک ہو رہا ہے۔ دوسری پٹی کرنے کے بعد میں ڈاکٹر کی اجازت سے اپنی گاڑی چلاتے ہوئے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری چلا گیا۔ کم وبیش تین مہینے کے بعد جب میں نے اچانک تقریباً 170 کیلو میٹر گاڑی چلائی تو اُس دن میرے ٹخنوں کے آس پاس بہت زیادہ سوزش ہوگئی۔ تیسرے دن جب میں راجوری سے واپس جموں آیا تو سوزش میں کمی آچکی تھی۔ بہر حال اب اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم سے میرا زخم، زخم نہیں رہا ہے بلکہ ایک تلخ یاد کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ تندرستی کتنی بڑی نعمت ہے، اس کا احساس میری رگ رگ میں اُتر چکا ہے۔

اس پریشانی کے دوران میری اہلیہ کی سب سے بڑی بہن شبنم اختر اور اُس کے اہل وعیال کو اللہ تعالیٰ قدم قدم پر خوشیاں نصیب فرمائے۔ اُس نے اپنے بڑے بیٹے رضوان طارق کو لاٹی دھونہ (ضلع ادھم پور) سے جموں میرے لئے محض اس لئے بھیجا کہ میری گاڑی چلائے اور ہماری اس مشکل گھڑی میں ہمارے کام آئے۔ اُس بچّے کو اللہ تندرستی اور کامیابیوں سے نوازے آمین! علاوہ ازیں میرے پیارے بھانجے ڈاکٹر ناصر نے بھی میری صحتیابی کی فکر میں مجھے اچھے مشورے دیے۔ میری اہلیہ راشدہ اختر، میرا بیٹا رضاالرحمٰن اور بیٹی صبا بھی میری خدمت کرتے رہے۔ ہمارے گھر میں رہ رہی بیٹی شازیہ نے بھی میری خدمت کی۔ اس زخم کے دوران میں اللہ کے آگے روتا، اپنے گناہوں کی معافی چاہتا۔ شاید اللہ کو مجھ پہ رحم آ گیا کہ مجھے تندرستی جیسی عظیم نعمت ایک بار پھر نصیب ہوئی۔ یہ احساس میرے دل ودماغ میں رچ بس چکا ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ بہت زیادہ قیمتی ہے۔ اس لئے اسے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور محمدؐ کے پاکیزہ اور نورانی طریقوں کے مطابق گزارنا ہی انسان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اس تکلیف کے دوران اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ''دوجنم دومرن''۔ ''آدھی موت کا جشن''۔ ''زخم تب اور اب''۔ ''سنیاس''۔ ''اُٹھک بیٹھک'' اور ''مشکل سوال کا آسان جواب'' جیسی کہانیاں لکھوائیں۔

....

27 تا 29 جولائی 2022ء کو مجھے آن لائن سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کی سہ روزہ ورکشاپ میں شرکت کا موقع ملا۔ میرے کشمیر کے ایک دوست ڈاکٹر عرفان عالم (ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر) نے مجھے اس ورک شاپ میں مدعو کیا۔ موضوع تھا ''اردو میں سائنس فکشن''۔ میں نے صرف دودن میں اپنے ہی زخم کو موضوع بناتے ہوئے کہانی تیار کردی اور اُسے 28 جولائی کو آن لائن پڑھا۔

....

24، اگست 2022ء کو میرے عزیز دوست ڈاکٹر ذاکر ملک بھلیسی نے میری حیات، تعلیم وتربیت، ملازمت، ادبی خدمات اور انعامات واعزازات پر ایک دستاویزی ویڈیو (Docomentary) تیار کی جس میں ڈاکٹر ذاکر نے نہایت محنت اور خلوص کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے سوشل میڈیا کے ذریعے تمام دُنیا میں متعارف کرایا۔ جسے دیکھ کر میری اہلیہ، بچّے، خاندانی اور رشتہ داری کے علاوہ میرے حلقہ احباب نے بہت پسند کیا۔ یہ دستاویزی ویڈیو میرے دوست ڈاکٹر ذاکر ملک بھلیسی کی جانب سے نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے خاندان والوں کے لئے ایک گراں قدر تحفے سے کم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے اس مخلص دوست کو سدا خوش وخرم رکھے آمین!

....

3 ستمبر 2022ء کو مجھے میرے بہنوئی محترم پروفیسر محمد اسد اللہ وانی کا فون آیا کہ میرے اور اُن کے آبائی وطن علاقہ مرمت، ضلع ڈوڈہ کے گورنمنٹ ہائر اسکنڈری اسکول گوہا کے پرنسپل صاحب اور اسٹاف ممبران نے یوم اساتذہ کے موقع پر ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا ہے جس میں وہ علاقہ مرمت کے اُن سبکدوش ہوئے اساتذہ کی عزت افزائی کریں گے جنھوں نے تعلیمی اور ادبی اعتبار سے کافی خدمات انجام دی ہیں۔ اس میں ہم دونوں بھی شامل ہیں۔ میں مرمت جانے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا کیونکہ میری زخم خوردہ ٹانگ سے ابھی پٹی نہیں اُتری تھی۔ لیکن میرے بہنوئی کے اصرار پر میں نے مجبوراً ہامی بھر لی۔ میں نے اہلیہ سے مشورہ کیا وہ شش وپنج میں پڑ گئی۔ میرے ہم زلف تنویر سلاریہ کا بھی مجھے فون آیا کہ مجھے ہر حال میں آنا ہے۔ بہر حال میں اپنے بہنوئی کے ہمراہ مرمت جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ جموں سے گوہا (مرمت) تقریباً 200 کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ مجھے خود اپنی گاڑی اتنی دُوری پر لے جانی تھی۔ مجھے کسی حد تک ڈر وخوف سا بھی محسوس ہونے لگا لیکن اللہ تعالیٰ کی

ذات پر کامل بھروسہ تھا اس لئے میں نے پرواہ نہیں کی۔ میں اور میرے بہنوئی جناب پروفیسر محمد اسد اللہ وانی 4 ستمبر 2022ء کو جموں سے ساڑھے گیارہ بجے گوہا مرمت کے لئے روانہ ہوئے۔ میں نے بڑے اطمینان سے گاڑی چلائی۔ اُدھم پور، چھینی ناشری ٹنل سے ہوتے ہوئے بٹوت سے گزرنے کے بعد جب ہم بگّر پہنچے تو ہم نے وہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اُس کے بعد کوئی ساڑھے تین بجے کے قریب ہم کھلینی چچا غلام رسول صاحب کے گھر پہنچے۔ وہاں ظہر کی نماز پڑھی، نمکین چائے پی۔ چچا، چاچی سے ملاقات ہوئی، کوئی ایک گھنٹے کے بعد وہاں سے گوہا مرمت کے لئے روانہ ہوگئے۔ کلھوتہ، جمبل، بھرگراں اور سلہوتہ سے ہوتے ہوئے تقریباً ساڑھے چھ بجے ہم گوہا پہنچ گئے۔ میں رات کو اپنے ہم زلف تنویر سلاریہ کے گھر میں ٹھہرا، اُنھوں نے میری بڑی خاطر تواضع کی۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے۔ میرے بہنوئی اپنے بھانجوں کے گھر میں رہے۔ دوسرے دن یعنی 5 ستمبر 2022ء کو میں نے گوہا کی جامع مسجد میں نمازِ فجر ادا کی اور اُس کے بعد گوہا کی گلیوں اور مکانات کو دیکھنے کے لئے چہل قدمی کرتے ہوئے دُور تک نکل گیا۔ میری نظروں کے سامنے اونچے اونچے پکے مکانات تھے، وہ گلیاں، وہ چوبارے، وہ نقشہ جو میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ اب وہ سب یاد ماضی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ گوہا کے بہت سے میرے جانے پہچانے لوگ اب دُنیا میں نہیں ہیں۔ یادیں انسان کو رُلاتی ہیں، بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں اور اس سچائی کا احساس دلاتی ہیں کہ بہر حال ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم ہائر اسکنڈری اسکول میں پہنچ گئے، ہمارے ساتھ تحصیل مرمت کے تحصیلدار جناب ظہیر رعنا، چوکی آفیسر جناب سمندر خان، جناب صفدر خان، میرے ایک اور بہنوئی جناب نذیر احمد وانی تھے۔ جونہی ہم گورنمنٹ ہائر اسکنڈری اسکول گوہا کے احاطے میں پہنچے تو ہمارے استقبال کے لئے اساتذہ نے طلبہ

وطالبات کو کھڑا رکھوایا تھا۔ ہمارے لئے اُنھوں نے تالیاں بجانا شروع کیں۔ اسٹیج کو اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ ظہیر رعنا تحصیلدار صاحب نے اس پروگرام کی صدارت فرمائی۔ میں، میرے بہنوئی محمد اسداللہ وانی صاحب، گوہا کے چوکی آفیسر سمندر خان کے علاوہ گورنمنٹ ہائر اسکنڈری اسکول کے پرنسپل جناب گوپال داس اور میرے ہم ذلف تنویر سلاریہ بھی ایوان صدارت میں تشریف فرما تھے۔ میں نے اپنے استاد جناب ماسٹر بدھی سنگھ سے بھی ملاقات کی کہ جو مجھے سینٹرل اسکول بہوتہ میں پڑھایا کرتے تھے۔ اُن کے علاوہ ماسٹر دیارام کو دیکھا جو کسی زمانے میں مجھ سے ایک کلاس آگے گوہا ہائی اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ ماسٹر سنسار چند بھگت میرا دوست بھی مجھے ملا۔ پورے گیارہ بجے یوم اساتذہ کا پروگرام شروع کیا گیا۔ 'استاذ کا سماج اور درس وتدریس میں کیا مقام ومرتبہ ہے اس حوالے سے بچّوں اور بڑوں نے تقریریں کیں۔ تقریباً دو گھنٹے تک بچّوں نے رنگا رنگ پروگرام پیش کیے۔ اُس کے بعد مجھے یوم اساتذہ کے حوالے سے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا گیا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی مادرِ علمی سے جڑی کچھ یادوں کا تذکرہ کیا۔ اُس کے بعد استاد کا مقام ومرتبہ متعین کیا اور آخر پر طلبہ وطالبات کو کچھ اہم ومفید نصیحتیں کیں۔ میرے بعد محترم پروفیسر محمد اسداللہ وانی نے خطاب فرمایا اُن کے بعد ظہیر رعنا تحصیلدار صاحب نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اپنے صدارتی کلمات بیان فرمائے۔ آخر پر گورنمنٹ ہائر اسکنڈری اسکول کے پرنسپل جناب گوپال داس نے یوم اساتذہ کے پروگرام میں آئے ہوئے تمام مہمانان گرامی کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کے درمیان میں مجھے، میرے دو بہنوئی پروفیسر محمد اسداللہ وانی اور نذیر احمد وانی کے علاوہ کچھ اور بھی سبکدوش ہوئے اساتذہ کو عزت افزائی کے طور پر شال اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ سوشل میڈیا کے اس دور میں ہر آدمی کی حرکات وسکنات کو محفوظ کرنے اور رکھنے کے ذرائع موجود ہیں۔

کیمرہ مین اور دوسرے دوستوں نے جہاں اس پروگرام کو ویڈیوز میں قید کیا تو وہیں مجھ جیسے معمولی آدمی کی بھی ویڈیو بنائی گئی۔ تقریباً ڈھائی بجے کے آس پاس یوم اساتذہ کا یہ شاندار پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ میرے بچپن کے استاد ماسٹر بدھی سنگھ کے صاحبزادے ماسٹر پورن سنگھ نے اس پروگرام کی نظامت بڑے اچھے ڈھنگ سے انجام دی تھی۔ تین بجے ہم نے کھانا کھایا۔ میں نے سب سے رخصت لی اور تقریباً ساڑھے چار بجے میں اپنے بہنوئی نذیر احمد وانی کے ساتھ رات کے لئے گھڑ ہنگل چلا آیا۔ محترم پروفیسر محمد اسداللہ وانی اپنے بھانجوں کے پاس گوہاہی میں ٹھہرے۔ دوسرے دن میں تقریباً 9 بجے گھڑ ہنگل سے جموں کے لئے روانہ ہوا۔ بھرگرں میں میرے بہنوئی محمد اسداللہ وانی صاحب، میرے پہنچنے کے فوراً بعد پہنچ گئے۔ ہم پون گھنٹے میں کھلینی پہنچے۔ ہم نے میرے چچیرے بھائی محمد صدیق وانی کے گھر پر کھانا کھایا، نمازِ ظہر ادا کی اُس کے بعد جموں کی طرف روانہ ہوئے۔ چھ بجے کے قریب شام کو ہم جموں پہنچے۔ ہمارا یہ سفر ایک پرسکون سفر رہا جو یادگاری کہا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تندرستی کے ساتھ ہر نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین!

....

18، اکتوبر 2022ء کو جموں فردوس آباد سنجواں لین نمبر 3 ہاوس نمبر 7 یعنی میرے مکان کے سامنے میرے پڑوسی جناب شفیق چودھری صاحب (جو سابق وزیر خوراک جناب ذلفقار احمد چودھری کے بڑے بھائی ہیں) کے بیٹے احتزاز کی شادی میں مجھے اپنی اہلیہ اور بچّوں کے ساتھ جموں سے راجوری جانے کا موقع ملا۔ جموں سے ہم کوئی 11 بجے راجوری کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ جانی پور، اکھنور، ٹانڈا، چوکی چورا، کالی دھار سے ہوتے ہوئے ہم بھاملا پہنچ گئے تھے۔ بھاملا میں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ اُس کے بعد لمبیڑی میں ہم نے نمازِ ظہر پڑھی تھی۔ تقریباً پانچ بجے شام کو ہم

راجوری جناب فاروق مضطر صاحب کے گھر پہنچ گئے تھے۔ وہاں فاروق مضطر صاحب اور اُن کے اہلِ خانہ کے ساتھ ملاقات نصیب ہوئی تھی۔ اُن کا حُسن سلوک اور شائستگی دیکھ کر میں میری اہلیہ اور بچّے بہت متاثر ہوئے۔ فاروق مضطر صاحب کے گھر پر عصر اور نمازِ مغرب پڑھنے اور چائے پینے کے بعد ہم رات کو اُن کے بی ایڈ کالج ٹھنڈی کسّی چلے گئے تھے، وہاں سے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے کے بعد ست پیلس جواہر نگر (راجوری) چلے گئے جہاں جناب شفیق چودھری کے بیٹے کی شادی کی دعوتِ ولیمہ رکھی گئی تھی۔ چھوٹے بڑے تقریباً ہر حیثیت کے لوگ وہاں موجود تھے۔ کھانے پینے کا بہت اعلیٰ انتظام رکھا گیا تھا۔ وقار خان کی آواز میں گیت اور غزلیں سُننے کا موقع ملا تھا۔ دعوت ولیمہ میں شرکت کے بعد ہم واپس ٹھنڈی کسّی چلے گئے تھے جہاں ہم رات کو بڑے آرام سے ٹھہرے تھے۔ دُوسرے دن یعنی 19، اکتوبر 2022ء کو ہم شاہدرہ شریف دیکھنے چلے گئے تھے۔ میرے بیٹے رضا الرحمٰن کو گاڑی چلاتے ہوئے کافی کوفت ہوئی تھی کیونکہ راجوری سے تھانہ منڈی تک کہیں کہیں سڑک کی خستہ حالت نے اُسے مایوس کیا تھا۔ تھانہ منڈی میں میرے مخلص دوست اور شاعر جناب خورشید احمد بسمل کے ساتھ میں نے اپنی اہلیہ اور بچّوں کی ملاقات کرائی تھی۔ اُن کے اسکول میں جانے کا موقع ملا تھا۔ اُنھوں نے مجھے اور میری اہلیہ کی آمد پر خوشی کے طور پر ایک گلدستہ پیش کیا تھا۔ اُن کے ساتھ ملاقات کے بعد ہم شاہدرہ شریف چلے گئے تھے۔ وہاں سے جموں کی طرف روانہ ہوئے تھے کہ اچانک میری اہلیہ نے یہ مشورہ دیا کہ ہم اپنے پڑوسی جناب خالق ڈی ایس پی صاحب کے گھر جائیں گے جو بنیادی طور پر راجوری اور تھانہ منڈی کے درمیان سیم سمت نام کی جگہ پر رہتے ہیں لیکن کم وبیش بیس سال سے اب جموں فردوس آباد میں ہمارے پڑوسی ہیں۔ ہم تقریباً چار بجے خالق صاحب کے گھر پہنچے، وہاں پہنچ کر دل خوش ہوا۔ خالق صاحب کی اہلیہ جن کو

میں اپنی بہن کی طرح سمجھتا ہوں ۔انھوں نے ہماری آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ ہم نے نماز ظہر وہیں پڑھی۔ اُس کے بعد چائے پی۔ اُن کا تعمیر شدہ مکان دیکھا بہت اچھا لگا۔ سیم سمت علاقہ بہت زیادہ خوب صورت ہے۔ ہم وہاں سے تقریباً پانچ بجے کے قریب جموں کے لئے چل پڑے۔ رات کا کھانا ہم نے بھاملا میں کھایا۔ کوئی ساڑھے دس بجے رات کو ہم جموں اپنے گھر فردوس آباد پہنچے۔ یہ سفر بھی میری یادوں کا حصہ بن گیا ہے۔

....

31، اکتوبر 2022ء کو میرے ہمدم دیرینہ اور جموں و کشمیر اردو فورم کے صدر جناب محمد امین بنجارا نے اپنے گھر (جوگی گیٹ، جموں) پر بلایا۔ میں تقریباً دن کے گیارہ بجے اپنی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اُن کے گھر پر پہنچا۔ بنجارا صاحب کے ساتھ میرا ادبی رشتہ اُس وقت سے قائم ہے جب میں جموں یونیورسٹی کے شعبہء اردو میں ایم اے کر رہا تھا یعنی 88-1987ء کے آس پاس میں نے اُنھیں دیکھا تھا اور اُن کی ادبی صلاحیتوں سے واقف ہونے لگا تھا۔ وہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد جیسے ممتاز شاعر و ادیب کے پاس اکثر آتے، اُن کے علمی و ادبی سرمائے سے فیضیاب ہوتے۔ یہی وجہ رہی کہ بعد میں اُنھوں نے پروفیسر موصوف کی کئی غیر مطبوعہ چیزوں کو کتابی صورت میں شائع کروایا۔ میں کئی ادبی سیمیناروں اور مشاعروں میں پہاڑوں سے اُترا کر جموں جیسے بڑے شہر میں آکر جناب محمد امین بنجارا کے ساتھ اُن ادبی پروگراموں میں شرکت کرتا تھا جو اُس زمانے میں بڑے نظم وضبط کے ساتھ منعقد ہوا کرتے تھے۔ ہاں تو میں بنجارا صاحب کے گھر پہنچنے کے بعد اُن کے اُس کمرے میں چلا گیا جہاں وہ اِن دنوں اپنے یُوٹیوب چینل ''بنجارا بستی'' کے لئے مختلف علمی وادبی شخصیات کے ادبی کارناموں کو سوشل میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ تقریباً سات

سال کے بعد میری بنجارا صاحب سے ملاقات ہو رہی تھی۔ اُنھوں نے بڑے پیار سے مجھے گلے لگایا۔ چائے پلائی۔ اُس کے بعد اُنھوں نے مجھے اپنے چینل پر لائیو آنے کو کہا۔ میں نے ''غشی''۔ ''آخری نیکی''۔ ''مشکل سوال کا آسان جواب''۔ ''اُٹھک بیٹھک''۔ بند آنکھوں کی عظمت'' اور چھ افسانچے پڑھے جنھیں اُنھوں نے اپنے چینل کے لئے محفوظ کیا۔ بنجارا صاحب نے میری افسانوی کلیات جو ڈاکٹر ظفر اقبال نحوی نے ''مشتاق احمد وانی کی افسانوی کلیات'' کے نام سے مرتب کی ہے اُس کے بارے میں بھی مجھ سے تعارفی کلمات کہلوائے اور باضابطہ اُس کی بھی ایک فلم تیار کی۔ بنجارا صاحب ایک باغیرت، خوددار اور زندہ ضمیر شخص ہیں جنھوں نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا ہے۔ میرا اُنھوں نے کئی معاملات میں ساتھ دیا ہے۔ اللہ کرے ہمارا یہ دوستانہ ہمیشہ قائم ودائم رہے!

....

10، نومبر 2022ء کو میرے ایک دوست جناب پروفیسر ارتضٰی کریم دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز جموں آئے۔ اُنھیں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری نے بطور اکیڈمک کونسل ممبر مدعو کیا تھا۔ میں اور میرا بیٹا رضاالرحمٰن اُنھیں جموں ائرپورٹ لینے گئے۔ وہ تقریباً گیارہ بجے دن کو جموں پہنچے۔ میں نے اُنھیں بس اسٹینڈ کے نزدیک لارڈان (Lord in Hotel) ہوٹل میں ٹھہرایا۔ دوسرے دن 11 نومبر 2022ء کو میں نے اُنھیں اپنی گاڑی میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری پہنچایا۔ شعبہ اردو میں اُن کا مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک لیکچر رکھا گیا تھا۔ اُنھوں نے یوم اردو کے حوالے سے اس بات پر زور دیا کہ یوم اردو علامہ اقبالؔ کے بجائے امیر خسروؔ سے منسوب کیا جانا چاہیے۔ لیکچر کے بعد نماز جمعہ ادا کی۔ شعبہ اردو کے اساتذہ سے ملے اُنھیں کچھ مفید مشورے دیے۔ اُس کے بعد وہ یونیورسٹی کے گوجری، پہاڑی اور کشمیری

ریسرچ سینٹر دیکھنے گئے ۔رات کو میں اور پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب یونیورسٹی کے گیسٹ ہاوس میں ٹھہرے ۔دوسرے دن یعنی 12 نومبر 2022ء کو اُنھوں نے اکیڈمک کونسل میں شرکت کی ۔اُسی روز ہم فاروق مضطرؔ صاحب کی دعوت پر اُن کے گھر راجوری شہر میں چلے آئے ۔رات کو اُن کے گھر میں کھانا کھانے کے بعد ہم اُن کے کالج ٹھنڈی کسّی سونے کے لیے چلے گئے ۔تیسرے دن یعنی 13 نومبر 2022 کو ہم دونوں فاروق مضطرؔ صاحب کے ساتھ اُن کے ہائر اسکینڈری اسکول ڈانگری کو دیکھنے چلے آئے ۔وہاں کا ماحول ومنظر دلکش معلوم ہوا۔دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں اور پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب جموں کے لئے روانہ ہوئے ۔رات کو تقریباً 9 بجے اُن کی ٹرین دہلی کے لئے روانہ ہونی تھی ۔ہم جموں پہنچنے کے بعد پروفیسر قدوس جاوید صاحب کے گھر چلے گئے ۔وہاں چائے پینے اور عشا نماز پڑھنے کے بعد میں نے پروفیسر ارتضی کریم صاحب کو ریلوے اسٹیشن پہنچایا۔وہ دہلی کے لئے روانہ ہوئے اور میں اپنے گھر سنجواں چلا آیا۔ جناب پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ساتھ میرا یہ سفر بہت اچھا گزرا۔یادیں اور نیک دُعائیں انسان کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔

....

19 ،دسمبر تا 23 دسمبر 2022ء کو جموں وکشمیر اسٹیٹ کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (JKSCERT) نے پانچ دن کی ورک شاپ میں مجھے بطور متعلقہ شخص (Resourse Person) مدعو کیا ،جس میں ،میں نے اردو زبان کے آغاز وارتقاء،اردو نظم کی تدریس کے اُصول ،اردو نثر اور شاعری کی تدریس کے علاوہ واحد سے جمع بنانے کے قواعد کے بارے میں لیکچر دیے ۔میرے ان تمام لیکچرس کو ہائی اسکولوں سے آئے ہوئے اردو کے اساتذہ اور جے کے ایس سی ای آرٹی کے اسٹاف نے بہت پسند کیا تھا ۔میرے علاوہ میرا ایک دوست ہارون راٹھور نے بھی مختلف

موضوعات پر لیکچرس دیے تھے۔اُس کی واقفیت، انداز تدریس اور مزاحیہ طبعیت سے
میں بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔میرا ایک اور دوست ڈاکٹر لیش پال شرما نے بھی ایک لیکچر
دیا تھا۔ JKSCERT کے جوائنٹ ڈائریکٹر جناب ایچ آر پکھرو ،شعبہ تعلیم
ولسانیات کے صدر جناب کشور کمار ،کوآرڈی نیٹر مونیکا شرما،اسسٹنٹ کوآرڈی نیٹر
شمیمہ نازکی اور ناہیدہ میڈم کے علاوہ دیگر اسٹاف ممبران نے اس ورک شاپ کو
کامیاب بنانے میں دیانتداری سے کام کیا تھا۔اس پانچ روزہ ورک شاپ کے
اختتامی دن پر مجھے جوائنٹ ڈائریکٹر ایچ آر پکھرا اور دیگر اسٹاف ممبران کی موجودگی میں
ایک مومنٹو اور ایک سرٹیفکیٹ دیا گیا تھا۔

....

اللہ تعالیٰ کے مجھ پر بے شمار احسانات ہیں۔12 جنوری 2023ء کو میں نے
اپنے افسانوں کا ساتواں مجموعہ''دوجنم دو مرن''تیار کردیا ۔اس میں میرے
12 افسانے شامل ہیں جو میں نے 2022ء کے دوران وقتاً فوقتاً لکھے۔اللہ نے چاہا تو
یہ مجموعہ بہت جلد پریس میں جائے گا۔اس مجموعے میں ''احساس کے خوفناک
سائے''۔''مشکل سوال کا آسان جواب''۔''اُٹھک بیٹھک''۔''سنیاس''۔''بوڑھا
خادم''۔'' آدھی موت کا جشن''۔''زخم تب اوراب''۔'' آؤاب نکاح کریں''۔''سماج
سُدھارکی''۔''نیا رواج''۔''آن لائن جنازہ''اور''دوجنم دو مرن''افسانے شامل
ہیں۔یوں تو میرے یہ تمام افسانے اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہیں لیکن میرا
اس بات پہ دعوا ہے کہ افسانہ''دوجنم دومرن''اپنے موضوع اور اُسلوب کے اعتبار سے
دُنیائے ادب میں پہلا منفرد افسانہ ہے۔میری معلومات کے مطابق ابھی تک اس
موضوع اور اُسلوب میں کوئی بھی افسانہ نہیں لکھا گیا ہے۔مجھے اس بات کی بھی خوشی
ہے کہ ان افسانوں میں جب''بوڑھا خادم''افسانہ یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل
ماہنامہ''پیش رفت''(دہلی) کے جنوری 2023ء کے شمارے میں شائع ہوا تو مجھے

سنجیدہ قارئین کے بہت سے فون آئے جنھوں نے اس افسانے کی بہت تعریف کی۔ مجھے مبارک باد دی۔اسی طرح جب راولپنڈی (پاکستان) سے شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ ''چہارسو'' کے شمارہ جنوری 2023ء میں میرا افسانہ ''احساس کے خوفناک سائے'' شائع ہوا تو مجھے بہت مسرت ہوئی۔گلزار جاوید صاحب اس رسالے کو بہت زیادہ معیاری بنائے ہوئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم اللہ تعالیٰ مجھ سے ابھی مزید کتنا ادبی کام کروانا چاہتے ہیں لیکن میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ مجھے اُس نے لکھنے پڑھنے کی توفیق دی ہے تاکہ اپنے مشاہدات اور تجربات زندگی سے قارئین کو روشناس کرواسکوں۔ میرا کوئی کمال نہیں ہے۔بس میرا اس بات پر کامل یقین ہے کہ آدمی کو ہر وقت اور ہر کام کرنے سے پہلے اپنی نیت کو درست رکھنا چاہیے کیونکہ بُری نیت بُرے اعمال کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

....

اللہ تعالیٰ نے مجھے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔اگر میں شکرانے کے طور پر زمین کے چپے چپے پر سجدہ کروں تب بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا حق ادا نہیں کر پاؤں گا۔قناعت اور کفایت شعاری کا سبق میں نے بہت چھوٹی عمر میں پڑھا ہے۔انسان کی حرص وہوس کا پیٹ قبر کی مٹّی ہی بھر سکتی ہے۔ مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ ہم سے پہلے اس دُنیا میں بڑے بڑے مال ودولت، جاہ وجلال والے، اونچے عہدوں پر کام کرنے والے، کیسے کیسے حیرت انگیز کارنامے انجام دینے والے اور حسین وجمیل قسم کے لوگ مٹّی ہو گئے ہیں۔ میں نے خود بہت سے گلاب چہرے مٹّی ہوتے دیکھے ہیں۔لہٰذا عقل مند وہی ہے جو مرنے سے پہلے مرنے کی تیاری میں لگ جائے۔اس میں کیا شک ہے کہ اے دُنیا کے مسافر! منزل تیری قبر ہے۔میری یہ تمنا ہے کہ بحکم خدا جب میرا دُنیا سے رخصت ہونے کا وقت آئے تو ملک الموت اُس وقت میری روح قبض کرے کہ جب میں سجدے کی حالت میں ہوں یا اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کی

تلاوت کرر رہا ہوں !۔ میں یہاں اصغؔر ویلوری کی چند رباعیات درج کرنا لازمی سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ ان رباعیات میں انسان کے لئے عبرت و بصیرت افروز پیغام موجود ہے۔

مجھ کو نہ کوئی مال نہ زر دے مولا
رحمت سے تُو جھولی مری بھر دے مولا
لکھوں تیری تا عمر یوں ہی حمد و ثنا
تُو میرے قلم میں وہ اثر دے مولا

....

بیٹھنا ہے تو گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھو
یہ تو دیوار کا سایہ ہے چلا جائے گا
سوچ کے آیا تھا دُنیا میں سب اپنے ہونگے
اپنا سایا بھی پرایا ہے چلا جائے گا

....

سب کے لئے ایک سا ہے منشا میرا
بدلا نہ کبھی پیار کا لہجہ میرا
ہر ایک کو میں بانٹتا پھرتا ہوں خلوص
میں نے کبھی دیکھا نہیں تیر ا میرا

....

بستر ترا مٹی تو ترا گھر مٹی
ڈالیں گے ترے دوست ہی تجھ پر مٹی
دُنیا میں کسی کا نہیں ہوتا کوئی
مٹی ہی سے مل جاتی ہے جا کر مٹی

....

معزز قارئین و سامعین حضرات اور ادب نواز و ادب شناس دوستو اور ساتھیو!

میں نے اپنی 63 سالہ زندگی کے حالات وواقعات، تجربات ومشاہدات، افکارونظریات، احساسات ومحسوسات کو"خارستان کا مسافر" (خود نوشت سوانح حیات) کے نام سے آپ کے سامنے پیش کردیا ہے۔ مجھے امید ہے میری یہ خودنوشت سوانح حیات جوکوئی بھی پڑھے گا اُسے ضرور کچھ نہ کچھ سبق حاصل ہوگا۔ انسان کا سب سے بڑاالمیہ یہ ہے کہ یہ بڑے خوب صورت ارمان اپنے دل ودماغ میں پالتا ہے۔ دُنیا کے تمام عیش وآرام، عظمتیں اورشہرتیں حاصل کرنے کے لئے یہ کیا کچھ نہیں کرتا ہے۔ یہ ہزاروں برس جینا چاہتا ہے۔ سدا بہار رہنا چاہتا ہے لیکن موت خاموشی سے اِس کا پیچھا کرتی ہے اور پھر آخر کار یہ نہ چاہتے ہوئے بھی موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص موت کو یاد رکھے اور خدائی ضابطوں کے مطابق زندگی گزارے۔ ہم اگر کسی کو سُکھ نہیں پہنچا سکتے ہیں تو دُکھ بھی نہیں پہنچانا چاہیے۔ بھگت کبیؔر کے اس دوہے میں بہت بڑی صداقت چھُپی ہوئی ہے کہ ؎

کبیؔرا جب پیدا ہوئے جگ ہنسا ہم روئے
ایسی کرنی کر چلو ہم ہنسیں جگ روئے

میں اپنی اس خودنوشت سوانح حیات کا اختتام ایک حدیث پر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "اے اللہ کے پیغمبرؐ! بتلائیے کہ آدمیوں میں کون زیادہ ہوشیاراور دُوراندیش ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: وہ جوموت کو زیادہ یاد کرتا ہے، اور موت کے لئے زیادہ سے زیادہ تیاری کرتا ہے جولوگ ایسے ہیں وہی دانشمند اور ہوشیار ہیں، اُنہوں نے دُنیا کی عزت بھی حاصل کی، اور آخرت کا اعزاز واکرام بھی"

(معجم صغیرالطبرانی)

............ختم شُد............